غازی
عبدالرّحمٰن
شہید
پشاوری

غازی عبدالرحمٰن شہیدؒ پشاوری

مُصَنِّفہٗ

پروفیسر ابو سلمان شاہجہانپوری

مرتّبہ

محمدؐ یوسف برادرِ خورد عبدالرحمٰن شہیدؒ

غازی عبدالرحمٰن شہید پشاوری

مُصنّفہ

پروفیسر ابو سلمان شاہجہانپوری

مرتّبہ

محمد یوسف برادرِ خورد عبدالرحمٰن شہیدؒ

مالک نارتھ ویسٹرن ہوٹل، کراچی

مطبع . . . . ایجوکیشنل پریس کراچی، ۱۹۷۹ء

کتابت . . . . خالد محمود صدیقی

ناشر . . . محمد یوسف، نارتھ ویسٹرن ہوٹل - کراچی

قیمت: ۳۵ روپے

فہرست مضامین

انتساب

میں اپنی یہ ناچیز کوشش اپنے والد بزرگوار

حاجی غلام صمدانی مرحوم رئیس التجار پشاور

اور

غازی رؤف پاشا، سابق وزیر اعظم ترکیہ

اور

مولانا محمد علی جوہر بانی طبی وفد بلقان

کے اسمائے گرامی سے منسوب کرتا ہوں۔

جنھوں نے اپنے اپنے حسب مقدور اسلام

کی خدمت کی۔

محمد یوسف

مرتب



کرنل غازی عبدالرحمٰن پشاوری سینہ پہ ترکی کی جنگ آزادی کا تمغہ آویزاں ہے۔

تعارُف

از: محمد یوسف برادر خورد عبدالرحمٰن شہید پشاوری

اٹھارھویں صدی کا آخری دور ہے۔ ٹیپو سلطان کی شمشیر آب دار ایسٹ انڈیا کمپنی سے جنگ کے دوران ٹوٹ گئی اور دکن کا سارا نقشہ الٹ پلٹ ہو گیا۔ پھر ادھر پر انگریزوں نے زبردستی قبضہ کر لیا اور آخر کار ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں مغلیہ سلطنت کا ٹمٹماتا چراغ بھی گل ہو گیا۔

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

۱۸۵۷ء کا خونیں ہنگامہ مسلمانوں کے لئے نہایت روح فرسا ثابت ہوا اور اس سے نہایت دور رس نتائج پیدا ہوتے۔ اس ہنگامے کے بعد انگریزوں کی گرفت اتنی مضبوط اور منظم ہو گئی کہ اس وقت اُس کو ماننے کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔ اُس وقت مسلمان چکی کے دو پاٹ کے درمیان پس رہے تھے۔ ایک طرف تو ہندو تھے جو اپنی محکومی کا ہزار سالہ بدلہ لینے کے لئے تیار ہو رہے تھے اور دوسری طرف انگریز کی نئی حکومت اپنا تسلط مستحکم کرنا چاہتی تھی۔ یہاں یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ ہندو کی نشاۃ ثانیہ انگریز کی زیر بار احسان ہے اس میں شیواجی کی مفروضہ ہندو پرستی کو کوئی دخل نہیں ہے۔ غرض چکی کے یہ دو پاٹ مسلمانوں

کے لئے نہایت صبر آزما اور ہمت شکن تھے۔ سید احمد خان نے چکی کے اس پاٹ سے بچنے کا یہ راستہ نکالا کہ انگریزوں کی حکومت تسلیم کر لینا چاہیئے اور مغربی تعلیم حاصل کر کے آگے بڑھنا چاہیئے۔ اور پھر نیچیہ قدرت اور تاریخ پر چھوڑ دینا چاہیئے۔ اس سے اتنا ہوا کہ مسلمانوں کو تھوڑا بہت سر اٹھانے کا موقع مل گیا۔

میرے والد حاجی غلام صمدانی مرحوم انگریز کو اچھا نہیں سمجھتے تھے مگر حالات سے مجبور تھے۔ وہ یہ بخوبی سمجھ گئے تھے کہ انگریز سے گلو خلاصی حاصل کرنے کے لیئے تعلیم جدید کا ہتھیار ضروری ہے اور اسی غرض سے انھوں نے بھائی عبدالرحمٰن مرحوم کو علی گڈھ بھیجا۔ علی گڈھ میں انھوں نے کیا کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ وہ آپ اس کتاب میں پڑھیں گے۔

اس کتاب کا پہلا مسودہ جناب حفیظ ہوشیارپوری مرحوم نے تیار کیا تھا اور مجھے بالکل اس کا علم نہیں تھا۔ ہوا یوں کہ میرے بڑے بھائی حاجی محمد امین صاحب مرحوم نے لاہور میں جسٹس شیخ عبدالقادر سے بھائی عبدالرحمٰن مرحوم کی سوانح عمری شایع کرنے کا خیال ظاہر کیا اور ان سے کسی ایسے شخص کی مدد مانگی جو اس کام کو بخوبی انجام دے سکتا ہو۔ شیخ صاحب نے حفیظ ہوشیارپوری کا نام لیا۔ حفیظ صاحب اس وقت گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم۔ اے کے طالب علم تھے مگر شیخ صاحب ان کی اعلیٰ صلاحیت سے واقف تھے۔ بھائی حاجی امین نے بھائی عبدالرحمٰن کی بابت بہت کچھ باتیں حفیظ صاحب کو بتائیں۔ ان معلومات کی بنا پر حفیظ صاحب نے کوئی پچاس صفحوں کا ایک خاکہ تیار کیا مگر اس اثنا میں بھائی امین کا انتقال ہو گیا اور وہ خاکہ یونہی حفیظ صاحب کے پاس پڑا رہا۔

کئی سال کا ذکر ہے کہ حفیظ صاحب مرحوم اور دوسرے دوستوں کو میں نے اپنے نارتھ ویسٹرن ہوٹل میں کھانے کی دعوت دی۔ بعد طعام حفیظ مرحوم میرے کمرے میں طاق

پر رکھی ہوئی تصویریں دیکھنے لگے ۔ ایک تصویر کے گروپ میں مصطفےٰ کمال پاشا کی تصویر دیکھ کر پوچھنے لگے کہ اس تصویر میں کون کون لوگ ہیں ۔ یہ وہی تصویر ہے جو اس کتاب میں شائع کی جارہی ہے ۔ جب میں نے بتایا کہ اس میں میرے بڑے بھائی عبدالرحمٰن مرحوم بھی کھڑے ہیں تو ان کو سخت تعجب ہوا ۔ اور کہنے لگے کہ میں نے تو ان کی سوانحعمری کا ایک خاکہ حاجی محمد امین کی ایما پر تیار کیا ہے ۔ لیکن اب اس کا کوئی مصرف نہیں معلوم ہوتا ۔ یہ بتا کر انھوں نے کہا کہ چونکہ آپ ان کے چھوٹے بھائی ہیں یہ خاکہ آپ لے لیجئے ۔ اس کے کئی دن بعد وہ خاکہ مجھے دے گئے ۔

یہ خاکہ میرے پاس کئی سال پڑا رہا ۔ خوش قسمتی سے جناب ابوسلمان صاحب شاہجہانپوری لیکچرار گورنمنٹ نیشنل کالج کراچی سے ملاقات ہوئی اور جب میں نے ان سے بھائی عبدالرحمٰن مرحوم کی سوانح عمری شائع کرنے کا خیال ظاہر کیا تو وہ ہر قلمی امداد کے لیے تیار ہو گئے ۔ انہوں نے حفیظ ہوشیارپوری مرحوم کے خاکے کو نظر میں رکھ کر بڑی محنت اور کاوش سے بھائی مرحوم کی سوانح عمری مرتب کر ڈالی ہیں ان کی سعی اور کاوش کا سپاس گزار ہوں ۔

اس کے علاوہ میں خواجہ عبدالوحید صاحب سابق سیکرٹری ادارہ معارف اسلامیہ لاہور (حال وارد کراچی) کا بھی ممنون ہوں کہ انھوں نے باوجود اپنی ناسازی طبیعت کے پیش لفظ لکھنا منظور کیا ۔ خواجہ صاحب رؤف بے سے لاہور میں مل چکے ہیں اور اس کا حال آپ انھیں کے قلم سے پڑھیں گے ۔ خواجہ صاحب نے بعض تصویریں بھی عنایت کیں اور اس کتاب کی بابت چند قابلِ قدر مشورے بھی دیئے ۔

ان کے علاوہ میں اپنی ہمشیرہ محترمہ شیریں تاج کا بھی ممنون ہوں جو اس سے قبل بھائی

عبدالرحمٰن کے حالات اور ان کے بمبئی اور استنبول سے بھیجے ہوئے خطوط ایک رسالہ کی شکل میں شائع کر چکی ہیں۔ اس رسالے سے جنگِ بلقان کے بہت کچھ حالات معلوم ہوتے۔

آخر میں اپنے عزیز دوست ڈاکٹر ریاض الحسن کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ جنہوں نے نہ صرف ایک دیباچہ لکھا بلکہ اپنی معلومات سے کتاب کی قدر وقیمت میں اضافہ کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ انہی کی راہنمائی اور دستگیری سے میں اس مقام پر پہنچ سکا ہوں۔ جو ہمیشہ مشفقانہ انداز میں میری راہبری فرماتے رہے۔

مرتب
محمد یوسف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

تحریر : خواجہ عبدالوحید سابق سیکرٹری معارف اسلامیہ لاہور

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت ست بر جریدۂ عالم دوام ما

"اور ان مومنوں کے متعلق جو راہِ حق میں دادِ شجاعت دیتے ہوئے اپنی جانیں جانِ آفریں کے سپرد کر گئے، انہیں مردہ خیال نہ کرو۔ وہ زندہ ہیں، اگرچہ تم ان کی زندگی کی حقیقتوں کو سمجھ نہیں سکتے۔" (البقرہ ۲ : ۱۰۴)

انیسویں صدی کے دوران ہندوستان میں بعض تحریکیں ایسی تھیں جن کا مقصد اس برِعظیم میں انگریزوں کا تسلط ہمیشہ کے لئے قائم کرنا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس ملک کے مسلمانوں کو یہ باور کرانا تھا کہ اب انگریز اس ملک کو چھوڑنے والے نہیں ہیں۔ اس لئے انہیں اپنے آپ کو غلامی پر راضی کر لینا چاہیے۔ ان تحریکوں کے قائدین کا ایمان تھا کہ انگریز اب ابدالآباد تک اولوالامر بنا رہے گا اور اس خیال کی تائید میں سیاسی خیال آرائی اور وحی والہام کی تائید مہیا کی گئی۔ لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ انگریز جس کی ابدی غلامی مسلمانانِ ہند کی بہتری کے لئے ضروری قرار دی گئی تھی ایک صدی پوری نہ گذری

کہ وہ خود ہی ہندوستان چھوڑ کر چلا گیا اور اس کی وفاداری کا دم بھرنے والے بزرگوں کی سیاسی بصیرت کا بھرم کھل گیا۔

اب تاریخ کی یہ بوالعجبی بھی غور طلب ہے کہ جس قدر جدوجہد اس غرض سے کی گئی کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو انگریزوں کی غلامی پر راضی کیا جائے اسی قدر مسلمانوں میں انگریزوں کی غلامی سے نکلنے کا جذبہ فروغ پاتا گیا اور جس قدر کوشش مسلمانانِ ہند کو عربوں اور ترکوں سے متنفر کرنے کی ہوئی اسی قدر جذبہ عربوں اور ترکوں سے ہمدردی کا بڑھتا چلا گیا۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے انگریزوں کے جبر و استبداد کے باوجود جدوجہد آزادی میں بھی اپنی بساط سے بڑھ کر حصّہ لیا اور عربوں اور ترکوں سے محبت اور ہمدردی کا مظاہرہ بھی کیا۔

بیسویں صدی کے عشرۂ اول ہی سے الہلال، کامریڈ اور زمیندار کے ولولہ انگیز اداریوں نے دعوتِ جہاد کا غلغلہ بلند کیا اور مسلمانانِ برِعظیم نے اس دعوت پر لبیک کہنا شروع کیا۔ کچھ نوجوان ملک کے اندر انگریزی جبر و استبداد کے خلاف آواز اٹھانے میں منہمک ہو گئے اور کئی ایک جماعتیں بنا کر ملک سے باہر چھپتے چھپاتے نکل گئے تاکہ ترکوں اور عربوں کے ساتھ مل کر ان مغربی طاقتوں کے خلاف نبرد آزما ہوں جو عرب اور ترک حکومتوں کے خلاف جارحانہ جنگ و جدل کا میدان گرم کر رہی تھیں۔ وہ نوجوان جو اس زمانے میں اس برِعظم سے جہاد و قتال فی سبیل اللہ کے لئے اپنے گھر بار چھوڑ گئے تھے، ان میں سے بہت کم تھے جو زندہ سلامت واپس آسکے۔ بہت سے اسی زمانے میں مقامِ شہادت پا کر ہمیشہ کے لئے وہیں کی خاک میں مل گئے۔ ان خوش قسمت نوجوان مجاہدین میں ایک عبدالرحمٰن پشاوری بھی تھے۔ جن کا تذکرہ اس کتاب میں نذرِ ناظرین



بائیں سے دائیں۔ ڈاکٹر عبد القوی نعمان، رؤف پاشا، خواجہ عبد الوحید سیکریٹری معارف
اسلامیہ لاہور، عبد الماجد (یہ تصویر لاہور میں ۱۹۳۳ء میں لی گئی)۔

کیا جا رہا ہے۔

مجھے اسلام کے اس عظیم فرزند کو دیکھنے کا شرف حاصل نہیں ہوا۔ البتہ ان کا ذکر پہلی مرتبہ کسی قدر تفصیل کے ساتھ سننے کا موقع اس وقت ملا جب ۱۹۳۳ء میں جدید ترکیہ کے مجاہدِ کبیر غازی حسین رؤف بے، اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، لاہور کی دعوت پر دہلی سے لاہور تشریف لائے اور اس انسٹی ٹیوٹ کے زیرِ اہتمام منعقد ہونے والے پبلک جلسہ میں علامہ سر محمد اقبال مرحوم و مغفور کی صدارت میں انہوں نے ایک نہایت ہی ولولہ انگیز تقریر فرمائی۔ غازی موصوف جب لاہور سے پشاور تشریف لے گئے تاکہ مرحوم عبدالرحمٰن پشاوری کے گھر اور گھر والوں کو دیکھیں تو اس موقع پر مجھے پہلی مرتبہ عبدالرحمٰن اور رؤف بے کے برادرانہ تعلقات کا علم ہوا اور اسی وقت یہ اندازہ بھی ہوا کہ ترک مجاہدین اور ان کے اعزہ و اقربا کے دلوں میں عبدالرحمٰن کے لئے کتنی محبت اور عزت تھی اور اس شہیدِ ملت نے اپنے وطن کا نام دنیا میں کتنا اونچا کر دیا تھا۔ غازی حسین رؤف بے نے مجھے بتایا کہ عبدالرحمٰن شہید کو ان کی والدہ محترمہ نے بیٹا بنا لیا تھا۔ اور اس لئے وہ ایک طویل مدت تک ان کے گھر میں گھر کے ایک فرد کی حیثیت سے قیام پذیر رہے۔

عبدالرحمٰن پشاوری شہید کی پوری زندگی طاغوتی طاقتوں کے خلاف مسلسل جہاد تھی۔ وہ طالب علمی کے زمانے ہی سے اسلام اور مسلمانانِ عالم کا درد اپنے دل میں پالتے رہے اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کے لئے اپنے آپ کو مسلسل تیار کرنے میں منہمک رہے اور جونہی ان کو موقع ملا وہ میدانِ جہاد میں کود پڑے اور جس طرح بھی بن پڑا وہ اپنے گھر بار کو خیرباد کہہ کر ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم کے طبی وفد میں شامل ہو کر اپنے ترک بھائیوں کی مدد

اور خدمت کے لئے ہندوستان سے باہر چلے گئے۔ انہوں نے اسلام کا پرچم بلند کرنے کے لئے ہر قسم کی قربانی پر ہمیشہ خندہ پیشانی سے آمادگی کا اظہار کیا اور اس راہ میں جس قدر بھی مشکلات و مصائب پیش آئے انہیں پورے صبر و تحمل کے ساتھ برداشت کیا۔ وہ ایک نڈر مجاہد اور بہادر سپاہی تھے اور دنیا کے بڑے سے بڑے مصائب بھی ان کو اپنی راہ سے منحرف نہ کر سکے۔ اور وہ مسلسل اپنے ترک بھائیوں کے شانہ بشانہ جدوجہد حیات میں شریک رہے۔ اور ترک قوم کے چھوٹے بڑے سبھی لوگوں سے خراج تحسین حاصل کرتے رہے۔

جب ڈاکٹر انصاری مرحوم کا طبی وفد ہندوستان واپس آگیا تو اس وقت بھی عبدالرحمٰن شہید نے ترک بھائیوں کا ساتھ نہ چھوڑا اور انہوں نے مستقل طور پر جدید ترکیہ میں سکونت اختیار کر لی۔ اور مختلف حیثیتوں سے وہاں کی خدمت میں منہمک رہے۔ انہوں نے اپنے خلوص اور قربانیوں سے اپنے ترک بھائیوں میں بے نظیر اعتماد حاصل کر لیا۔ اس حد تک کہ ترکی حکومت نے اُن کو افغانستان میں اپنا سفیر بنا کر بھیجا اور انہوں نے سفارت کے فرائض بوجہ احسن ادا کئے۔

عبدالرحمٰن شہید کو نامعلوم افراد نے راستہ چلتے ہوئے رات کے اندھیرے میں گولیوں کی بوچھاڑ سے زخمی کیا اور زخموں کی تاب نہ لا کر وہ ہسپتال میں چند روز کے بعد خالقِ حقیقی کے حضور میں پہنچ گئے۔ ان کے قتل کے اسباب کے بارے میں کوئی فیصلہ کُن بات نہیں کہی گئی۔ مختلف باتوں میں سے میرے نزدیک سب سے زیادہ قرینِ قیاس یہ ہے کہ انہیں غازی حسین رؤف بے کے دھوکے میں قتل کیا گیا۔ اس لئے کہ وہ شکل و شباہت میں ان سے بہت ملتے جلتے تھے۔ خود غازی حسین رؤف بے کی باتوں سے بھی یہ مترشح ہوتا ہے کہ وہ اپنے منہ بولے بھائی کے قتل سے بہت زیادہ متاثر اسی لئے ہوئے کہ ان کا قتل خود

ان کی مشابہت کی وجہ سے ہوا ہے۔ مگر اس قتل کا سرا اس زمانے کی ترکی کے سیاسی حالات میں تلاش کرنا چاہیئے۔ ترکی کی سیاست نے ایک نیا رُخ اختیار کیا جو سرکاری طور پر مذہب سے بے تعلق ہو گیا حالانکہ ترکی کا سلطان صدیوں سے مسلمانوں کا خلیفہ یعنی جانشین پیغمبر اسلام تھا۔ ہندوستان کے مسلمان ترکی کی محبت اسی لیئے کرتے ہیں کہ ان کا سلطان نہ صرف سلطنتِ عثمانیہ کا سلطان تھا بلکہ مسلمانانِ عالم کا خلیفہ بھی تھا اور اس میں کسی خاص ملک کی تخصیص نہیں تھی۔

یہ بات بھی عیاں تھی کہ ہندوستان کے مسلمان صدیوں سے خلافتِ اسلامیہ کے پیرو تھے چنانچہ جب مصر کے خلیفہ عباسی کا سفیر ہندوستان آیا تو فیروز تغلق نے اس کا نہایت شاندار استقبال کیا اور اپنے کو خلیفہ کے خادموں میں ہونے کا فخر کیا۔ اس طرح خلافت سے وابستگی ہندوستان کے مسلمانوں کے دلوں میں پیوست تھی۔ عبدالرحمٰن پشاوری بھی اسی جذبے سے متاثر تھے اور شاید اسی جذبے کی قیمت ان کو اپنی جان سے ادا کرنی پڑی۔ بہرحال جو کچھ بھی ہوا۔ عبدالرحمٰن شہید نے اپنی جان نثار کر کے آنے والی نسلوں کے لیئے قربانی و ایثار کی ایک بے مثال نشانی چھوڑی۔ کاش ان کے نشان راہ پر چلنے کا جذبہ زیادہ سے زیادہ مسلمان نوجوان کے دلوں میں پیدا ہو۔ اگر ایسا ہو جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ عبدالرحمٰن شہید کی قربانی رائیگاں نہیں گئی۔

بنا کردند خوش رسمے بہ خون و خاک غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

خواجہ عبدالوحید

دیباچہ

تحریر : ڈاکٹر ریاض الحسن

۱۸۵۷ء کے خونیں ہنگامے کے بعد سید احمد خاں نے مسلمانوں کی تباہی پر غور کرنا شروع کیا تو انہوں نے اس تباہی سے نکلنے کے لئے تعلیم جدید یا مغربی تعلیم کا نسخہ تجویز کیا۔ اس کے لئے انہوں نے انگلستان کا سفر کیا اور وہاں کے نظامِ تعلیم کا بغور جائزہ لیا پھر اس تعلیم کو ہندی مسلمانوں میں جاری کرنے کے لئے انہوں نے علیگڑھ میں مدرسہ اور کالج کھولا۔ اس خیال سے کہ مغربی تعلیم کا انتظام انگریز پروفیسران بہتر کر سکتے ہیں کیونکہ ہندوستان اس وقت انگریزوں کے زیر تسلط تھا۔ سید احمد خاں نے اپنے بیٹے سید محمود کے مشورے سے انگریز اساتذہ اسکول اور کالج کے لئے مقرر کئے۔ سید احمد خاں کا خیال تھا کہ جدید تعلیم سے لیس ہو کر ہندی مسلمان ترقی کریں گے اور اسلام اور ملک کے لئے کارآمد ثابت ہوں گے۔

مگر دوسری طرف انگریزوں کا خیال کچھ اور تھا۔ انگریز جہاں کہیں اور جس خطۂ زمین پر اپنا قبضہ جماتے ہیں وہاں کے لوگوں میں انگریزی تعلیم اپنے اثر کو بڑھانے اور اپنی حکومت کو مستحکم کرنے کے لئے جاری کرتے ہیں۔ اس میں کلیسا بھی برابر کا شریک ہوتا ہے چونکہ

مغربی تعلیم کی پیش کش یہاں مسلمانوں کی طرف سے ہوئی تھی اس لیئے انگریز حاکموں نے اس کا بڑے شوق سے استقبال کیا اور بڑی حد تک اس میں مدد دی۔

مسٹر بیک (Beck) کالج کے پہلے پرنسپل مقرر ہوئے۔ یہ جسٹس محمود کے کیمبرج یونیورسٹی میں ہم سبق تھے اور انھیں کی سفارش پر مسٹر بیک کا تقرر ہوا تھا۔ کچھ زمانہ گذرنے کے بعد مسٹر بیک نے اپنا رنگ جمانا شروع کر دیا اور جہاں وہ انگریزی تہذیب کی خوبیاں بیان کر کے طلبار کے دلوں میں انگلستان کی عظمت کا اثر بٹھانا چاہتے تھے وہاں مسلمانوں اور اسلام کے زوال پر بھی کچھ چھینٹے اُڑا دیتے۔ سید احمد خاں کے زمانے میں علیگڈھ میں مغربی تعلیم کو جس طریقہ پر جاری کیا گیا تھا اس کے مخالفین پیدا ہو گئے تھے ان میں سر فہرست نام اکبر الہ آبادی کا آتا تھا۔ اکبر تعلیم جدید کے مخالف نہیں تھے مگر وہ علم کے حصول کو انگریزوں کے ذریعہ نہیں چاہتے تھے کیونکہ اس میں رخنہ پیدا ہونے کا اندلیشہ تھا اس لیئے انہوں نے تعلیم جدید پر اعتراضات بھی کیئے۔ ان کا ایک شعر قدیم اور جدید کو نہایت بہتر طریقہ پر پیش کرتا ہے۔ ؎

پرانی روشنی میں اور نئی میں فرق اتنا ہے
انھیں کشتی نہیں ملتی انھیں ساحل نہیں ملتا

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری قدیم تہذیب کے اعلیٰ مقاصد تو ہیں مگر ان کو بروئے کار لانے کے لیئے ممکن ذرائع مہیا نہیں ہیں۔ دوسری طرف مغرب کے پاس وافر وسائل ہیں مگر ان کے پاس کوئی بلند روحانی اور انسانی مقصد نہیں ہے اسی لیئے وہ موجوں پر زندگی گذارتا ہے اور ساحلِ مراد تک نہیں پہونچ سکتا۔

پھر مسٹر بیک انتظامی معاملات میں ضرورت سے زیادہ دخل دینے لگے۔ اس

کا نتیجہ یہ ہوا کہ سید احمد خاں کے زمانے ہی میں ان دونوں کے درمیان اختلافات رونما ہونا شروع ہو گئے تھے اور سید احمد خاں نے اپنے بعض قریبی دوستوں سے اس کا ذکر بھی کیا تھا۔

(۲)

سید احمد خاں کے انتقال کے بعد ان کے زمانے کے مشہور پروفیسر علی گڑھ سے چلے گئے۔ سر والٹر ریلے (Sir Walter Raleigh) جو بعد کو آکسفورڈ میں انگریزی شاعری کے پروفیسر ہوتے سید احمد خاں کے انتقال سے پہلے ہی جا چکے تھے مگر سر ٹامس آرنلڈ اور سر تھیوڈو ماریسن ان کے انتقال کے بعد چلے گئے اور ان کی جگہ جو انگریز آئے ان کو انگریزی سیاست کو فروغ دینے اور استعماریت کی روح کو زیادہ نمایاں کرنے کا اسلوب آتا تھا۔ ان میں مشہور مسٹر آرچ بولڈ (Archbold) تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ طلبا میں اس کا سخت ردِ عمل ہوا اور ایک طرح کی شورش انگریز پروفیسروں کے خلاف پلتی رہی۔ یہ اندرونی شورش بالآخر ۱۹۰۷ء کی طلبا کی ہڑتال میں ظاہر ہوئی۔ مولانا محمد علی اس وقت ریاست بڑودہ میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تھے۔ ہڑتال کا حال سن کر وہ علیگڑھ گئے اور وہاں کے حالات کا بغور مطالعہ کیا۔ اس زمانے میں انہوں نے ایک جلسہ میں تقریر بھی کی اور سید احمد خاں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنا یہ شعر پڑھا۔ ؎

سکھایا تھا تمہیں نے قوم کو یہ شور و شر سارا
جو اس کی انتہا ہم ہیں تو اس کی ابتدا تم ہو

اقبال نے اپنی ایک فارسی نظم میں، مغربی تعلیم سے جو انتشار پھیلا ہے اس کا یوں ذکر

کیا ہے ۔ ؎

مشرقی بادہ چشیدا ست زمینائے فرنگ

عجبے نیست اگر توبہ دیرینہ شکست

فکر نوزادۂ او شیوۂ تدبیر آموخت

جوش زد خون بہ رگ بندۂ تقدیر پرست

(۳)

علی گڑھ کی ہڑتال کے زمانے میں وہاں چار عبدالرحمٰن زیرِ تعلیم تھے ۔ اوّل ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، جنھوں نے مسلمانوں کی آزادانہ تعلیم کے لئے سلطانیہ کالج کی تجویز مرتب کی تھی مگر ان کی عمر نے وفا نہ کی تاہم اس تجویز کا جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں تجربہ کیا گیا ۔ دوم عبدالرحمٰن سندھی المعروف بہ عبدالرحمٰن صدیقی، انھوں نے ملک کی سیاست میں نام پیدا کیا ۔ یہ کلکتہ کارپوریشن کے صدر اور بنگال اسمبلی اور مرکزی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے ۔ بلقان کے طبی وفد کے منیجر بھی تھے اور مشرقی پاکستان کے گورنر بھی ۔ سوم عبدالرحمٰن پشاوری جن کا حال آپ اس کتاب میں پڑھیں گے ۔ مصنف نے ان کے حالات بڑی کاوش اور جانفشانی سے جمع کئے ہیں اور خاصی تحقیق کی ہے جو آسان نہیں تھی ۔ چہارم عبدالرحمٰن ادہمی جو گورکھپور کے ایک نامور وکیل ہوئے ۔

عبدالرحمٰن، پشاور کے ایک مشہور اور معروف خاندان کے فرد تھے ۔ ان کے والد حاجی غلام صمدانی کا ایک بہت بڑا کاروبار تھا ۔ وہ برطانوی فوج میں رسد پہنچانے کا انتظام کرتے تھے ۔ عبدالرحمٰن ایک نہایت ذہین طالب علم تھے ۔ ان کی صلاحیتیں بہت وسیع تھیں ۔ پڑھنے لکھنے کے شوق کے ساتھ ان کے دِل میں اسلام اور ملک کی خدمت کا

جذبہ بھی تھا جو جنگِ بلقان کے وقت بروئے کار آیا۔ جب بلقان کی عیسائی حکومتوں نے سلطنت عثمانیہ پر ترکوں کو ایک زوال آمادہ قوم سمجھ کر حملہ کیا تو ہندوستان کے مسلمان تڑپ اٹھے اور ان کی مدد کے لئے کھڑے ہو گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ترکی کے سلاطین صدیوں سے مسلمانوں کے خلیفہ ہوتے آئے تھے۔ پھر ترکی مسلمانوں کی آخری حکومت تھی جو مغربی طاقتوں کے استبداد سے ایک حد تک آزاد تھی۔ حالانکہ غیر ملکی قرضوں اور اندرونی بدانتظامی کی وجہ سے نہایت کمزور ہو گئی تھی۔ اس وقت ہندی مسلمان مولانا محمد علی کی قیادت میں مسلمانوں کی اس رہی سہی طاقت کو کسی حد تک بچانے کے لئے تیار ہو گئے۔ چونکہ ہندوستان انگریزوں کے قبضے میں تھا اس لئے اسے کسی قسم کی فوجی مدد دینے کا سوال پیدا ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے میدانِ جنگ میں ایک طبی وفد بھیجنے کی تجویز ہوئی۔ اس وفد میں کل چوبیس ۲۴ اشخاص شامل تھے جن میں پانچ ڈاکٹر اور بقیہ مرہم پٹی کرنے والے اور زخمیوں کو میدانِ جنگ سے اٹھا کر لانے والے تھے۔ یہ لوگ زیادہ تر علیگڑھ کے فارغ اور غیر فارغ طلبا تھے۔ اس وفد کی قیادت ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے سپرد ہوئی جو ہندوستان کے مشہور سرجن تھے۔

جیسا کہ قارئین کو معلوم ہو گا عبد الرحمٰن علیگڑھ دو دفعہ گئے۔ اوّل ۱۹۰۷ء کی ہڑتال سے کچھ پہلے جب ان کا داخلہ اسکول میں ہوا۔ دوسری دفعہ جنگ بلقان سے کچھ پہلے۔ جب دوسری دفعہ وہ علی گڑھ گئے تو علم کا ایک بے پایاں شوق بھی ساتھ لے گئے۔ اس زمانے میں انہوں نے خاص کر نپولین کی زندگی کا اتنا مطالعہ کیا کہ وہ "حافظ نپولین" کہلانے لگے۔ اس زمانے میں ایک امریکی پروفیسر ابات (Abbott) کی مشہور اور ضخیم نپولین کی سوانح عمری شائع ہو چکی تھی۔ اس میں نپولین کا مثالی کردار پیش کیا گیا تھا۔ خیال ہے کہ

عبدالرحمن نپولین کی جوانمردی، شجاعت، فنِ جنگ کی مہارت اور سب سے زیادہ اس کی انگریز دشمنی وغیرہ سے بہت متاثر ہوئے ورنہ نپولین میں بھی وہی یورپی استعمار کی روح کارفرما تھی۔ اور اسی کے اثر سے اس نے مصر پر حملہ کیا اور دو برس بعد انگریزوں سے شکست کھا کر واپس گیا۔ نپولین کا خیال تھا کہ انگریزوں کو ہندوستان میں شکست دینے کا راستہ استنبول سے گزرتا ہے اس مقصد سے وہ شام اور فلسطین کی طرف بڑھا مگر وہاں بھی اس کو ناکامی ہوئی۔ نپولین کے استعماری ارادے عبدالرحمن کی نظروں سے اوجھل تھے۔ وہ اس کو صرف اس کی شجاعت اور انگریز دشمنی کی نظر سے دیکھتے تھے۔

جب مولانا محمد علی نے ترکی طبی وفد میں لئے جانے والوں کے لئے اپیل کی تو عبدالرحمن نے لبیک کہا اور ترکی جانے کے لئے انہوں نے اپنے کپڑے اور دوسرا سامان بیچ کر اپنا سفر خرچ برداشت کیا۔ یہ بڑے ایثار اور جذبے کی بات تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اگر وہ اپنے والد سے اپنا ارادہ بلقان کے طبی وفد میں شرکت کرنے کا ظاہر کرتے تو ان کو اجازت نہ ملتی اس لئے کہ ان کی صحت ٹھیک نہیں تھی۔ اس لئے انہوں نے خدمت اسلام کے شوق میں اپنے گھر والوں کی اجازت اور ان کو اطلاع دیئے بغیر تیاری کر لی اور اپنے کپڑے وغیرہ فروخت کر دیئے۔

یہ طبی وفد دسمبر ۱۹۱۲ء میں بمبئی سے ایک اطالوی جہاز ”سردینیا“ (Sardegna) سے روانہ ہوا اور دو ہفتہ بعد استنبول پہنچ گیا۔ وہاں اس کا بڑے جوش کے ساتھ استقبال کیا گیا اور جب عام ترکوں کو معلوم ہوا کہ ہندی مسلمان خالص اسلامی جذبہ سے متاثر ہو کر ان کی مدد کے لئے آئے ہیں تو ان کا جوش و خروش اور بھی بڑھ گیا۔ اس وفد نے اس طرح بین الاقوامی سیاست سے ہندوستان کو

پہلی بار عملی طور پر روشناس کرایا۔

طبی وفد کو پہلے ترکی کی انجمن ہلال احمر نے مغربی محاذ جنگ پر بھیجا جو استنبول کے مغرب میں ساٹھ میل کے قریب واقع تھا۔ میں نے شتلجہ (استنبول سے قریباً پچپن ساٹھ میل مغرب میں) کے قریب ایک گاؤں عمرلی میں پتھر کی وہ تختی دیکھی ہے جو طبی وفد کی یاد میں وہاں نصب کی گئی تھی۔ کئی ماہ کے بعد ڈاکٹروں اور مرہم پٹی کرنے والوں کا ایک حصہ چناق بھیجدیا گیا جہاں ایک اسپتال قائم کیا گیا تھا۔ عبدالرحمٰن نے پہلے عمرلی میں پھر چناق میں طبی کام بڑے چوکس طریقے سے کیا۔ ان کے خطوں سے بھی ترکی کے اس زمانے کے حالات پر روشنی پڑتی ہے۔

جنگِ بلقان کے بعد طبی وفد اگست ۱۹۱۳ء میں ہندوستان واپس آگیا مگر عبدالرحمٰن ترکی میں ٹھہر گئے۔ ان کا ارادہ ترکی میں رہ کر اور فوج میں داخل ہو کر مسلمانوں کی خدمت کرنا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں میں فوجی تنظیم اشد ضروری ہے اور یورپ کا جو استعماری طوفان مشرقی ممالک پر خاص کر مسلمان ملکوں پر مسلط ہے اس کا توڑ صرف قوت سے کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت ترکی کے سوا کسی اور اسلامی ملک میں فوجی قوت بنانے اور اس کو صحیح طور پر استعمال کرنے کی صلاحیت باقی نہیں تھی اس لئے انہوں نے ترکی میں رہنا پسند کیا۔ اسی زمانے میں ان کی ملاقات حسین رؤف بے سے ہوئی جو جنگِ بلقان میں حمیدیہ جہاز کے مشہور کپتان کی حیثیت سے بڑی ناموری اور شہرت حاصل کر چکے تھے۔ انگلستان کے بعض اخباروں نے حمیدیہ کے کارناموں پر حیرت کا اظہار کیا تھا اور لکھا تھا کہ یقیناً حمیدیہ کا کپتان ترک نہیں بلکہ کوئی انگریز ہے۔ بہرحال رؤف بے نے اس جوہر قابل کو پرکھ لیا اور پھر اس کی ہر طرح حمایت کی۔

(۴)

پہلی جنگ عظیم کے ابتدائی دور میں رؤف بے کو ایک سیاسی مشن پر افغانستان بھیجا گیا۔ ان کے ساتھیوں میں عبدالرحمٰن پشاوری کے علاوہ کئی ترک افسر اور ایک جرمن افسر فان ہنٹگ (Von Hentig) تھے۔ ساتھ ترکی فوج کا ایک دستہ حفاظت کے لئے بھی تھا۔ یہ قافلہ جب ترکی کی حدود سے نکل کر ایران میں داخل ہوا تو کئی سو میل جانے کے بعد استنبول سے رؤف بے کو بلاوا آیا اور وہ عبدالرحمٰن پشاوری کے ساتھ ترکی واپس آ گئے۔ ترکی افسران جن میں کاظم بے تھے اور ان کے ساتھیوں نے فان ہنٹگ کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھا اور وہ کابل پہنچ گئے۔

(۵)

یہ ۱۹۵۵ء کے شروع کا واقعہ ہے۔ اس وقت میں جدہ میں پاکستانی سفارت خانہ میں کام کرتا تھا۔ ایک روز شام کو میں جدہ میں ٹہل رہا تھا کہ ایک انگریز نما شخص کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ تنگ موری کی چوڑی پتلون پہنے ہوئے تھا جو گھوڑ سواری کے وقت استعمال ہوتی ہے اس کے ہاتھ میں چمڑے کا ایک چابک بھی تھا۔ اس نے مجھ سے کچھ پوچھا میں نے اس کے لہجہ سے پتہ چلایا کہ وہ انگریز نہیں ہے۔ باتوں میں معلوم ہوا کہ وہ جرمن ہے اور اس کا نام فان ہنٹگ ہے اور وہ سعودی عرب میں حکومت کا سیاسی مشیر ہے۔ مجھے رؤف بے کے کابل جانے کا حال یاد آ گیا۔ میں فوراً اس سے اس مشن کے حالات پوچھنے لگا۔ اس نے کہا کہ ترکی کے حدود میں سفر کے دوران ان کو کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ گھوڑوں پر سفر کرنا پڑتا تھا اور سامان اور خیموں کے لئے ایک گھوڑوں والی فوجی گاڑی ساتھ تھی لیکن جب ہم ایران میں داخل ہوئے تو معلوم ہوا کہ انگریزوں کو ہمارے سفر کا پتہ چل گیا ہے اور انھوں نے

راستے کے بعض قبائل کو مزاحمت کے لئے تیار کر دیا تھا لیکن چونکہ ہمارا فوجی دستہ ساتھ تھا ہم مزاحمت کے باوجود سفر کرتے رہے۔ ابھی ہم لوگ مغربی ایران ہی میں تھے کہ رؤف بے کو ترکی واپس جانے کا پیغام ملا اور وہ مع اپنے بعض ترک ساتھیوں کے ترکی واپس چلے گئے۔ بہرحال میں نے اپنے ساتھیوں کی دشواری کے باوجود سفر جاری رکھا اور کسی طرح کابل پہنچ گیا۔ کابل کا حال بیان کرتے ہوئے فان ہنٹگ نے کہا کہ اس زمانے کے افغانستان میں انگریزی سیاست کا جال پھیلا ہوا تھا۔ تاہم مختلف عناصر سے مل کر آزاد ہندوستان کی ایک حکومت قائم کرنے میں ہم لوگ کامیاب ہو گئے۔ مگر اس کی زیادہ تر حیثیت کاغذی تھی اور اس کا کام انگریزوں کے خلاف نشر و اشاعت تھا۔ لیکن کابل کے قیام میں میں نے دیکھا کہ جو بات ہم امیر حبیب اللہ والیٔ افغانستان یا ان کے وزیروں سے کہتے اس کی اطلاع انگریزوں کو پہنچ جاتی اور ان کا ہر وقت توڑ کرنے سے ہم کو پتہ چل جاتا کہ ہمارا کابل میں رہنا بے کار ہے اس لئے ہم واپس ترکی چلے گئے۔

(۶)

انیسویں صدی کے وسط سے انگریزوں کی پالیسی یہ رہی ہے کہ عرب کے ساحلی علاقوں کے عرب شیوخ اور سرداروں سے معاہدے کر کے ان کی سیادت ان کے علاقے میں تسلیم کی جائے اور اس طرح ان کو سلطنتِ عثمانیہ سے الگ کر دیا جائے تاکہ کسی مشکل وقت میں ان کو سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف استعمال کیا جائے۔ یہ پالیسی برابر آگے بڑھتی رہی تاآنکہ لارڈ کرزن کے زمانے میں جب وہ ہندوستان کے وائسرائے تھے اس پالیسی میں ایک نئی روح پھونکی گئی۔ خود لارڈ کرزن نے بہ نفسِ نفیس ساحلی علاقوں کا دورہ کیا اور اپنے سفر میں عربی دان انگریز مشیروں کے علاوہ ہندوستان کے ایک مشہور عالم کو جو حیدر آباد دکن میں عربی کے پروفیسر

تھے، ساتھ لے گئے۔ مولانا موصوف لارڈ کرزن کی تقریروں کا عربی ترجمہ کرکے پڑھتے اور شیوخ سے تبادلۂ خیالات میں ترجمانی کا کام کرتے تھے۔ پھر جب اس صدی کے اوائل میں عراق میں تیل نکلا تو انگریزوں کی حرص عراق پر اپنا اثر ونفوذ بڑھانے میں اور بھی تیز ہوگئی۔

پہلی جنگِ عظیم کی ابتدا ہی سے انگریز بصرہ پر قبضہ کرکے ترکی میں داخل ہونا چاہتے تھے اس کے لئے ایک طرف شریف حسین کی بغاوت کا انتظام کیا گیا۔ دوسری طرف درۂ دانیال پر حملہ کیا گیا اور تیسری طرف عراق پر قبضہ کرکے ترکی کو بالکل بے دست وپا کرنا منظور تھا۔ مگر شریف حسین کی بغاوت کے علاوہ درۂ دانیال کا معرکہ انگریزوں کی شدید شکست کی صورت میں ظاہر ہوا۔ عراق میں بھی شروع میں پسپائی ہوئی۔ عراق میں اس وقت ترکی فوجوں کی کمان خلیل پاشا کے ہاتھ میں تھی۔ یہ انور پاشا کے چھوٹے بھائی تھے۔ جنرل ٹاؤن شنڈ (General Townsend) دوسری طرف انگریزی فوجوں کی کمان کر رہے تھے۔ انگریزی فوج میں انگریزی سپاہیوں کے علاوہ ہندوستانی سپاہی کثیر تعداد میں شامل تھے۔ ان میں زیادہ تر بلوچی، پنجابی اور پٹھان تھے۔ ترکوں نے اپنی فوجی حکمت عملی سے انگریزی فوج کو قط العمارہ میں گھیر لیا اور اس کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ کوئی پچاس ساٹھ ہزار فوج مع جنرل ٹاؤن شنڈ کے حراست میں لے لی گئی اور استنبول بھیج دی گئی۔ انگریزی فوج کی کمان بعد کو جنرل ہنری ماڈ (Sir Henry Maud) کے ذمہ ڈالی گئی۔ اس کے بعد انگریزوں نے اپنی مہم تیز کر دی اور کثیر نقصانات اٹھا کر آگے بڑھنے کا ارادہ کیا۔ عراق کی جنگ میں عبدالرحمٰن، خلیل پاشا کی ماتحتی میں ایک اہم فوجی عہدے پر مامور تھے اور ایک ترکی دستے کی کمان کر رہے تھے کہ ایک دفعہ وہ ہندوستانی سپاہیوں کی زد میں آ گئے اور قریب تھا کہ وہ گرفتار ہو جاتے کہ وہ اپنی ترکی وردی پھینک کر اد

پنجابی بول کر صاف نکل گئے ۔ یہ واقعہ مولانا محمد علی نے ایک نجی صحبت میں بیان کیا جب پہلی جنگِ عظیم ختم ہوئی تو وہ استنبول میں تھے اور پھر اناطولیہ جا کر مصطفیٰ کمال پاشا کی آزاد فوج میں ترکی کی جنگِ آزادی میں شریک ہو گئے اور نمایاں خدمات انجام دیں جب ترکی کی پہلی قومی حکومت کی تشکیل ہوئی جس میں رؤف بے وزیرِ اعظم بنے تو عبدالرحمٰن افغانستان میں ترکی سفیر ہوتے ۔ جس زمانے میں وہ کابل میں سفیر تھے اس زمانے میں حکومتِ برطانیہ کی طرف سے سر ہنری ڈابس سفیر تھے ۔ یہ حکومتِ ہند میں اعلیٰ عہدہ پر رہ چکے تھے اور ان کی ملازمت کا زیادہ حصہ سرحد میں گزرا تھا ۔ انہوں نے ایک دِن عبدالرحمٰن سے کہا کہ آپ ہندوستان اپنے والد سے ملنے کے لئے جانا چاہیں تو اِس کا انتظام ہو سکتا ہے ۔ اس پر عبدالرحمٰن نے جواب دیا کہ جب تک ہندوستان میں انگریز ہیں، میں اپنے وطن نہیں جاؤں گا ۔ انہوں نے پیش کش ٹھکرا دی ۔

(۷)

مارچ ۱۹۳۳ء کا آخری ہفتہ ہے ۔ رؤف بے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں ترکی پر توسیعی لیکچر دینے آئے تھے وہ ڈاکٹر انصاری کے یہاں ٹھہرے ۔ ڈاکٹر اقبال نے ان کے پہلے لیکچر کی صدارت کی تھی ۔ لیکچر کے دوسرے دن ڈاکٹر انصاری کے یہاں چائے پر بہت سے لوگ جمع تھے ۔ شعیب قریشی، عبدالرحمٰن صدیقی، چودھری خلیق الزماں، ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر مجیب، ڈاکٹر عابد حسین، غلام محمد وغیرہ موجود تھے ۔ دہلی کے کچھ لوگ بھی مدعو تھے ۔ میں ایک طرف عبدالرحمٰن صدیقی کے پاس بیٹھا ہوا تھا ۔ چائے ختم ہونے پر تھی اور عام گفتگو جاری تھی کہ اتنے میں ایک دبلا پتلا نوجوان کمرے میں داخل ہوا ۔ یہ اس وقت سیدھا علی گڑھ سے آیا تھا جہاں وہ زیرِ تعلیم تھا جب اس نے کہا کہ وہ

عبدالرحمٰن پشاوری کا چھوٹا بھائی ہے تو رؤف بے دفعتاً اس کی طرف لپکے اور اس سے مصافحہ کرکے اس سے لپٹ گئے اور پھر اس کو لے کر ایک گوشے میں بیٹھ کر عبدالرحمٰن پشاوری کے خاندان والوں کا ایک ایک کرکے حال پوچھنے لگے۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے خاندان کا کوئی بچھڑا ہوا فرد مدتوں بعد گھر واپس آیا ہے اور گھر والوں کا حال پوچھ رہا ہے۔ یہ دراصل عبدالرحمٰن کی رفاقت اور ان کی بے لوث اسلامی خدمت کا نتیجہ تھا جس نے رؤف بے کو اس قدر متاثر کر دیا تھا۔ رؤف بے عبدالرحمٰن کو اپنے چھوٹے بھائی کی طرح مانتے تھے اور عبدالرحمٰن ان کے گھر برسوں بھائی کی طرح رہے تھے۔

رؤف بے کے دہلی میں دورانِ قیام ایک دن صبح کو میں ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی گیا اور برآمدے میں بیٹھ گیا۔ اتنے میں عبدالرحمٰن صدیقی صاحب آئے اور انہوں نے مجھ سے کہا کہ رؤف بے کو کشمیری دروازہ لے جاؤ۔ وہاں بے موصوف اپنا گرمی کا سوٹ درزی کے یہاں پہن کر دیکھیں گے۔ میں فوراً تیار ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب کی گاڑی موجود نہیں تھی کسی کو لے کر گئی تھی۔ میں نے کہا کہ پاشا! کشمیری دروازہ دور ہے ابھی گاڑی آجائے گی۔ مگر رؤف بے نے انتظار کئے بغیر پیدل چلنے کا ارادہ کر لیا۔ ہم لوگ پیدل دریا گنج سے نکل کر لال قلعہ کے سامنے پہنچے تو ڈاکٹر صاحب کی گاڑی شعیب قریشی صاحب کو لے کر واپس جا رہی تھی۔ راستہ میں رؤف بے نے مجھ سے کہا کہ وہ ترکی حاجیوں کا جہاز قرنطینہ کے لئے باب المندب کے پاس ایک جزیرے میں لے جایا کرتے تھے۔ وہاں بڑی کڑی دھوپ ہوتی تھی اور سایہ کا کہیں نام نہیں تھا۔ ترکی حاجی ایک یا دو دن کھلے میدان میں گزارتے تھے۔ ان کو بھی تمام دن مع اپنے ملاحوں کے اس کڑی دھوپ میں گزارنا پڑتا تھا۔ رؤف بے نے اس کے بعد کہا کہ دہلی کی دھوپ اور گرمی اس جزیرے کی

گرمی کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ یہاں تو سایہ دار درخت ہیں اور ہوا چلتی ہے وہاں نہ تو سایہ تھا اور نہ ہوا کا کوئی خوشگوار جھونکا۔ مگر ہم لوگ برابر اس دھوپ میں کام کرتے تھے۔ رؤف بے یہ کہتے جاتے تھے اور بڑی شانِ بے نیازی سے قدم آگے بڑھاتے جاتے۔ اتنے میں ہم ریل کے پُل کے نیچے پہنچے تو ڈاکٹر صاحب کی گاڑی آگئی مگر کشمیری دروازہ یہاں سے اب قریب رہ گیا تھا۔ بہرحال ہم لوگ موٹر میں بیٹھ کر درزی کے پاس پہنچے اور پھر فارغ ہو کر ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی پر واپس آگئے۔ بیس سال بعد جب میں نے ان کے پیدل چلنے کا واقعہ ان کو استنبول میں یاد دلایا تو وہ ان کو پوری طرح یاد تھا۔

جس زمانے میں رؤف بے دہلی میں مقیم تھے ان کے پاس علی گڑھ سے عبدالرحمٰن پشاوری کی یاد میں ایک تختی کی نقاب کشائی کی رسم ادا کرنے کی دعوت آئی وہ عبدالرحمٰن صدیقی کے ساتھ علی گڑھ گئے۔ جس دن صبح کو وہ دہلی سے علی گڑھ کے لئے میل ٹرین سے روانہ ہوتے اسی گاڑی سے میں الہ آباد جا رہا تھا۔ کوئی دس بجے کے قریب گاڑی علیگڑھ کے اسٹیشن پر پہنچی تو وہاں مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر سید راس مسعود ہزاروں طلبا کے ساتھ موجود تھے۔ طلبا نے اللہ اکبر اور رؤف بے زندہ باد کے نعروں سے رؤف بے کا استقبال کیا۔ اسی دن رؤف بے نے اس کمرے کے سامنے والی دیوار پر عبدالرحمٰن کی یاد میں ایک تختی کی نقاب کشائی کی۔ اس کمرے میں مرحوم اپنے علی گڈھ کے زمانہ طالب علمی میں رہا کرتے تھے۔ شام کو رؤف بے دہلی واپس آگئے۔ ہندوستان میں رؤف بے نے دہلی، لکھنؤ، بھوپال، حیدر آباد دکن، کلکتہ، لاہور اور پشاور کا سفر کیا۔ پشاور میں عبدالرحمٰن کے خاندان کے مہمان تھے اور چار دن تک اسی کمرے میں ٹھہرے جس میں عبدالرحمٰن رہتے تھے۔

(۸)

۱۹۵۳ء کی گرمیاں تھیں۔ میں اس وقت انقرہ میں پاکستان کی طرف سے ناظم الامور تھا۔ میں نے اپنی ذمہ داری سنبھالنے کے چند ہفتوں بعد استنبول کا سفر کیا اور پہلی فرصت میں رؤف بے سے جا کر ملا۔ اس وقت وہ اق سرائے کے سامنے والے محلہ میں ایک نئی عمارت کی دوسری منزل پر اپنی چھوٹی ہمشیرہ کے ساتھ رہتے تھے۔ انہوں نے شادی نہیں کی تھی۔ ان کا بھانجا بھی ترکی بحریہ میں ایک اعلیٰ عہدہ پر مامور تھا۔ جب میں استنبول جاتا تو ان سے ضرور ملتا۔ ان کے کمرے سے باسفورس کی شاخ زریں نظر آتی تھی۔ جہاں ان کا مشہور جہاز حمیدیہ ایک چبوترے پر سمندر کی لہروں سے بلندی پر لا کر بحری عجائب گھر کے لئے رکھ دیا گیا تھا۔ اس جہاز کو انہوں نے مجھے دور سے دکھایا اور اس سلسلے میں انہوں نے اپنے ملاحوں کی بہادری کی تعریف کی اور بعض کارناموں کی تفصیل بتائی۔

ایک روز انہوں نے گفتگو کے دوران کہا کہ "میں ایک گنہگار انسان ہوں اور ممکن ہے میں نے اسلامی اصول اور اسلامی شعار کی اپنی زندگی میں پوری پابندی نہ کی ہو لیکن میں اسلام کی حقانیت اور سچائی پر پورا ایمان رکھتا ہوں اور اس کو دنیا کے لئے رحمت تصور کرتا ہوں۔" ترکی میں الغائے خلافت کا جو ہنگامہ برپا ہوا اور جو مسائل سامنے آئے اس میں رؤف بے کا بہت سے اصحابِ اقتدار سے اختلاف ہوا۔ ان کی وہ تقریر موجود ہے جس میں انہوں نے خلافت کو ضروری قرار دیا تھا۔ ان کی فکر کا انداز نہ صرف ترکی تھا بلکہ اسلامی بھی۔ پھر ایک دفعہ شام کو جب میں ان کے مکان پر گیا تو وہ جنرل کاظم اور بائی کے ساتھ کچھ کاغذات اور مسودات مرتب کرنے میں مصروف تھے۔ رؤف بے نے کہا کہ جنرل کاظم اور بائی وہ جنرل ہیں جنھوں نے مغربی اناطولیہ میں یونانیوں

کو شکست دینے میں ایک نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ وہ خود اپنی سوانح عمری لکھ رہے ہیں اور اس میں وہ موجودہ ترکی کے بارے میں صحیح حالات پیش کریں گے مگر یہ سوانح عمری ان کی موت کے کوئی پچیس تیس سال بعد شائع ہوگی چونکہ اس وقت تک موجودہ زمانے کے لوگ باقی نہیں رہیں گے اس لئے کسی خلفشار کا اندیشہ نہ ہوگا۔ یہ سوانح عمری انہوں نے ختم کر کے کسی محفوظ جگہ رکھوا دی ہے جس کا کسی کو علم نہیں ہے اور یہ راز ان کے خاص دوستوں کے علاوہ شاید کسی کو معلوم نہیں ہے۔

۱۹۲۶ء میں رؤف بے ترکِ وطن کر کے فرانس چلے گئے تھے اور وہاں پیرس میں رہتے تھے۔ وہ لندن بھی آتے جاتے تھے۔ مولانا محمد علی کی بیماری کے زمانے میں وہ لندن ان کی عیادت کے لئے گئے اور جس دن صبح کو مولانا کا انتقال لندن میں ہوا اس سے ایک دن پہلے تمام رات وہ مولانا کے پلنگ کے پاس بیٹھے رہے اور ان کے انتقال کے بعد ان کی نمازِ جنازہ میں شریک ہوئے۔ رؤف بے ۱۹۳۶ء میں ترکی واپس گئے۔ انہوں نے ۷ / جولائی ۱۹۶۴ء کو استنبول میں انتقال کیا اور ابو ایوب انصاریؓ صحابیٔ رسول اللہ کے مقبرے کے احاطے میں دفن ہوئے۔

عبدالرحمٰن پشاوری بھی مذہبی آدمی تھے اور ان تمام مسائل میں وہ رؤف بے سے پورے طور پر متفق تھے اور ان دونوں کے خیالات میں پوری ہم آہنگی تھی۔ شاید اسی لئے دونوں کا اشتراکِ عمل ایک اعلیٰ نقطۂ عروج پر پہنچا ہوا تھا۔ پھر عبدالرحمٰن بہادری اور جانبازی میں بھی فرد تھے۔ رؤف بے نے ان کی بہادری کے کئی کارنامے بیان کئے اور اس کے بعد ایک تصویر نکال کر دی جس میں رؤف بے عبدالرحمٰن کے ساتھ کھڑے ہوئے ہیں۔

مئی ۱۹۲۶ء کا واقعہ ہے کہ ایک شام کو عبدالرحمٰن کی گفتگو مذہب و سیاست پر ایک نجی مجلس میں خاصی گرما گرمی اختیار کر گئی حاضرین میں ایسے بھی تھے جن کو عبدالرحمٰن کی حقائق پر مبنی گرم گفتاری پسند نہ آئی۔ وہ زمانہ بڑے انتشار و اضطراب کا تھا۔ ان کی گفتگو کا یہ ردعمل ہوا کہ کسی نے ان پر پستول سے فائر کر دیا۔ عبدالرحمٰن کی کسی سے دشمنی نہیں تھی اور نہ وہ ترکی کی سیاست میں حصہ لیتے تھے۔ وہ تو اسلام اور ترکی کی فوجی خدمت کرنا چاہتے تھے۔ دو تین ہفتے تک زندگی اور موت کی کشمکش میں گرفتار رہ کر بالآخر وہ موت کی آغوش میں ابدی نیند سو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

ان کی شہادت کی کئی روایتیں سامنے آئی ہیں اور بعض ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ بہرحال میں جو کچھ تحقیق کر سکا اس کی بنیاد پر میں نے مندرجہ بالا واقعات قلم بند کر دیئے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

محاربۂ بلقان کے ترک مہاجرین:

جب محاربۂ بلقان میں ترکوں کو شکست ہوئی تو بہت سا علاقہ سلطنت عثمانیہ سے نکل گیا۔ اور ان علاقوں سے ترک مہاجرین سلطنت عثمانیہ کی طرف کوچ کر کے آنے لگے۔ اس وقت ہندوستان کا طبی وفد ترکی میں تھا۔ طلعت پاشا جو اس وقت وزیر تھے اور بعد کو وزیر اعظم بنے ان کی صدارت میں مہاجرین کی امداد اور ان کی آبادکاری کے لئے ایک کمیٹی بن گئی۔ اس کمیٹی کا کام اناطولیہ میں ان ترک مہاجرین کو آباد کرنا تھا۔ اس کمیٹی کے چار رکن تھے۔ طلعت پاشا، اسعد پاشا، ڈاکٹر انصاری رئیس ہندی طبی وفد اور مولانا ظفر علی خان۔ ڈاکٹر انصاری نے مہاجرین کے لئے زمین دیکھنے کے لئے اناطولیہ کا بھی دورہ کیا۔ معلوم

ہوتا ہے کہ یہ کام پہلی عالمگیر جنگ چھڑ جانے کے بعد پورا نہ ہو سکا۔ مہاجرین کا اور ذکر آگے آئے گا۔

طبی وفد کے حالات :

طبی وفد کے زمانہ قیامِ ترکی میں ڈاکٹر انصاری، صدر طبی وفد کے مراسلے جو طبی خدمات پر مشتمل تھے۔ برابر مولانا محمد علی کے ہفتہ وار اخبار کامریڈ میں شائع ہوتے تھے۔ اکثر وفد کے منیجر عبد الرحمن صدیقی اور دوسرے ارکان وفد کے مراسلے بھی شائع ہوتے جن سے نہ صرف جنگ کے حالات کا علم ہوتا بلکہ اس زمانے کی سیاست اور ترکوں کی عام زندگی کے مختلف پہلوؤں کا علم ہوتا۔ یہ مضامین اوّل کامریڈ میں چھپتے، پھر ان کا ترجمہ ہمدرد میں شائع ہوتا۔ اکثر ہمدرد میں براہِ راست کوئی مراسلہ چھپ جاتا۔

اتفاق سے رئیس احمد جعفری (جو اب مرحوم ہو چکے ہیں) کا مرتب کیا ہوا اور انھیں کا عطا کیا ہوا "علی برادران" کے نام سے ایک نسخہ میرے پاس نکل آیا۔ اس میں یہ تمام مضامین ہمدرد سے نقل کیے ہوئے موجود ہیں۔ میں ان کے جستہ جستہ اقتباسات یہاں قارئین کی دلچسپی کے لئے پیش کرتا ہوں۔ ان سے طبی وفد اور ان کے ارکان کے بعض حالات معلوم ہوں گے۔

غیر ممالک کے طبی وفود :

جب بلقان کی جنگ شروع ہوئی تو بعض یورپی ممالک نے بھی از راہ ہمدردی بڑے ساز و سامان سے لیس کر کے اپنے طبی وفد ترکی بھیجے۔ ان میں انگلستان، بلجیم اور

ہالینڈ کے طبی وفود تھے۔ برطانوی وفد نے چار مقامات پر شفا خانے کھول رکھے تھے۔ بلجیم اور ہالینڈ کا صرف ایک ایک شفا خانہ تھا۔ اسی طرح مصری ہلال احمر کا ایک شفاخانہ تھا۔ ہندوستان کے طبی وفد کے دو شفاخانے تھے ایک بلقان میں محاذ جنگ سے کچھ پیچھے شتلجہ کے قرب اس کا نام تھا ہندیہ کوئی عمری (یعنی ہندی گاؤں عمری) کا شفاخانہ اور دوسرا شفاخانہ درۂ دانیال میں چناق قلعہ میں تھا۔

ڈاکٹر انصاری کی رپورٹ اور یورپی وفود کی کارگزاری:

ڈاکٹر انصاری نے اپنی ایک رپورٹ میں جو یورپی شفاخانوں کا ناگفتہ بہ حال کام بتایا شائع کیا تو اس سے برطانوی طبی وفد میں اور انگلستان میں کھلبلی مچ گئی۔ انھوں نے اعداد و شمار کے حوالے سے یہ ثابت کیا کہ "عثمانی، مصری، ہندوستانی اور دیگر شفاخانہ جات کے مریضوں کی شرح اموات صرف ۲ یا ۳ فیصدی تھی یا زیادہ سے زیادہ ۸ فیصدی تھی مگر یورپی طبی وفود کے شفاخانوں کی شرح اموات ۱۸ اور ۱۹ فیصدی تھی۔" لیکن ڈاکٹر انصاری کے جس فقرے نے ایک کہرام کی صورت پیدا کر دی وہ یہ فقرہ تھا کہ "عام طور پر یہ افواہ پھیلی ہے کہ بعض طبی وفود کے ڈاکٹروں نے اس استحفاظی طریقۂ علاج کو گلدستۂ طاق جراحی کر دیا جسے دنیا کے بڑے بڑے ماہرین فن جراحی نے اپنا معمول بنایا ہے یعنی استحفاظی طریقہ کو چھوڑ کر کثرت کے ساتھ مریضوں کے اعضا بریدگی کو اپنا شعار بنالیا ہے۔"

برطانوی صلیب احمر کے ایک شفاخانہ واقع استنبول میں ۳ ۔ ۱۸ فی صد فوت ہو گئے۔ ان میں دس مجروحین کے اعضا قطع کئے گئے جن میں آٹھ فوت ہو گئے۔

ایک دوسرے برطانوی ہلال احمر کے شفاخانے واقع اسکودار میں بیس مریضوں کے اعضاء قطع کئے گئے۔"

ڈاکٹر انصاری نے آگے چل کر لکھا ہے کہ "بڑے بڑے جلیل القدر برطانوی اور یورپی ڈاکٹروں نے دوران جنگ میں فنِ جراحی کے استحفاظی پہلو کے متعلق جن روایات کو ہم تک پہنچایا ہے انھیں ہر حالت میں برقرار نہیں رکھا گیا۔" اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے لکھا کہ "یورپی ڈاکٹروں نے جو خدمات ترکی میں آکر انجام دی ہیں ان کے لحاظ سے اگرچہ مجھ پر بحیثیت مسلمان ہونے کے ان سب کا شکریہ اور باعتبار ایک طبیب ہونے کے ان کی مساعی کا اعتراف واجب ہے لیکن جب ان کے نتائج پر نظر پڑتی ہے تو یہ کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ دوسرے شفاخانہ جات کے مقابلہ میں ان کی اموات بہت بڑھی ہوئی ہیں۔"

برطانیہ سے دو طبی وفد گئے۔ ایک تو برطانوی صلیب احمر کا اور دوسرا برطانوی ہلال احمر سوسائٹی کی طرف سے تھا۔ ظاہر ہے کہ برطانوی صلیب احمر کے تمام برطانوی ڈاکٹر عیسائی تھے مگر برطانوی ہلال احمر سوسائٹی جس کے سربراہوں میں سید امیر علی کا نام بھی آتا ہے اس کے ممبران بھی تمام برطانوی ڈاکٹر تھے۔ ہر چند کہ چند ایسے مسلمان نوجوانوں نے بھی جو بہترین برطانوی یونیورسٹیوں کے بعض گریجویٹ اور بعض انڈر گریجویٹ تھے انہوں نے اپنی خدمات بلا کسی مشاہرہ کے مطالبہ کے پیش کی تھیں اور بعض نے تو ترکی جانے آنے کے اخراجات تک اپنی گرہ سے ادا کرنے پر آمادگی ظاہر کی تھی۔ مگر سب کی درخواستیں رد کر دی گئیں یا ردی کی ٹوکری میں ڈال دی گئیں۔" ان کا قصور صرف اتنا تھا کہ یہ درخواست دینے والے "بدقسمتی سے ہندوستانی واقع ہوئے تھے"۔ باوجود مطالبہ کے ان درخواستوں کے مسترد کرنے کی کوئی وجہ نہیں بتائی گئی۔ الٹے ڈاکٹر انصاری پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ

برطانوی ڈاکٹروں کو بدنام کرنا چاہتے ہیں۔

اب ذرا برطانوی شفاخانہ جات کی کارگزاری بھی سن لیجیئے۔

ایک ترکی ڈاکٹر نے اپنی سرکاری رپورٹ میں برطانوی شفاخانوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "..... ایک مریض مرض کزاز میں مبتلا تھا اس پر عمل جراحی کرنے کے لئے جس مقراض اور دیگر آلات کا استعمال کیا گیا انھیں آنچ دیئے بغیر یا عرق دافع مواد سمیہ میں دھوئے بغیر دوسرے مریضوں کے زخموں کے لئے بلا تامل استعمال کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس شفاخانہ میں چھ مریض کزاز میں مبتلا ہو کر جاں بحق ہو گئے......"

"... بیچش کے بارہ[۱۲] مریض جنھیں علاج کی ضرورت تھی بلا علاج چھوڑ دیئے گئے۔ یہاں تک کہ یہ بیچارے ایک ایک کر کے درد و کرب اور ضعف و نقاہت کے عالم میں جاں بحق ہو گئے......"

"..... ہیضہ کے مریضوں کے لئے علیحدہ رکھے جانے کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا۔ انھیں دوسرے مریضوں کے ساتھ رکھا گیا۔ ایک مریض جو نہایت ضعیف و نقیہ تھا اور جس کا دوسرے دن انتقال ہو گیا اس نے پینے کے لئے پانی مانگا تو یوریی ڈرلیسر نے (مریض کی دیکھ بھال کرنیوالا) جس کے سپرد اس کی تیمارداری تھی بجائے پانی کا آبخورہ دینے کے اپنے بوٹ سے ایک ٹھوکر اس کی چھاتی پر رسید کی۔"

ترکی طبیہ مدرسہ واقع حیدر پاشا کا ایک پروفیسر انگریزی شفاخانہ جات میں سے ایک کی بابت یہ لکھتا ہے کہ "یہ افواہ رہ رہ کر میرے کانوں تک پہنچی ہے کہ بہت سے اعمال جراحی (جو مستلزم قطع اعضاء نہ تھے) ایسے کئے گئے جن کی بالکل ضرورت نہ تھی اور جنھیں فن طب ہرگز جائز نہیں سمجھتا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے مریض جانبر نہ ہو سکے۔"

شتلجہ کے محاذ پر حملہ فوجی شفاخانہ جات کا ایک افسر ان شفاخانوں کی صفائی کے بارے میں لکھتا ہے کہ "وہ یورپی اخبارات جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ترکی ڈاکٹروں نے اپنے مریضوں کا علاج بہترین طبی اور جراحی اصولوں کے مطابق نہیں کیا۔ اس الم افزا حقیقت کو بخوبی ذہن نشین کرلیں کہ بجائے ترکی ڈاکٹروں کے یہ الزام ان یورپی صلیب احمر کے وفود پر بدرجہ اولیٰ عاید ہوتا ہے جو قسطنطنیہ یا میدانِ کارزار میں موجود ہیں۔"

دراصل یہ یورپی طبی وفود جو یورپی ڈاکٹروں پر مشتمل تھے وہ انسانی ہمدردی کا لبادہ اوڑھ کر بلقان کی جنگ میں ترکی مجروحین کا علاج کرنے اس لئے نہیں گئے تھے کہ وہ واقعی مجروحین کے صحتیاب ہونے میں طبی مدد دیں بلکہ وہ اس لئے گئے تھے کہ وہ یہ دیکھتے کہ ترکی کے مرد بیمار میں اب کتنی جان باقی ہے اور ترکی کی جنگی صلاحیت اب کتنے دنوں کی مہمان ہے۔ پھر ترکی کا حصہ بخرہ کرنے میں کتنا وقت اور لگے گا۔ میدانِ جنگ وہ مقام ہے جہاں کسی قوم کی پوری صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس لئے ان وفود نے ضرور کوئی ایسی رپورٹ اپنی اپنی حکومتوں کو دی ہوگی اور اس کی ایک نقل ضرور برطانیہ کے دفترِ خارجہ میں موصول ہوئی ہوگی اس واسطے کہ انگریز کی بین الاقوامی چودھراہٹ اس وقت تک باقی تھی۔

لیکن نو سال کے بعد ترکی کا مرد بیمار پھر کھڑا ہوگیا اور وہ جس کو بلقان کی جنگ میں بلقان کی متحدہ طاقتوں کے خلاف شکست کا سامنا کرنا پڑا اس نے قط العمارہ میں انگریزی جنرل ٹاؤنشنڈ کو گرفتار کرکے اس کی ساٹھ ہزار سپاہ کو قید کرلیا اور دوسری طرف انگریزی اور فرانسیسی بحری بیڑے کو آبنائے درۂ دانیال سے نہیں گزرنے دیا اور ان کے دو تین گھنٹے کے اندر سات جنگی جہاز غرق کر دیئے۔

اب ایک بات فنِ طب اور اسپتالوں کی بابت کروں گا۔ کوئی تئیس چوبیس سال کا ذکر

ہے کہ مجھے روما (اٹلی) کے مشہور دِق کے اسپتالوں کو دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ اسپتال روما شہر کے باہر ایک شاداب پہاڑی پر واقع ہے۔ اس کا نام ہے فورلانینی اسپتال (Forlanini Hospital)۔ اس میں کوئی دو ہزار مریضوں کی گنجائش ہے یہاں پہلی بار اس صدی کے شروع میں پھیپھڑے کے زخم کو کاٹ کر نکال دینے اور زخم کو بند کر دینے کا عمل جراحی ہوا۔ اس کے بڑے ڈاکٹر نے دوران گفتگو میں مجھے بتایا کہ یورپ میں سائنس کے میدان میں خاص کر طب اور عمل جراحی میں جو ترقی ہوتی ہے اور جو تجربے ہوتے ہیں وہ انگلستان میں چھ سات سال میں پہنچتے ہیں اس لئے کہ انگریز ڈاکٹر کسی نئے تجربے کو بجائے عقل کی روشنی میں دیکھنے کے روایت کی نظر سے دیکھتے ہیں ان کی قدامت پرستی ان کی عقلی زندگی پر غالب آجاتی ہے۔ یہ کوئی سینتیس سال پہلے کی بات ہے۔ اب ممکن ہے کہ یہ روایتی انداز کچھ بدل گیا ہو۔

ترکی ڈاکٹر چونکہ زیادہ تر فرانس اور جرمنی کے تربیت یافتہ تھے اس لئے یقیناً وہ انگریزوں کی قدامت پسندی کے سامنے زیادہ کارآمد اور مفید خدمات انجام دیتے ہوں گے اور آج کے ترک ڈاکٹر تو کسی طرح یورپی ڈاکٹروں سے پیشہ کے لحاظ سے کم نہیں۔ بیم عمر پاشا جو ایک زمانے میں انجمن ہلال احمر کے صدر تھے بچوں کے علاج میں بین الاقوامی شہرت رکھتے تھے اور دور دور یورپ سے مریض ان کے علاج کے لئے آتے تھے۔ انجمن ہلال احمر کے ایک وفد کے صدر کی حیثیت سے وہ ۱۹۲۴ء میں ہندوستان بھی آئے تھے۔

مہاجرین کی حالت زار :

ذیل میں ایک مراسلے کے جستہ جستہ اقتباسات نقل کئے گئے ہیں کہیں کہیں ان کو مختصر

کر دیا گیا ہے۔

"جب بلقان میں عثمانی افواج کو پیچھے ہٹنا پڑا تو جو ترک یونانی اور بلغاری علاقوں میں رہتے تھے وہ عثمانی حدود کے اندر ترک وطن کر کے آ گئے۔ فی الحال ان کی آبادکاری کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ یہ لوگ میدانِ جنگ سے بہت پیچھے ہندی طبی وفد کے قریب خیموں میں یا دیہاتی مکانوں میں وقتی طور پر بسائے گئے تھے۔ ان کی دیکھ بھال اور ان کی خوراک کا انتظام ہندی طبی وفد کے ذمہ تھا۔ جون کے اوائل میں جب جنگ کا خاتمہ نظر آ رہا تھا اور شفاخانوں میں مریض آنا بند ہو گئے تھے تو ڈاکٹر انصاری نے حکم دیا کہ شفاخانے بند کر دیئے جائیں۔ اور ان کا آدھا سامان ترک ہلال احمر کو دیدیا جائے اور آدھا ہندوستان واپس کر دیا جائے۔ جب مہاجرین کو معلوم ہوا کہ شفاخانہ جا رہا ہے تو وہ بہت مغموم ہوئے اور شفاخانے والوں سے بار بار یہ پوچھنے کہ "آپ ہم کو بیچ میں چھوڑ کر جا رہے ہیں۔

"..... ایک مریض نے جس کا داہنا ہاتھ ٹوٹا ہوا تھا ایک ترکی شعر پڑھا جس کا مطلب تھا کہ تم کو ہماری قدر نہیں لیکن یقیناً ایک روز آنے والا ہے جب تم میری جستجو کرو گے اور میں نہیں ملوں گا۔ یہ شعر پڑھ کر آنسو بھر لایا اور دوسرے بھی چشم نم ہو گئے۔"

"..... ہندیہ عمرلی گاؤں میں سائٹ کے قریب مہاجرین آباد تھے جن کو دونوں وقت ہمارے یہاں سے کھانا پہنچتا تھا۔ چونکہ ان مہاجرین میں پردہ نشین مستورات زیادہ تھیں اور مردکم اس لیے کھانا گھر پر پہنچایا جاتا ہے اور دونوں وقت ایک دو ممبر تقسیم کرنے کے لئے ہمراہ جاتا تھا۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر رضا صاحب گھر گھر جا کر علاج کرتے تھے اور ہر روز دو دفعہ اپنے بیماروں کو دیکھنے جاتے تھے۔ اس برتاؤ نے خصوصیت سے سب کو گرویدہ بنا لیا تھا۔ ان سب باتوں سے مہاجرین کا تعلق ہم لوگوں سے اتنا گہرا ہو گیا کہ ہمارے

خیمے اکھڑتے وقت ان کو دلی صدمہ پہنچا۔

"میدانِ جنگ سے روانگی سے پہلے وفد کے ممبران احمد عزت پاشا سپہ سالارِ افواجِ عثمانی سے ملے اِس وقت عبد السلام پاشا (جو عرب تھے) جو ترک شفا خانوں میں افسر اعلیٰ تھے اور محمود پاشا ناظم بحریہ، عزت فواد پاشا کمانڈر سواری، ضیا پاشا کمانڈر خطِ مدافعہ اوّل بھی تشریف فرما تھے۔ ڈاکٹر انصاری نے ترجمان کے ذریعہ احمد عزت پاشا کا سواری کے لئے گھوڑوں کے بھیجنے اور وداعی ملاقات بخشنے کا شکریہ ادا کیا۔ پاشا موصوف نے جواب میں کہا کہ یہ ایک معمولی بات ہے اور پھر فرمایا کہ "آپ لوگ جا رہے ہیں اور چھوڑنے کو طبیعت نہیں چاہتی اور جدائی کا تصور کر کے طبیعت کو کوفت ہوتی ہے۔" اس پر مسٹر شعیب قریشی نے عرض کیا کہ ہم لوگ آپ کی خدمت میں اس غرض سے حاضر ہوئے ہیں کہ تمام مسلمانانِ ہند کی طرف سے آپ کا شکریہ ادا کریں کہ جناب والا نے مختلف طریقوں سے سہولت بہم پہنچا کر ہر روز اپنے عساکر ہماری امداد کے لئے متعین کیا اور ہم کو اس قابل بنا دیا کہ اپنے شجیع بہادر مگر مظلوم زخمی بھائیوں کی خدمت کر سکیں۔ یہ وہ خدمت ہے جس کے لئے تمام دنیا کے مسلمان تڑپ رہے ہیں۔ ہم کو فخر ہے کہ خدا کی عنایت سے ہم اپنے جانباز فرزندانِ اسلام کی خدمت کر سکے۔"

احمد عزت پاشا کی تقریر:

ہز ایکسیلنسی اس تقریر سے بہت متاثر ہوئے اور فرمایا کہ "افسوس آپ نے ترکی کو اس حالت میں دیکھا جب کہ وہ اعدا سے چاروں طرف گھرا ہوا ہے۔ اور تمام دنیا اس کے درپے آزار ہو رہی ہے۔ کاش آپ لوگ اس کو فتح اور عروج کے زمانے میں دیکھتے شکست

و فتح خدا کے اختیار میں ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کیا نتیجہ ہوگا۔ کوئی اکیلی طاقت تمام دنیا کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ہم نے اپنی طرف سے کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا۔ قدرتِ خداوندی میں کوئی چارہ نہیں۔ جو اس کو منظور تھا وہ ہوا۔ ہماری سلطنت سے بہت سا قیمتی علاقہ نکل گیا۔ ہمارے بھائیوں پر ناگفتہ بہ مظالم ہو رہے ہیں۔ جس کا دل پر داغ ہے اور جس کی یاد نہ صرف ہمارے لئے سوہانِ روح بنی ہوئی ہے بلکہ آئندہ نسلوں کے لئے بھی منشاء زندگی صرفِ انتقام کا خیال ہوگا۔"

ہندی مسلمانوں کا ترکوں سے تعلق:

اس کے بعد ہز ایکسیلنسی احمد عزت پاشا انتہائے جوش میں کھڑے ہو گئے اور پھر فرمایا کہ "ہم کو سب کھو کر ایک بے بہا چیز حاصل ہوتی ہے جس نے اس نقصان کے خیال سے زیادہ تلافی کر دی اور ان مصائب کی تاریکی میں وہی ایک روشنی ہے جس سے آئندہ کی اُمیدیں وابستہ ہیں اور جس نے تمام قوم میں اُمید کی نئی روح پھونک دی ہے اور یہ یقین ہے کہ ہم کو اس لڑائی کی وجہ سے جو حاصل ہوا ہے کہ ہزاروں میل فاصلے پر ہمارے درد میں برابر کا حصّہ لینے والے موجود ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے اخوت اسلامی اور ہمدردی کی مثال ہمارے سامنے پیش کر کے ہم کو اس قدر اخلاقی نفع پہنچایا ہے کہ جس کو ہم عثمانی کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتے۔ بلکہ فی الحقیقت یہ ایک ایسا گراں بہا احسان ہے جس سے ترک کسی وقت بھی سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ میں آپ کا اور ہندوستان کے تمام مسلمانوں کا اپنی طرف سے اور بحیثیت کمانڈر انچیف عساکر عثمانیہ کی طرف سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ میرا پیغام ہندوستان ضرور پہنچا دیں۔ افسوس میں وقت معین نہیں کر سکتا۔ تاہم خلوص سے عرض کرتا ہوں کہ میرا دل احسانمندانہ خیالات سے اس قدر لبریز

ہے کہ ضرور ایک دن خود ہندوستان آپ کی مساعی جمیلہ کا شکریہ ادا کرنے حاضر ہوں گا۔"

مسٹر شعیب قریشی نے اس کے جواب میں کچھ کہنا چاہا لیکن ہز ایکسیلنسی کی تقریر نے سب کے قلوب میں کچھ ایسے مخصوص جذبات پیدا کر دیئے کہ اظہار خیالات کی قدرت باقی نہیں رہی۔ ؎

اسی روز شام کو احمد عزت پاشا کی طرف سے وفد کے ممبران کی دعوت تھی۔ اس موقع پر وہ سب سے بڑی بے تکلفی اور سادگی سے ملے اور کئی مرتبہ کہا کہ "تم میرے بچے ہو"۔ بیٹھتے وقت نہایت سادگی اور سادگی سے زبردستی اپنے پاس بٹھاتے اور کوئی چیز میز سے اٹھا کر خود پیش کرتے۔ اس کے بعد ہنس کر فرمانے لگے کہ "اگرچہ میں روزانہ آٹھ نو میل پیدل چلتا ہوں اور دو گھنٹہ گھوڑے کی سواری کرتا ہوں تاہم میں موٹا ہو گیا ہوں۔ اس وقت بہت سے ڈاکٹر موجود ہیں، کوئی دوا بتلائے کہ جسم ہلکا ہو جائے"۔ پھر فرمایا کہ "کیا ہندوستان میں بھی موٹے آدمی ہوتے ہیں جس پر ہم میں سے ایک صاحب نے اسمٰعیل حسین شیرازی کو پیش کیا کہ مختصر نمونہ تو یہ ہے لیکن ہندوستان میں تو ایسے موٹے ہیں کہ وہ کوئی حرکت بھی نہیں کر سکتے۔ عزت پاشا اس پر بہت ہنسے اور فرمایا کہ خدا کا شکر ہے کہ میرے ساتھی اور بھی ہیں۔ اتفاق سے عبدالرحمٰن پشاوری علالت طبع کی وجہ سے نہیں

؎ مدتوں بعد شعیب قریشی صاحب نے راقم الحروف سے بیان کیا کہ جس وقت احمد عزت پاشا تقریر کر رہے تھے تو فرطِ جوش سے ان کے آنسو نکل آئے اور انھوں نے رومال سے کئی بار آنسو پونچھے۔ جب یہ موقع ختم ہو گیا تو شعیب صاحب نے وہ رومال احمد عزت پاشا سے بطور یادگار مانگ لیا کیونکہ اس میں ملتِ اسلامیہ کے سرشک غم جذب ہیں۔ پاشا موصوف نے فوراً رومال شعیب صاحب کو مرحمت کر دیا جو ان کے پاس محفوظ تھا اور اب بھی ان کے خاندان میں ہو گا۔ ریاض الحسن

آئے تھے ۔ پاشا نے فوراً سوال کیا " برادر افغان کجا است "۔

چناق قلعہ میں آمد :

اس کے بعد شتلجہ (یورپی ترکی) کے محاذ پر جنگ ختم ہو جانے کے بعد وفد کے تمام ارکان چناق قلعہ میں آگئے اور یہاں سے براہ استنبول بعد کو ہندوستان روانہ ہو گئے کچھ ہفتوں کے لئے ان لوگوں کا قیام چناق قلعہ میں تھا۔ دوران قیام میں وفد کے ارکان نے قدیم شہر ٹروائے (TROY) دیکھنے کا ایک منصوبہ بنایا۔ یہ شہر چناق قلعہ سے شمال کی طرف کوئی پچیس ۲۵ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہاں قدیم یونان کے دو شہروں کے درمیان ایک خوبصورت عورت ہیلن کو اغوا کرنے پر بڑی خون ریز جنگ ہوئی تھی دوسری چیز جو وفد کے ارکان کے خیال میں تھی وہ راستے میں ترکوں کی عام زندگی کا مطالعہ کرنا تھا۔ ایک روز صبح کو آٹھ بجے تین ٹکرم اور دس گھوڑے سواری کے لئے آگئے۔ پختہ راستہ بحر مارمورا کے برابر چلا گیا تھا یعنی ایک طرف سمندر اور دوسری طرف اونچے اونچے پہاڑ تھے۔ سڑک وسیع قدرتی مناظر اور دلفریبیوں کی بہ زمین مظہر ہے۔ جا بجا پانی کے چشمے اور نالے دونوں طرف پھولوں کے قطعات، زیتون اور چیڑ بے حساب، انگور کی کشت زاریں تو یہاں اس طرح ہیں جیسے ہندوستان میں مویشیوں کے لئے گوار بے اندازہ کاشت کرتے ہیں۔ راستہ میں قصبہ ازین کوئی آیا۔ اس میں مسلمان بھی تھے لیکن زیادہ تر یونانی عیسائی آباد ہیں ڈاکٹر حسن بے ہم کو اس قصبے کے اندر لے گئے اور پھر ہم کرنل راجب بے کے مکان پر گئے جو اس حلقے کے کمانڈر ہیں۔ انھوں نے ہم سب کی قہوے اور چائے سے تواضع کی اور کھانے کے لئے بھی کہا مگر چونکہ کھانا ہمارے ساتھ تھا اس لئے معذرت کر دی۔ روانگی کے وقت کرنل موصوف دور تک دھوپ میں ہم لوگوں کو پیدل چھوڑنے آئے ۔"

"جب کچھ آگے بڑھے تو ہلالِ احمر کا ایک شفاخانہ ملا جہاں ارکانِ وفد نے کھانا کھایا رات کو ان لوگوں نے وہاں قیام کیا اور ان کے لئے خیمے نصب کر دیئے گئے چونکہ لوگ دن بھر کی گھوڑے کی سواری سے تھک گئے تھے اس لئے ایک دن آرام کا رکھا گیا۔ سید تونگر حسین کو تھکان کی وجہ سے بخار آگیا اور حامد رسول گھوڑے کی سواری کے لئے پھر تیار نہیں ہوئے۔ شام کے وقت دھوپ کسی قدر نرم ہوئی تو ڈاکٹر فیضی، ڈاکٹر رحمٰن، سید اسمٰعیل حسین شیرازی اور چند دیگر اصحاب گھوڑے لے کر نکلے۔ دس میل پر موضع تھا۔ لوگ ہم لوگوں کو دیکھ کر حیران ہوئے کہ یہ کون لوگ ہیں۔ لیکن جب ہلالِ احمر کے ڈاکٹر کاظم بے نے جو ہمارے ساتھ تھے بتایا کہ یہ ہندوستانی ہلال احمر کے ڈاکٹر ہیں جو کام ختم کر کے اپنے بھائیوں کو یہاں دیکھنے آئے ہیں تو فوراً ہمارے گھوڑے پکڑ کر ہم کو اتارا۔ ایک قہوہ خانہ میں لے گئے۔ گھاس کی بنی ہوئی چھوٹی چھوٹی کرسیاں لا کر ڈال دیں اور ہم سب بیٹھ گئے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ صرف اس موضع میں سے ستّر آدمی لڑائی پر گئے ہیں۔ تھوڑی دیر میں قہوہ آگیا۔ جب ہم نے رخصت چاہی تو نہایت خلوص اور سادگی سے مصر ہوئے کہ آج رات یہیں گزار دیں مگر ڈاکٹر حسن بے متفکر ہو گئے اس لئے واپسی ہی مناسب معلوم ہوئی۔"

"یہ جگہ اور بعد میں دوسرے دیہات دیکھ کر یہ قیاس بے جا نہ ہوگا کہ تمدن، تہذیب مذہبی احساسات اور عام طرزِ معاشرت میں استنبول سے قطع نظر کر کے دیہات اور قصبات ہندوستانی مسلمانوں کے طرز بود و ماند سے بہ ہمہ وجوہ فائق ہیں۔ مکانوں کا طرزِ تعمیر، ان کی صفائی ستھرائی، عورتوں کی تعلیم، پردہ اور حیا مردوں کا ستر پوشی لباس، نماز روزہ اور دیگر اسلامی احکام کی تعمیل یہ سب باتیں ایسی ہیں کہ وہ مسلمان جن کو خدا نے ان تمام نعمتوں سے مستفید فرمایا ہے بجا طور پر ناز کر سکتے ہیں۔ مستورات بلا تکلف باہر نکل کر کام کرتی ہیں لیکن

ایسے گہرے پردے میں کہ مجال نہیں کہ غیر مردان کی ایڑی بھی دیکھ پاتے ۔ دیہات میں دھوبی کا نام نہیں ۔ امیر گھروں میں خادمہ اور متوسط اور غریب گھروں میں اپنے کپڑے خود دھو لیتے ہیں ۔ ہر گھر میں ایک چھوٹا سا باغیچہ ضرور ہوتا ہے ۔ کبھی کسی بچہ کو برہنہ یا میلہ کچیلا نہیں دیکھا ۔ مردوں کا لباس ہمارے افغانی ہینگ بیچنے والے بھائیوں سے ملتا جلتا ہے ۔ شلوار پگڑی بعض جگہ خد و خال بھی ملتے جلتے ہیں ۔ صرف امتیازی نشان ہر مرد میں یہ ہے کہ افغان تند خوئی میں ضرب المثل اور ترک نرم خوئی میں عدیم المثال ۔ بہر حال شام کو واپس شفا خانے پہنچ گئے ۔

"دوسرے دن صبح کو واپس گھوڑوں پر سوار ہو کر چلنے کے لئے تیار ہوتے اس وقت ہمارا اور اپنے اسٹاف کا ہمارے ساتھ فوٹو لیا گیا ۔ گھوڑوں والا گروپ خصوصاً شاندار ہے ۔ اور تقریباً چالیس گھوڑسواروں کا دستہ چم ادیہ گاؤں سے روانہ ہو گیا ۔ راستہ میں قاضی بشیر الدین صاحب نپولین نے اور عبدالرحمن پشاوری کو مارشل نے کا خطاب ملا[لے] غلام احمد خان اور میرے لئے بھی اسٹاف کی مناسبت سے نام عطا ہوئے اور سب سے کار آمد اور موزوں نام سید اسمٰعیل حسین شیرازی کے لئے توپ خانہ کا تجویز ہوا ۔ راستہ بہت خراب تھا ۔ ۔ ۔ مارشل نے اور نپولین کی بغلی حرکتوں سے سب کا قافیہ تنگ تھا ۔ کبھی کبھی اسٹاف کو بھی اس میں شامل ہونا پڑتا ۔

"منشی تفضل حسین صاحب نے اپنے قد کا لحاظ کئے بغیر ایک نہایت ہی جسیم گھوڑا اپنے لئے پسند فرمایا اور اس پہ دونوں ہاتھوں سے زین پکڑ کر اس شان سے بیٹھے کہ ان کی ہیئت کذائی نے نپولین (قاضی بشیر الدین) اور مارشل نے (عبدالرحمن پشاوری) کو مجبور کیا کہ اپنی فوجی نقل و

لے مارشل نے نپولین کا وزیر خارجہ اور اس کے اعتبار کا آدمی تھا ۔

حرکت کے دائرے میں ان کو بھی شریک کریں لیکن دو ہی دفعہ گھوڑے کی دولتی جھاڑنے پر
منشی صاحب نے مناسب سمجھا کہ ان شاہی ہمراہیوں سے علیحدہ ہو کر ڈاکٹر حسن بے سے بھی
دو قدم آگے چلیں تاکہ گھوڑا سکون سے چلے اور ان کا سفر بھی خیریت سے کٹ جائے۔"

"دس پندرہ میل چلنے کے بعد قصبہ "ازنیہ" میں پہنچے یہ ضلع چناق قلعہ کی ایک تحصیل
ہے۔ اس قصبہ میں ایک پل ہے۔ پل سے گزر کر قصبہ کے ٹاؤن ہال میں پہنچے۔ یہاں چند
فوجی سپاہی کھڑے تھے انھوں نے ہمارے گھوڑوں کے بندھوانے کا انتظام کیا۔ ٹاؤن ہال
کے چند بابو لوگ ہم کو بالاخانے پر لے گئے جو نہایت خوش نما طریقہ سے آراستہ تھا اطلاع ملنے
پر تحصیلدار صاحب مع عمائدین کے ہم سے ملنے کے لئے تشریف لائے۔ دیر تک مسلمانانِ ہند کا
حال پوچھتے رہے۔ قہوہ اور سگریٹ کے بعد قصبہ کی سیر کو نکلے۔ اس قصبہ میں عیسائی کم
اور مسلمان زیادہ ہیں۔ بازار میں کٹے ہوئے بڑے بڑے پتھر کی سلوں کا فرش ہے۔ چمڑے کا
کام بنانے والوں کی دوکانیں یہاں زیادہ نظر آئیں، جوتا، گھوڑے کا زین، پیٹیاں، بٹوہ، بوٹ
وغیرہ یہاں بنتے ہیں اور پرانی وضع کے جوتے بھی۔ قصبہ میں گھومنے کے بعد دو تین دیہاتوں میں
بھی گئے۔ ہر جگہ نہایت فراخ دلی کے ساتھ ہمارا خیر مقدم ہوا اور معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان
کی پرانی طرز کے شرفاء سے ہم مل رہے ہیں۔ وہی خلق، وہی تواضع، وہی متانت و وقار، ہر گاؤں
میں پختہ مسجد، قہوہ خانہ اور مکتب موجود ہیں۔ گاؤں کے چاروں طرف انگور اور زیتون کے باغات
بکثرت جو دور سے ہندوستان کے آم کے باغات معلوم ہوتے ہیں۔ موضع کے آدمی مصر تھے
کہ ہم لوگ گاؤں میں ٹھہریں لیکن ڈاکٹر حسن بے نے باہر زیتون کے درختوں کے سائے میں ٹھہرنے
کی جگہ پسند کی۔ ایک بج چکا تھا۔ ڈاکٹر حسن بے اپنے ساتھ نہایت تکلف کا کھانا لائے تھے۔
کچھ انتظام موضع والوں نے کیا۔ تازہ پنیر، دہی، دودھ، پیاز اور چند سبزیاں انھوں نے

بہت سی لا رکھیں بھوک سخت لگی تھی۔ ہم سب نے لطف سے کھانا کھایا۔

"بعدازاں ہم جب چلنے کے لئے نکلے تو دیکھا کہ گاؤں کے آدمی ایک قطار میں ہمارے راستے میں کھڑے ہیں۔ فوجی سلامی کے بعد کپتان نے ان سے یہ کہا کہ دیکھو یہ تمہارے بھائی ہندوستان سے تمہاری تکلیف اور درد میں حصّہ لینے کے لئے آئے ہیں اور انھوں نے عمرلی اور چناق قلعہ میں ہزاروں مجروحوں کا علاج کیا۔ اب یہ رخصت ہونے والے ہیں اور اس نواح میں اپنے بھائیوں کو دیکھنے اور رخصت ہونے کے لئے پھر رہے ہیں۔ کچھ بیان نہیں ہو سکتا کہ یہ الفاظ ان سچے مسلمان نمازیوں میں کیا جذبات پیدا کرتے تھے۔ ان کے چہرے اس مختصر سی تقریر سے چمک اُٹھتے تھے۔ وفورِ جذبات سے بعض کی آنکھیں نم ہو جاتیں اور بعض ایک لمبے سانس لیتے۔ جیسے ہی کپتان کی تقریر ختم ہوئی سپاہیوں نے "لیشاسون" (زندہ باد) کے نعرے لگانے شروع کئے اور جب ہم رخصت ہوئے تو دور تک ہم ان کے دعائیہ فقرے سنتے چلے آئے۔

"جب تک دن کی روشنی رہی تو جہاں سے گزرتے وہاں سے قہوہ اور سگریٹ کی پیشکش ہوتی لیکن اندھیرا ہو جانے پر گھوڑوں کی رفتار تیز کرنی پڑی اور اس طرح زمین بوسی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ بسم اللہ تو ہلال احمر کے ایک بابو سے ہوئی۔ گھوڑا پوری دلکی جا رہا تھا کہ ایک درخت کی شاخ سے اُلجھ گیا اور وہ چاروں خانے چت گرے۔ ان سے ہمدردی کی بجائے سب بے اختیار قہقہہ لگا کر ہنس پڑے اور ان کو تو اس گرنے میں ایک نیا لطف آیا کہ برابر یہ حرکت جاری رہی . . . . ان کے بعد سید اسمٰعیل حسین صاحب شیرازی کا نمبر تھا۔ سچ یہ ہے کہ ان کے گرنے میں بھی ایک شان ہے۔ اگر کوئی شہسواری پہ ناز کرے تو ہمارے شیرازی صاحب بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ گرنے کے لیے بھی کمال کی ضرورت ہے۔ شیرازی صاحب کبھی اس زور سے نہیں گرتے کہ چوٹ آئے۔ اگر گھوڑا اونچا ہوتا تو بتدریج گرتے ہیں۔ اگر گھوڑا ان کے قد کے مطابق

ٹو اتو آٹے کی بوری کی طرح سہولت سے پھسل جاتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس سفر میں شیرازی صاحب نے اپنے کمال کی نمائش دو دفعہ کی لیکن خود شیرازی صاحب کو ایک دفعہ یاد ہے۔ افسوس تفضل حسین، سید تونگر حسین اور مارشل نے عبدالرحمن پشاوری صاحب بھی اس لالچ سے اپنا دامن ہوش کئے بغیر باز نہ رہ سکے اور انھوں نے بھی اپنے لیڈر شیرازی صاحب کی تقلید کی۔"

"دوسرے دن ہم ایک گاؤں میں پہنچے اور پھر وہاں سے ٹروائے (TROY) کے کھنڈر دیکھنے چلے گئے۔ یہ کھنڈر یہاں سے کوئی ایک میل ہے۔ کھنڈروں میں کرد دن اور عربوں کی ایک رجمنٹ ٹھہری ہوئی تھی۔ انھوں نے زمین پر گدے اور قالین بچھا دیئے۔ ہم سب بیٹھ گئے۔ پھر قہوہ اور سگریٹ آیا۔ پیالی میں تھوڑا قہوہ تھا۔ کرنل راہی بے نے بتایا کہ تھوڑا قہوہ دینا عقیدت محبت ہے۔ پیالی بھر کر دینا اس کے برعکس ہے۔ مہمان جتنا زیادہ طلب کرے اس کی طرف سے اظہارِ محبت ہے۔ اگر انکار کرے تو عداوت سمجھی جاتی ہے۔ اس کے بعد کھنڈر دیکھنے گئے۔ یہ نہایت پرانے آثار ہیں اور مرورِ زمانہ سے زیرِ زمین دفن ہو گئے ہیں۔ جب ہم چناق قلعہ واپس آئے تو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر محمود اللہ، عبدالرحمن صدیقی منیجر اور شعیب قریشی بھی کل سے آئے ہوتے ہیں۔"

فتح ادرنہ:

ڈاکٹر انصاری اپنے بہت سے ممبران کے ہمراہ جون ۱۹۱۳ء میں ہندوستان واپس آگئے۔ مگر وفد کے بعض ممبر مثلاً عبدالرحمن صدیقی، شعیب قریشی، چودھری خلیق الزماں، منظور محمود، عبدالرحمن پشاوری ترکی میں ٹھہر گئے۔ اوّل الذکر تین اصحاب تو تین چار ماہ کے

بعد واپس آگئے لیکن منظور محمود اور عبدالرحمٰن پشاوری نے مستقل طور پر ترکی میں رہنے کا ارادہ کر لیا۔ لیکن بعد کو منظور محمود کی صحت خراب ہو گئی اور وہ بھی واپس آگئے۔ اب صرف عبدالرحمٰن پشاوری رہ گئے۔ ان کا حال اب آگے چل کر تفصیل سے پڑھیں گے۔

ڈاکٹر انصاری کی واپسی کے بعد جب بلغاریوں اور یونانیوں میں تقسیم مال غنیمت اور سیاسی حد بندی پر سخت اختلاف ہوا تو انور بے نے پیشقدمی کر کے ادرنہ کو دوبارہ فتح کر لیا اور جو پہلی ریل انجمن ہلال احمر کے لوگوں کو لے کر ادرنہ گئی اس میں عبدالرحمٰن صدیقی، شعیب قریشی اور چودھری خلیق الزماں بھی فوجیوں کی طبی امداد کے لئے گئے۔ ذیل میں عبدالرحمٰن صدیقی کے خط کا جستہ جستہ اقتباس پیش کرتا ہوں جس سے اس وقت کے حالات معلوم ہوتے ہیں۔

"قسطنطنیہ

جمعہ ۲ ستمبر ۱۹۱۳ء

"ہمیں بعض ذرائع سے معلوم ہو گیا تھا کہ ادرنہ کی طرف پیشقدمی کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔ فوراً ہم ڈاکٹر بسیم عمر پاشا کے پاس گئے اور کہا کہ پیش قدمی کی صورت میں ہم ایک چھوٹی سی جماعت مرتب کرنا چاہتے ہیں تاکہ فوج کے ساتھ رہ کر سب سے پہلے مدد دے سکیں۔۔۔۔۔

ڈاکٹر بسیم عمر پاشا نے وعدہ کر لیا کہ ضروری مدد کے لئے تمہیں بھیج دیں گے۔۔۔ لیکن فوج اس قدر تیزی سے آگے بڑھی کہ اس سے پیشتر ڈاکٹر بسیم عمر پاشا ہمارے لئے اجازت حاصل کر سکیں اس نے لولی بورغاص پر قبضہ کر لیا۔ ادرنہ کی دوبارہ تسخیر کا ہر لحظہ انتظار کیا جا رہا تھا۔ علاوہ ان مقامات پر قبضہ کرنے میں کوئی جنگ بھی نہیں ہوئی سوائے اس کے کہ ادرنہ قرق کلیسا اور ریزا کے قریب آخری دن ایک جنگ ہوئی تھی مگر یہ سب چھوٹے چھوٹے معرکے تھے اور حقیقتاً کوئی بڑی جنگ نہیں تھی۔ آخر کار (عید حریت) کی سالگرہ کی شام کو چار بجے

روزنامہ طنین نے (جس کے ایڈیٹر حسین جاہد بے تھے) نے ایک غیر معمولی ایڈیشن نکالا جس سے دنیا کو معلوم ہوا کہ انور بے نے آبائی وطن کی بار دگر خدمت کی ہے۔"

"فوج کا مع اپنے جنگی سامان کے ایک دن میں اسّی کیلومیٹر (۵۰ میل) چلنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ادرنہ سے جو چشم دید شہادتیں ملی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً صبح کے سات بجے پانچ فدائی سوار شہر میں گھس آئے۔ آدمیوں کے واپس آنے پر انور بے کی ہمراہی میں ابراہیم کا رسالہ تقریباً ساڑھے نو بجے آ پہنچا۔ اس کے دو گھنٹہ کے بعد آرمی کور (ARMY CORPS) کی دسویں پلٹن خورشید پاشا کی زیر کمان آ پہنچی اور شہر میں داخل ہو کر تمام استحکامات اور سرکاری عمارات پر قبضہ کر لیا۔ ایک بلغاری جنرل اور تقریباً دو ہزار بلغاری سپاہی قید کر لئے گئے۔ بلغاری دو سو ساٹھ توپیں بھی چھوڑ گئے تھے۔ پانچ فدائیوں کے پہنچنے کے ساتھ لوگ جمع ہو گئے اور "یشاسون عثمان بے (عثمانی زندہ باد) اور "پاشاہم چوق یشا" (پاشا بھی زندہ باد) کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ یہودیوں کے ربی (مذہبی رہنما) بینڈ بجاتے ہوئے گاڑیوں میں نکلے تاکہ ترکوں کا خیر مقدم کریں۔ لوگوں کی بشاش نگاہوں اور چہروں سے معلوم ہوتا تھا کہ اس سے پیشتر ان پر کس قدر ظلم ہو رہا تھا۔ ترکوں کا استقبال کرنے کے لئے آبادی کے ساتھ یونانی بھی تھے کہ ان کے پرانے دوست بلغاری سے ترک بدرجہا افضل ہیں۔۔۔۔ حالانکہ یونانیوں نے مسلمانوں کو قتل کرنے میں بلغاریوں کی بے حد مدد کی تھی۔۔۔۔"

"ہراول کے ساتھ نہ جانے میں جو مایوسی اٹھانی پڑی وہ پورے طور پر زائل ہو گئی جب بسیم عمر پاشا نے ہمیں اپنے ساتھ لیجانے اور ادرنہ میں ہلال احمر کے اسپتال میں کام کرنے کے لئے کہا۔۔۔"

انتظامات کرنے کے بعد ہم آج صبح کو عازم ادرنہ ہوئے۔ سرکیجی (استنبول کا ریلوے

اسٹیشن) کے اسٹیشن ماسٹر نے ہم سے کہا کہ " میں نہیں کہہ سکتا کہ آیا یہ ٹرین سیدھی ادرنہ تک جائیگی یا نہیں اس لئے کہ والی (ادرنہ کے نئے گورنر) جو آپ سے ایک شب پہلے روانہ ہوئے تھے لولی بورغاص سے گھوڑے پر سوار ہو کر جائیں گے۔ بہر حال اتفاق کے سہارے ہم روانہ ہو گئے۔ ہم سب گنتی میں چھ آدمی تھے۔ مبین، خلیق، غلام احمد، منظور محمود، شعیب اور میں ڈاکٹر فواد کی ماتحتی میں جا رہے تھے۔ ہم سینٹ اسٹیفانو، کوچوک چیکمہ اور پیارے عربی کے مانوس مناظر طے کرتے ہوئے اپنے عملیات خانے سمیت دن کے بارہ بجے خادم کوئی پہونچ گئے۔"

"یہاں سے سفر کا نہایت تکلیف دہ راستہ شروع ہوا۔ شاہِ یونان قسطنطین نے بلغاریوں کی سفاکیوں اور خون ریزیوں کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ کاش وہ اپنی عیسائی اسپرٹ کا اظہار اس وقت کرتے جب غریب مسلمانوں کے گلوں پر چھری چل رہی تھی اور خود ان کے سپاہیوں اور افسروں نے ظلم کرنے میں کچھ کمی نہیں کی۔ ممکن ہے کہ بلغاریوں کے مقابلے میں کم خونخوار ہوں مگر مسلمانوں کی مخالفت میں تو سب یکساں ہیں اس وقت یونان ایک تحقیقاتی کمیشن کا مطالبہ کر رہا ہے۔ لیکن مجھے تو یورپ کے انصاف اور حق پسندی پر بالکل اعتبار نہیں رہا۔ اگر اس کمیشن نے تحقیقات بھی کی تو وہ انسانیت اور رحم کے تقاضے سے نہیں بلکہ سیاسی وجوہ سے متاثر ہو کر کریگا اور مظلوموں کے ساتھ کبھی انصاف نہیں ہوگا اور اس طرح اصلی مجرم سزا سے بچے رہیں گے۔"

بلغاریہ والوں کی سفاکی :

"سانجق تپہ اور قلعہ احمد پاشا کا چکر لگاتی ہوئی ریل گاڑی دریائے قاراسو کی وادی میں داخل ہوئی اور یہ وہی مقام ہے جو اس جنگ میں بڑی خون ریزیوں کا منظر رہا ہے۔

ترکی تاروں کے جال یہاں ابھی تک پھیلے ہوئے تھے نگران کی حالت بہت خراب ہے قریب ہی بخشائش کے کھنڈر پڑے ہوئے ہیں شہر کی مسجد کی چار دیواری باقی رہ گئی ہے اور اس پر چھت بھی ندارد ہے۔ جس مینارے سے آذان دی جاتی ہے وہ بھی نصف کے قریب ٹوٹا ہوا ہے۔ بالآخر ہم شتلجہ پہنچے۔ جب بلغاری اس مقام پر آئے تو اس وقت انھوں نے تمام مسلمانوں کو قتل کر ڈالا اور مکانات اور مساجد کو بارود سے اڑا دیا اور جاتے وقت تمام یونانیوں کو بھی قتل کر دیا۔ ان کی اس سفاکی کا نتیجہ یہ ہے کہ شتلجہ سے لے کر لولی بورغاص تک کسی انسان کا پتہ نہیں اور ایسا کوئی مکان نہیں جو قابل رہائش کہلایا جا سکے۔ یہاں بربادی اور تباہی پورے طور پر پائی جاتی ہے۔ ان پہاڑیوں میں مویشی تک نظر نہیں آئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پرندے بھی ان حیوانوں کے خوف سے بھاگ گئے ہیں۔ ریلوے اسٹیشن سڑکوں، گاڑیوں، انجنوں، اور پانی دینے کے حوضوں میں آگ لگا دی گئی تھی۔ اسٹیشنوں کے ترکی نام کھرچ کر بلغاری نام لکھ دیئے گئے ہیں۔ یہ امر کہ ترکی فوج نے کس قدر جلد پلوں اور ریلوے کی پٹڑی کی مرمت کر ڈالی ان کے جوش اور صناعی کی صاف دلیل ہے شتلجہ سے ہو کر پھر ٹرین قباقجہ پہنچی اور وہاں سے سنکیلی اور چرکس کوئی کو جاتی ہے چرکس کوئی بلغاری جنرل سیووف کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ اور وہاں اس کی آنکھوں کے سامنے تمام اسلامی آبادی کو قتل کر دیا گیا۔ مسجدوں کو جلا کر ڈھیر بنا دیا گیا۔ . . . . مانچسٹر گارڈین کا نامہ نگار ہمارے ساتھ تھا، اس نے ان مظالم کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اپنے آپ کو عیسائی کہتے ہوئے شرم آتی ہے . . . . . . شار لو کی تمام ترکی فوجی بارکیں اور اسپتال بالکل محفوظ ہیں اس لئے کہ بلغاریوں کو تباہ کرنے کی فرصت نہیں ملی کیونکہ وہ بہت جلد ان مقامات کو چھوڑ کر واپس جا رہے تھے . . . . چرکس کوئی اور شار لو کے ارد گرد کی پہاڑیوں کی سڑکوں پر ہمیں بہت سی گاڑیاں ملیں

جن میں مرد عورتیں اور بچے بیٹھے جا رہے تھے۔ یہ وہ مہاجرین ہیں جنھیں اپنے اپنے گھروں کو واپس جانے کی اجازت دے دی گئی ہے۔ مگر افسوس! کہ ان کا کوئی گھر نہیں تھا۔ چند مقامات پر ہمیں خاندان کے خاندان ملے جو ایک دیوار کے سائے میں بیٹھے ہوئے تھے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اس اجڑے اور منہدم مکان میں وہ کبھی رہا کرتے تھے۔۔۔ اگر اتفاقیہ کوئی ایسا مکان مل جائے جو صحیح سالم ہو تو۔۔۔۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کسی طرح بلغاریوں کی زد سے محروم رہا۔۔۔۔۔"

ادرنہ میں داخلہ :

"ہماری گاڑی عین مغرب کے وقت لولی بور غاص پہنچی۔ اسٹیشن کے قریب چند مکانات پر نظر پڑی مگر یہاں پر ان غیر مدفون سپاہیوں کی وجہ سے ہوا کثیف ہو گئی تھی۔ جو اس جنگ میں شہید ہو گئے تھے۔۔۔ ہمیں یہاں تین گھنٹے ٹھہرنا پڑا۔ اس کے بعد ہماری گاڑی ایک جنگی ٹرین کے ساتھ ملا دی گئی اور علی الصبح ہم ادرنہ پہنچ گئے۔ ریلوے اسٹیشن کے احاطے میں داخل ہوتے ہی مغربی جانب چند فوجی بارکیں دکھائی دیں جن کو بلغاریوں نے اڑا دیا تھا۔ قریب "کوچوک ضابطان" (فوجی افسروں کی درسگاہ) کی عمارت ہے جو اب عثمانی ہلال احمر کا اسپتال ہے۔۔۔۔ اسی عمارت میں پہلے بلغاری اسپتال تھا اور اس کے مہتمم ڈاکٹر آر گروف تھے۔ اسی عمارت میں انگریزی قونصل اور اس کے دوستوں نے ترکی زخمی سپاہیوں میں انجیل کے نسخے تقسیم کئے تھے۔ غلہ کی بہت بڑی مقدار بلغاری قطنہ میں چھوڑ گئے تھے۔ مگر ایک بہت بڑی مقدار جلا بھی دی تھی۔ مگر جو باقی رہ گیا تھا وہ نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے۔ بہت بڑی مقدار میں سامانِ حرب بھی ترکوں کے ہاتھ آیا۔ علاوہ بریں چالیس ہزار سے ساٹھ ہزار

رائفلیں بھی دستیاب ہوئیں۔ . . . . اسٹیشن سے ہو کر ہم اسپتال گئے جہاں ڈاکٹر بہاءالدین شاکر بے نے ہمارا نہایت پرتپاک استقبال کیا مگر یہ معلوم کر کے لڑائی بند ہونے کی وجہ سے اسپتال بھی بند ہو رہا ہے اس نے ہمارے جوش کو کم کر دیا لیکن ہمارے دلوں میں یہ خوشی سمائی ہوئی تھی کہ ہم ادرنہ میں ہیں اور یہ وہی مقام ہے جہاں ترکوں نے اپنی کھوئی ہوئی عظمت دوبارہ حاصل کرلی ہے۔ . . . . ہم ادرنہ میں صرف چار روز ٹھہرے۔ لیکن اس قلیل عرصہ میں میں نے اس قدر چیزیں دیکھیں کہ ان کا بیان مشکل ہے۔ . . . . کم سے کم دو تین باتیں صاف اور واضح ہیں۔

"اول یہ کہ تمام آبادی اپنے بلغاری حکمرانوں سے سخت عاجز اور نالاں تھی اس لئے انھوں نے نہایت صدق دل اور ایمان داری سے اپنے رہائی دینے والوں کا استقبال کیا۔ . . . . پھر ہم نے اسپتال کی عمارت دیکھی۔ یہ ایک بہت بڑی صاف ستھری عمارت ہے۔ اس میں سربیا کے چند مریض تھے۔ بلغاری اپنے مریضوں کو تو لے گئے مگر اپنے قدیم ساتھیوں کو جوان کے دوش بدوش لڑے تھے چھوڑ کر چلے گئے۔ . . . . آسٹریا کی چند عورتیں محاصرہ کے دنوں میں ڈاکٹر بہاءالدین شاکر بے کی ماتحتی میں مریضوں کی تیمارداری کا کام کر رہی تھیں۔ جب بلغاری آئے اور ڈاکٹر بہاءالدین بے کو گرفتار کر لیا تو یہ ڈاکٹر عورتیں چلی گئیں۔ ان سے بلغاریہ کے بڑے بڑے افسروں نے درخواست کی کہ وہ اسپتال میں کام کریں مگر انھوں نے انکار کر دیا۔ لیکن جب ترکی فوج دوبارہ ادرنہ میں داخل ہوئی، تو وہ عورتیں واپس آگئیں اور انھوں نے اپنا کام شروع کر دیا۔ یہ عیسائی عورتیں آسٹریا کی رعایا تھیں جو بلغاریہ کا دوست ملک ہے اور بلغاری قبضہ کے دنوں میں مریضوں کی تعداد زیادہ تر عیسائی تھی مگر ان عورتوں نے سربیا اور بلغاریہ والوں کی تیمارداری سے انکار کر دیا لیکن غیر فوجی مسلمان آبادی کے

زخمیوں کی تیمارداری کے لئے فوراً تیار ہوگئیں۔"

"اس کے بعد ہم مصری ہلال احمر کا اسپتال دیکھنے گئے۔۔۔۔۔ سب سے پہلا دلچسپ نظارہ جو دکھائی دیا وہ "ہلال عثمانی" کی نمائش ہے جو تقریباً ہر مکان کی کھڑکیوں سے ہویدا ہے۔ قہوہ خانوں اور ہوٹلوں نے طرح طرح سے اس خوبصورت جھنڈے کو سجا رکھا تھا۔ جو دنیا کے تمام قومی جھنڈوں سے زیادہ شاندار ہے۔ شہر میں ترکی سکوں کی کمی ہے۔ اس لئے اگر کوئی چیز خریدی جائے تو اس کے عوض عام طور پر بلغاری سکہ دینا ہوگا۔۔۔۔۔ مصری اسپتال میں چند بلغاری مریض بھی ملے جن میں دو افسر بھی تھے۔"

"ہم لوگ نہایت جوش کے عالم میں جامع سلیم میں داخل ہوئے۔ صرف تین دن پیشتر اس خوبصورت مسجد پر بلغاری پرچم لہرا رہا تھا۔۔۔۔۔ دیگر ترکی مساجد کی طرح یہ مسجد بھی اندر سے بہت خوبصورت اور منقش ہیں۔ بلغاری بوٹ پہنے اس میں داخل ہوتے تھے اور بعض نے اسے نجس کرنے کی بھی کوشش کی تھی مگر خدا کا شکر ہے کہ اس نے ترکوں کو اسے پاک کرنے کے لئے بھیج دیا۔ سپاہیوں کو نماز اور قرآن پڑھتے دیکھ کر تسکین ہوئی۔۔۔۔۔ اس کے بعد والی سے ملنے گئے۔ والی سے رخصت ہونیکے بعد ہم محمد علی پاشا کمانڈر کے دفتر میں گئے۔۔۔۔۔ انھوں نے ایک دفعہ ہمارے اسپتال چناق قلعہ کا بھی معائنہ کیا تھا۔ وہ دفتر میں موجود نہیں تھے تاہم جنرل اسٹاف کے سب سے بڑے افسر انور بے سے مل لیے جو دسویں آرمی کور (ARMY CORPS) سے متعلق ہیں۔ جب عمارت میں داخل ہوئے تو اس وقت پانچ چھ افسر ایک بلغاری سپاہی سے سوالات کر رہے تھے جو قریب کے گاؤں کے ایک مکان میں آگ لگاتا ہوا پکڑا گیا تھا۔ ڈاکٹر غالب بے باہر آئے اور ہمیں ایک کمرہ میں بٹھا دیا جو خوش قسمتی سے انور بے کا کمرہ تھا۔۔۔۔۔ چند منٹ کے بعد انور بے مسکراتے ہوئے آئے اور نہایت انکساری کے ساتھ

ہماری مبارکباد کو قبول کیا۔ پھر ہم نے ان سے رخصت ہونے کی اجازت طلب کی اور ان سے استحکامات دیکھنے کی خواہش کی۔ انھوں نے اجازت دیدی۔ پھر ہم قرآغاچ آگئے۔ دوسرے دن ہم علی الصبح جنوبی قلعوں کو دیکھنے گئے ۔ ۔ ۔ ۔ ہم نے بعض افسروں سے جنگ کی تفصیلات دریافت کیں۔"

"دوسرے دن شہزادہ ولیعہد یوسف عزالدین اور شاہزادہ ضیاء الدین شہر کی سیاحت کے لئے آئے۔ ان کا نہایت شاندار استقبال کیا گیا ۔ ۔ ۔ ۔ شاہزادہ ولیعہد کے ہمراہ احمد عزت پاشا کمانڈر انچیف افواجِ ترکیہ بھی تھے ۔ ۔ ۔ ۔ غلام احمد کے پاس احمد عزت پاشا کی ایک بڑی تصویر تھی اس پر وہ عزت پاشا کی دستخط کرانا چاہتا تھے ۔ ۔ ۔ ۔ اس غرض سے وہ خلیق اور منظور محمود کو لے کر اپنی قسمت آزمانے چلے۔ احمد عزت پاشا، ضیار پاشا، محمد علی پاشا اور دیگر افسروں کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ ان تمام افسروں نے ان لوگوں کو پہچان لیا اور نہایت تپاک سے ان کا خیر مقدم کیا۔ عزت پاشا نے تصویر پر اپنے دستخط کر دیئے۔ لیکن جو محبت ان کو ہندوستان کے ساتھ ہے اس کا اندازہ ان الفاظ سے ہو سکتا ہے جو انھوں نے تصویر پر لکھے۔ الفاظ یہ ہیں "برزم اوغلویہ غلام احمد خان" (میرے بیٹے غلام احمد خان کے لئے)۔"

"محمد علی پاشا نے منظور محمود کو گاتے اور قرآن شریف قرأت سے پڑھتے سنا تھا۔ انھوں نے منظور کی اس قدر تعریف کی کہ عزت پاشا اسے سنے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ دوسرے دن علی الصبح انھوں نے منظور کو اپنے پاس بلایا۔ عزت پاشا نے ان سے سورۂ انا فتحنا لک قرأت سے پڑھنے کی درخواست کی۔ منظور نے سورۃ کی قرأت بڑی خوش آہنگی سے کی جس سے حاضرین پر بے حد اثر ہوا۔ حاضرین نے قرآن شریف سننے کے بعد مرحبا کی آوازیں بلند کیں۔ اس پر منظور کا شکریہ ادا کیا گیا اور ہم لوگ رخصت ہوئے اور سیدھے خضر لق گئے۔ یہ ایک چھوٹا

سا قلعہ ہے جس کے چاروں طرف بارود خانے ہیں۔ قلعہ میں برابر بہت سے کمرے ہیں۔ جہاں شکری پاشا اور ان کے اسٹاف کے افسر رہتے تھے اور یہیں بالآخر وہ قید ہو گئے۔

"بلغاری افواج شہر کو بہت کم نقصان پہنچا سکیں۔ اسلامی محلہ کے چند مکانوں کو بالکل اڑا دیا گیا۔ بہت سی چھوٹی مساجد کو تنوروں، اصطبلوں اور آبدست خانوں میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ چونکہ وہ اس شہر پر ہمیشہ حکمرانی کریں گے اس لئے انھوں نے اس کو بگاڑنے اور برباد کرنے کی کوشش نہیں کی ..... ایک خوبصورت مسجد کو انھوں نے گودام بنایا اور چلتے وقت اس میں آگ لگا دی اور ایک مینار کا اوپر کا حصہ گرا دیا۔"

تاریخ میں ادرنہ کا محاصرہ اور شکری پاشا کی مدافعت نے ایک بڑی اہمیت اختیار کر لی ہے۔ یہ محاصرہ کسی طرح پلونا کے محاصرے سے کم نہیں تھا جہاں ۱۸۷۷ء میں ترکی سپہ سالار نے مہینوں روسی فوج کی پیشقدمی روک رکھی تھی۔

نواب وقار الملک کا بیان:

نواب وقار الملک نے جو اس وقت علی گڑھ کالج کے سیکریٹری تھے ڈاکٹر انصاری کے ہندوستان پہنچنے کے چھ سات دن قبل ۲۵ رجون ۱۹۱۳ء کو ایک بیان دہلی سے شائع کیا۔ اس میں انھوں نے ترکی کے بعض مسائل یعنی بلقانی مہاجرین کی اناطولیہ میں آبادکاری، اسلامی بنک کا قیام وغیرہ پر اظہارِ خیال کے ساتھ ساتھ ترکی اور ہندوستانی مسلمانوں کے تعلقات کا ذکر کیا۔ اس بارے میں انھوں نے لکھا کہ "ڈاکٹر انصاری کے طبی وفد نے جو کامیابی حاصل کی ہے اس سے بہتر مفید نتائج اور طرح سے حاصل نہیں ہو سکتے تھے ..... میرا خیال بالکل اس طرف منتقل نہیں ہوتا تھا کہ مجروحوں کے علاج معالجہ کے سوا جس میں بلاشبہ ایک خاص جزو بہت زیادہ ہمدردی

کا شامل ہو گا اور کوئی اہم پولیٹکل (سیاسی) نتیجہ بھی پیدا ہو گا جس کا سلسلہ اب شروع ہوا ہے۔ یعنی ہندوستان کے مسلمانوں اور ترکوں کے درمیان ایک مضبوط رشتہ اتحاد کا قائم ہونا اور یہ وہ نتائج ہیں کہ جس قدر خرچ اس کارروائی میں ہوا اگر اس سے دس گنا زیادہ روپیہ خرچ ہو جاتا تو بھی یہ نتائج جو حاصل ہوتے بہت ارزاں سمجھے جانے کے قابل تھے۔ آج جو بیج ڈاکٹر انصاری صاحب اور مولوی ظفر علی خان صاحب اور ان صاحبوں کے دوسرے اعوان و انصار کی کوشش سے بویا گیا ہے۔ اگر مسلمانِ ہندوستان اپنی مالی امداد سے اس کی آبیاری کرتے رہے تو وہ عنقریب ایک تناور درخت ہو گا اور ایسا شیریں پھل لائے گا کہ جو بزرگوار اس وقت وفد کی کارروائی کو فضول خرچی سے تعبیر کرتے ہیں وہ غالباً اپنی رائے کو بدلنے پر مجبور ہوں گے۔''

تقریباً یہی رائے احمد عزت پاشا نے اپنی تقریر میں جو اوپر نقل کی گئی ہے دی ہے۔

اور ہم نے اس کا نتیجہ تحریک خلافت، مصطفےٰ کمال پاشا کی قدرے مالی اور مکمل اخلاقی مدد میں دیکھا۔ مجھ سے استنبول میں رؤف پاشا (مرحوم) نے جو ترکی کی قومی حکومت کے پہلے وزیر اعظم تھے بیان کیا کہ ترکوں کی لوزان کانفرنس میں کامیابی نصف تو مصطفےٰ کمال کی تلوار اور نصف ہندی مسلمانوں کی تحریک کی رہینِ منت ہے۔ اس کانفرنس کے نتیجہ میں ترکوں کی ایک نئی حکومت وجود میں آئی جو ماضی کے بندگراں سے بالکل آزاد تھی۔ یہ محمد علی کی قیادت میں ہندی مسلمانوں کی کوششوں کا ثمرہ تھا اور جس کے نتائج آج ہم ترکی اور پاکستان کی لازوال دوستی اور محبت میں دیکھ رہے ہیں۔ آیئے ہم جن بزرگوں نے جنگ بلقان کے طبی وفد میں حصہ لیا اور جنھوں نے اس کی تنظیم کی اور ہندوستان میں اس کے لئے مالی امداد فراہم کی خاص کر مولانا محمد علی جوہر اور ان کے رفقائے کار کی روحوں پر آج فاتحہ پڑھیں اور اسلامی

اتحاد اور اسلامی زندگی کی کوشش کریں کہ دین و دنیا کی کامگاری اور فلاح اس میں ہے۔

آخر میں ایک گزارش ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ تاریخ کا ایک المیہ ہے کہ ہندو پاکستان کے مسلمانوں نے اپنے بزرگوں، مجاہدوں اور زعماء کی تاریخ سے پہلوتہی کی ہے۔ بھلا وہ قوم کیسے زندہ رہ سکتی ہے جو اپنے اسلاف کو بھول جائے یا وہ درخت کیسے بارآور ہو سکتا ہے جو اپنی جڑ کی حفاظت نہ کر سکے۔ عبدالرحمٰن کو لوگ بھول چکے ہیں لیکن مرحوم کے چھوٹے بھائی محمد یوسف صاحب کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے اپنے بڑے بھائی کی سوانح عمری شایع کر کے ایک مجاہدِ اسلام کی زندگی کو از سرِ نو پیش کیا اس لحاظ سے یوسف صاحب ہم سب کے شکریہ کے مستحق ہیں۔

بنا کردند خوش رسمے بہ خون و خاک غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

کراچی ۴ رجون ۱۹۷۵ء

ریاض الحسن

پہلا باب

خاندان

دنیا نے اپنے فخر و شرف کو ہمیشہ خاندانوں کے سلسلوں، نسب ناموں، اسلاف کے شجروں اور مشاہیر و اکابر سے نسبتوں میں تلاش کیا ہے۔ لیکن اسلام نے ساری نسبتوں اور امتیازوں کو مٹا کر صرف ایک نئی نسبت نوع انسانی کو عطا کی ہے اور اس نسبت سے بڑھ کر اور کون سی نسبت ہو سکتی ہے۔ جس کی ایک مسلمان کو تلاش ہو؟ انسان کے لئے معیار شرف جوہر ذاتی اور خود حاصل کردہ علم و عمل ہے۔ نہ کہ اسلاف کی روایات پارینہ اور نسب فروشی کا غرور باطل۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے کیا خوب کہا ہے۔

"ہم کو ایسا ہونا چاہیے کہ ہماری نسبت سے ہمارے خاندان کو لوگ پہچانیں، نہ یہ کہ اپنی عزت کے لئے خاندان کے شرفِ رفتہ کے محتاج ہوں؟ اربابِ ہمت نے ہمیشہ اپنی راہ خود نکالی ہے اور عظمت و رفعت کی تعمیر صرف اسی سامان سے کی ہے جو خود ان کا بنایا ہوا تھا۔ نپولین کا قول مجھے نہیں بھولتا۔ فتح پروشیا کے بعد جب فریڈرک اعظم کی قبر پر گیا تو دیکھا کہ فریڈرک کی تلوار قبر پر لٹک رہی ہے۔ نپولین نے تلوار اٹھا کر ایک ساتھی کے حوالے کی اور کہا" پیرس کے عجائب خانہ کی نذر

کروں گا۔ یہ سُن کر جنرل نے کہا "اگر مجھ کو ایسی باعظمت اور تاریخی تلوار ملتی تو کبھی کسی دوسرے کے حوالے نہ کرتا"۔ نپولین نے کہا "کیا میرے پاس میری تلوار نہیں ہے۔"

پس سچی عظمت کی راہ یہ نہیں ہے کہ فریڈرک کی عظمت یافتہ تلوار لوگوں کو دکھلائیں سچی عظمت وہ ہے جو خود ہماری تلوار کو ہماری نسبت سے ملی ہو اور اگر ایسا ہو گیا تو یہ کافی ہے۔ ہم کو اپنی نیام میں صرف اپنی ہی جوہر دار تلوار رکھنی چاہیے۔ دوسروں کی تلوار کی نمائش سے اگر دیکھنے والوں کا تعجب و احترام حاصل بھی کر لیا گیا تو اس کے اصلی مالک ہم نہیں تلوار کا مالک ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے نپولین کے قول کا جس طرح حوالہ دیا ہے اس سے ان کی دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے اور یہ عجیب توارد ہے کہ عبدالرحمٰن شہید پشاوری کو مشاہیر عالم میں سب سے زیادہ عقیدت نپولین ہی سے تھی۔ انہوں نے نپولین کی زندگی اور اس کے کارناموں کا اتنی بار اور اتنی توجہ سے مطالعہ کیا تھا کہ اس کی پوری داستان حیات انہیں ازبر ہو گئی تھی اور اسی بنا پر وہ علی گڑھ کے زمانۂ تعلیم میں حافظِ نپولین کے عرف سے مشہور تھے۔ اس مطالعہ کا اثر ان کی سیرت پر بھی پڑا اور ان میں اولوالعزمی، مہم جوئی، خطرات کا مقابلہ کرنا، خدشات کو خاطر میں نہ لانے، مشکلات و محالات کو ممکنات میں تبدیل کرنے کا جذبہ، بے پناہ جوشِ عمل اور حیرت انگیز قوتِ ارادی اور استقامت کی خوبیوں اور سیرت کی تشکیل میں اس مطالعہ کا بھی حصّہ تھا۔ لیکن اس کو نہ بھولنا چاہیے کہ ان کی سیرت کی بنیاد میں اسلامی تعلیم کا بہت بڑا حصّہ ہے۔

عبدالرحمٰن کی زندگی کے مطالعہ سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی عظمت کے قصر کی تعمیر اس سامان سے کی تھی جو خود ان کے دست و بازو کا فراہم کردہ

تھا۔ انھوں نے زندگی کے میدانِ کارزار میں قدم رکھا تو صرف اس تلوار پر بھروسہ کیا جو ان کی اپنی نیام میں تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے خاندان و نسب فروشی اور اسلامی تعلیمات کے متعلق سے جو فکر انگیز بحث اپنی مشہور تصنیف "تذکرہ" میں کی ہے، اس کے ایک اور اقتباس کا مطالعہ افادیت اور دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ مولانا لکھتے ہیں :

"خاندان کے فخر کا بُت بھی دنیا کے عہدِ جاہلیت کی ایک یادگار مشئوم ہے اور اسلام نے انسان کے بنائے ہوئے بہت سے بُتوں کے ساتھ اس کو بھی توڑ دیا تھا۔ بہت ممکن ہے کہ کل ایک نومسلم چمار اپنے حسنِ عمل سے وہ مرتبہ پالے جو شیخ الاسلاموں کی اولاد کو نصیب نہ ہو۔ یہ کل کو ہونے والی بات ہے اور آج بھی دنیا میں دیکھ رہے ہیں کہ عمل کا فرشتہ کتنے ہی بڑوں کو چھوٹا کرتا ہے اور کتنے ہی چھوٹوں کو بڑا بناتا ہے۔ ع

کاندریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست!

بلال حبشی اور صہیب رومی کی نسبت اس سے زیادہ ہم کیا جانتے ہیں کہ مسلمان تھے اور سلمان فارسی سے جب اس کے خاندان کا حال پوچھا گیا تو اس نے کہا "سلمان ابن اسلام"۔ بلالؓ سے اللہ کا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کہا کرتا تھا "ارحنا یا بلال"۔ اور جب فاروقِ اعظم کے جنازے پر نماز کی صفیں کھڑی ہوئیں تو ہزاروں قریشی اور ہاشمی مقتدی تھے اور صہیب رومی امام : لیس لاحد فضل علی احد الابدین و تقوی والناس کلہم۔ بنو آدم و آدم من تراب۔

حسن ز بصرہ بلال از حبش، صہیب از روم
ز خاک مکہ ابوجہل، ایں چہ بوالعجبی است"

جہاں تک خاندان کے بُت کا تعلق تھا۔ عبدالرحمٰن کے توڑنے کے لئے باقی نہ رہا تھا۔ اس کی پرستش تو کبھی ان کے اب وجد نے بھی نہ کی تھی بلکہ ان کے والد ماجد نے تو عہد جاہلیت کی اس مشئوم یادگار کو اس طرح مٹایا کہ ان کی اولاد کے دل میں اس سے نسبت کا شائبہ تک نہ رہا۔ ان کی اولاد نے جب بھی ان سے خاندان کی نسبت سوال کیا تو اس کا جواب دینے سے احتراز کیا کہ مبادا ان کے اسلاف اپنی عزت و شرف کی جستجو کے لئے عہدِ جاہلیت کی اس یادگار مشئوم کو اپنا مطلوبِ حیات سمجھ لیں اور ایمان و حسن سیرت و اعمال صالحہ کی اس پونجی سے محروم ہو جائیں جو عہدِ جاہلیت کے اس بت کی محبت کے ساتھ ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتی۔

ان کے آبا و اجداد میں ایک بزرگ جانباز ولی تھے جو ایک قافلہ کے ساتھ کشمیر میں وارد ہوتے۔ ایسا نہیں تھا کہ جانباز ولی کے ہمراہیوں کے خاندانی حالات اور سوانح حیات کی جمع و ترتیب کے لئے کوشش نہ کی گئی ہو لیکن مشیّت ایزدی کو منظور نہ تھا کہ حالات کے جمع و تحفظ کی کوئی کوشش کامیاب ہو۔ عبدالرحمٰن کے والد ماجد شیخ غلام صمدانی کی روایت کے مطابق جانباز ولی اور ان کے ہمراہ آنے والوں اور ان کے مریدوں کے خاندانی حالات و سوانح میں ایک تذکرہ مرتب بھی کر لیا گیا تھا لیکن ابھی مخطوطے ہی کی شکل میں تھا کہ جانباز ولی کے مکان میں آگ لگی اور مکان کے ساتھ وہ مخطوطہ بھی جل کر راکھ ہو گیا اور انسانی سعی نے انتہا کو پہنچ کر بھی مشیتِ ایزدی کے سامنے سر جھکا دیا۔ نام کی ساخت سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید ان کا تعلق وسطِ ایشیا کے کسی

ترکی قبیلے سے تھا۔

یہی وجہ ہے کہ عبدالرحمٰن کے خاندان کے حالات ہمیں اس سے زیادہ معلوم نہیں ہو سکے کہ ان کے جد امجد شیخ غلام صدیق ایک بزرگ جانباز ولی کے ہمراہ کہاں سے وارد کشمیر ہوئے تھے؟ شیخ غلام صدیق کون تھے؟ کس خاندان سے تعلق رکھتے تھے؟ کس ملک سے آئے تھے؟ ان کے اسلاف کو اس بارے میں کچھ معلوم نہیں اور نہ کسی تاریخ سے اس کا پتہ چلتا ہے کشمیر میں حکومت کے قدیم کاغذات کی چھان بین سے صرف اتنا پتہ چل سکا ہے کہ شیخ غلام صدیق تنہا تھے، نوجوان تھے، ان کے ساتھ خاندان کا کوئی فرد نہ تھا اور اس وقت تک ان کی شادی بھی نہ ہوئی تھی۔

عبدالرحمٰن کے بزرگوں میں سب سے پہلے ان کے جد امجد شیخ غلام صدیق ہندوستان تشریف لائے۔ اس وقت ہندوستان میں مغلیہ حکومت کا زمانہ عروج تھا۔ ان کی شاہانہ سطوت، اور معارف پروری، علماء صوفیہ کی قدر دانی اور ہندوستان کی دولت وثروت کی شہرت کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ عالم اسلام کے بڑے بڑے علماء صوفیہ اور شعرا ہندوستان تشریف لا رہے تھے۔ اور اپنی مرادیں پاتے تھے۔ ان آنے والوں میں سب طالب دنیا ہی نہ تھے بلکہ وہ مخلصین امت اور خدمت گزاران اسلام بھی تھے جنھوں نے عہدہ ومنصب اور عزت و دولت کی طلب وتلاش میں ہندوستان کا رخ نہ کیا تھا بلکہ ان کے پیش نظر صرف خدمتِ حق کا عظیم مقصد تھا۔ وہ اسلامی حکومت اور شاہانہ سطوت کے پہلو بہ پہلو اہلِ ہندوستان کے دلوں میں اسلام کی تخم پاشی کرنا چاہتے تھے۔ ان کی زندگی کا صرف ایک ہی مقصد تھا کہ وہ چار دانگ عالم میں اسلام کا پیغام پہنچائیں۔ انہوں نے اپنی خوشی کا سروسامان اسی میں ڈھونڈا تھا کہ آستانہ

اسلام پر لوگوں کے سر نیاز جھک جائیں۔ انھیں مخلصین ملت اور خدمت گزارانِ اسلام کے قافلوں میں ایک قافلہ حضرت جانباز ولی کی سربراہی میں ہندوستان پہنچا اور کشمیر جنت نظیر کو دعوت و تبلیغ اسلام کا مرکز بنایا۔

جانباز ولی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ بغداد کے رہنے والے تھے۔ لیکن اسلام کے جانبازوں نے وطن و قوم کی قید کو گوارا نہیں کیا، ان کا عمل اس پر رہا کہ:

ہر ملک ملک ماست کہ ملکِ خدائے ماست

ان کے لیئے کوئی سرزمین غیر نہ تھی۔ کوئی قوم بیگانہ نہ تھی۔ خدا کی ساری زمین ان کی اپنی تھی اور خدا کی ساری مخلوق ان کا گھرانا تھا۔ وہ جب روانہ ہوئے تو خدا کے مخلصین کا ایک قافلہ تیار ہو گیا اور جہاں پہنچے خدا کے بندوں کا ایک گھرانا آباد کر لیا۔ وہ جب ایک نیئے وطن کی تلاش میں اور مخلوقِ خداوندی کا ایک نیا گھرانہ آباد کرنے بغداد سے روانہ ہوئے تھے تو ایک بڑی جماعت ان کے ساتھ تھی۔ بہت سے افراد راستے میں ان کے شریکِ سفر بن گئے۔ لیکن اس کاروانِ اسلام کے بہت سے افراد راستے کے مصائب کی تاب نہ لا سکے اور جاں بحق ہو گئے اور جب یہ کارواں کشمیر پہنچا تو ان کے ساتھ پچاس ساٹھ مریدین باصفا باقی بچے تھے۔ کہتے ہیں کہ ایران سے کوئی شہزادہ بھی ان کے ہمراہ ہندوستان آیا تھا۔

اس قافلۂ اسلام کے ایک فرد حضرتِ جانباز ولی کے مریدانِ باصفا میں ایک نوجوان غلام صدیق بھی تھے جنھوں نے اپنی سعادت مندی، خدمت گزاری، زہد و ورع، نیکی و تقویٰ، اخلاص عمل، اور اپنی پاکیزہ سیرت سے نہ صرف اپنے مرشد حضرت جانباز ولی کے دل میں اپنے لیے ایک خاص جگہ بنائی تھی بلکہ ان کے پورے حلقۂ ارادت میں

عزت واحترام اور محبوبیت کا مقام حاصل کر لیا تھا۔ جب حضرت جانباز ولی نے اس بے
غرض و بے لوث اور صالح نوجوان کو اپنی خلافت اور جانشینی کے لئے منتخب فرمایا تو ان
کے پورے حلقہ ارادت نے ان کے فیصلہ اور انتخاب کو دل وجان سے قبول کر لیا اور
اس طرح شیخ غلام صدیق اپنے پیر و مرشد کی وفات کے بعد مرکز ہدایت اور مرجع خلائق
بن گئے۔ اور اپنی پوری زندگی دعوت وتبلیغ اسلام اور اصلاح امت میں گزار دی۔
حضرت شیخ غلام صدیق نے اس مذہبی زندگی کو ہمیشہ کے طور پر اختیار نہیں کیا تھا بلکہ
ایک فریضہ دینی سمجھ کر اس ذمہ داری کو قبول کر لیا وہ حقیقت میں مبلغ اسلام تھے۔
ملت کے مصلح اور واقعی مرشد تھے۔ دنیا نے ان کے سامنے صرف عقیدتوں ہی کا
اظہار نہیں کیا بلکہ دولت و ثروت اور امامت وغیرہ کے منصب بھی پیش کئے لیکن
انھوں نے اس دنیا کو سرائے فانی ہی سمجھا اور اس میں سے صرف اسی قدر لیا اور
اس سے صرف اتنا ہی تعلق رکھا جتنا کہ ایک مسافر کے لئے مناسب تھا۔ ان کی
زندگی ایک سچے مسلمان کی زندگی تھی۔ نہ انھوں نے دنیا کو ترک کر کے رہبانیت اختیار
کی جس کا اسلام میں کوئی جواز نہ تھا۔ اور نہ وہ دنیا کی رنگینیوں میں پھنس کر ایک مسلمان
کے فرائض دینی سے غافل ہو گئے۔ انھوں نے اپنی خوشی اور مسرت کا سر وسامان
اتباع نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام اور پیروی اسلام میں ڈھونڈا اور وہ گوہر مقصود
انھیں مل گیا۔ وہ جہاں اپنی مذہبی زندگی میں بے لوث اور اخلاص فی العمل کا نمونہ
تھے، وہاں اپنی عام زندگی میں بڑے خوددار واقع ہوئے تھے۔ ان کی خودداری، سنجیدگی
اور متانت نے ان کی شخصیت کو بڑا پُر وقار بنا دیا تھا۔ وہ اپنی شخصیت کی
انھی خوبیوں کی بنا پر ایک نہایت محترم اور محبوب شخصیت تھے۔ ان کے انھی اوصاف

و محامد سیرت سے متاثر ہو کر کشمیر کے ایک نہایت اعلیٰ اور معزز خاندان نے یہ پوچھے بغیر کہ وہ کون ہیں کہاں سے آئے ہیں اور کس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، اپنی صاحبزادی کو ان سے منسوب کر دیا تھا۔ اور ان کی زندگی اور راحت و آرام کے لئے وہ سب کچھ مہیا کر دیا تھا جو والدین اولاد کے لئے کرتے ہیں۔

شیخ غلام صدیق نے اپنی تمام زندگی بارہ مولا میں اپنے پیر و مرشد جانباز ولی کے آستانے کے قرب میں گزار دی اور پیر و مرشد کے مزار سے دور ہونا گوارا نہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں اولاد کے انعام میں نوازا۔ دولتِ دنیا کی فراوانی دی۔ معاشرے میں عزت دی۔ لوگوں میں سربلند کیا۔ اولاد کی شادیاں ہوئیں۔ ان کی اولاد ہوئی اور ایک مدت تک یہ خاندان کشمیر ہی میں نہایت عزت کی زندگی گزارتا رہا۔ ان کے بعد اُن کے سسرالی خاندان کے لوگوں میں سے جانباز ولی کی خانقاہ کے سجادہ نشین ہوئے۔ محترمہ شیریں تاج، جو حاجی غلام صمدانی کی بیٹی ہیں۔ اپنے ایک رسالہ میں لکھتی ہیں کہ:

> "والد کے ننھیال کے بزرگ آج تک خانقاہ جانباز ولی سے وابستہ ہیں اور بارہ مولا میں سکونت پذیر ہیں۔"

عبدالرحمٰن کے دادا شیخ رحمت اللہ کی شادی بھی کشمیر کے ایک معزز خاندان میں ہوئی تھی۔ ان کے پانچ بیٹے اور ایک صاحبزادی تھیں۔ جن کے نام یہ ہیں۔ محمد صابر، غلام حبیب، غلام صمدانی، غلام صدیق اور غلام رسول۔ صاحبزادی کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ ان میں سے غلام صمدانی ان کے تیسرے بیٹے تھے اور عبدالرحمٰن شہید انہی کے نامور فرزند تھے۔

دوسرا باب

حاجی غلام صمدانی

۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ پرآشوب کے اثرات سے ابھی پوری طرح نجات نہ ملی تھی کہ کشمیر جنت نظیر کو قحط اور خشک سالی نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ کشمیر کے مرغزار جل گئے۔ سبزہ زار چٹیل میدانوں میں تبدیل ہو گئے۔ لہلہاتی کھیتیاں سوکھ گئیں۔ باغ اجڑ گئے۔ چشمے خشک ہو گئے۔ جانور مر گئے۔ بہت سے ماں باپ نے اپنے معصوم بچوں کو روٹی کے چند ٹکڑوں کے عوض بیچ دیا۔ ہر طرف نفسا نفسی کا عالم تھا۔ کوئی کسی کا پرسان حال نہ تھا۔ یہ واقعات ۱۲۹۴ھ کے ہیں۔ لیکن اس کے آثار اس سے بہت پہلے پیدا ہو چکے تھے اور مشکلات پیش آنے لگیں تھیں۔ عبدالرحمٰن کے دادا شیخ رحمت اللہ ایک زیرک اور جہاندیدہ بزرگ تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ قحط کے آثار پیدا ہو چکے ہیں اور اس کے مصائب سے نمٹنے کے لئے وسائل مفقود ہیں بلکہ آیندہ دو سال میں حالات اور سنگین صورت اختیار کر لیں گے۔ انھیں اس بات کا بھی احساس تھا کہ اہل وعیال کا ساتھ ہے اور بہت سے مصائب جو انسان ہنسی خوشی برداشت کر لیتا ہے۔ اور اس کے ماتھے پر شکن نہیں آتی مگر وہ اپنے بیوی بچوں کو اس میں گرفتار نہیں دیکھ سکتا۔ انسان خود بھوکا رہ سکتا ہے لیکن اپنے معصوم بچوں کو بھوک سے

نڈھال دیکھ کر بے چین ہو جاتا ہے اور صبر کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔

بہرحال انہوں نے حالات کی سنگینی کا اندازہ کر کے اپنی اولاد کو پشاور روانہ کر دیا۔ لیکن وہ خود کشمیر ہی میں رہے۔ حاجی غلام صمدانی اپنے بھائیوں اور بہن کے ساتھ پشاور چلے آئے جہاں ان کے ماموں عبدالرحمن بسلسلہ تجارت ایک مدت سے مقیم تھے۔

کشمیر سے پشاور کے سفر میں انھیں بہت مشکلات پیش آئیں۔ بڑی صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑا مختلف رکاوٹیں تھیں۔ بے شمار مصائب تھے۔ بھائیوں اور بہن کا ساتھ زادِ راہ کی کمی، سواری کی تکلیف، بس ایک قیامت تھی جو چھ افراد کے ایک چھوٹے سے قافلے کے سروں پر ٹوٹ پڑی تھی۔ دورانِ سفر میں جو روح فرسا واقعات انھیں پیش آئے تھے، انھیں یاد کر کے حاجی غلام صمدانی فرمایا کرتے تھے کہ جب ہم طویل راستوں کی صعوبتوں کو طے کر کے پشاور پہنچے تو اس وقت ہماری حالت نہایت خستہ اور پریشان تھی۔ زادِ راہ ختم ہو چکا تھا اور ہم نہایت تھکے ماندے اور ناگفتہ بہ حالت میں ایک دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑے تھے اور یہ سوچ رہے تھے کہ اس بھوک اور بدحالی میں کس طرح ماموں کے گھر جائیں۔ ایک طرف غیرت کا سوال تھا، دوسری طرف مجبوری کا عالم تھا۔ اسی کشمکش و پیچ میں کھڑے ہوئے تھے اور کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کیا جائے۔ اتنے میں ایک شخص ہماری طرف آیا اور کہا، "کیا تم میرا یہ سامان میرے گھر تک پہنچا دو گے۔" بڑے بھائی صاحب نے بلا تامل آگے بڑھ کر اس کا سامان اٹھا لیا اور اس کے گھر تک پہنچا دیا۔ اس شخص نے کچھ تو ان کی خاموش طبعی اور مستعدی سے متاثر ہو کر اور کچھ مفلوک الحال شریف

آدمی سمجھ کر انھیں چار آنے مزدوری میں دیئے جو اس محنت کے مقابلے میں بہت زیادہ تھے۔ غرضیکہ اس چار آنے میں چائے اور روٹی خریدی گئی۔ سب نے ہاتھ منہ دھو کر روٹی کھائی، چائے پی۔ جب کچھ جان میں جان آئی۔ تو یہ غریب الوطن قافلہ حاجی غلام صمدانی کے ماموں عبدالرحمٰن کے گھر روانہ ہوا۔ وہ پشاور میں چاولوں کی تجارت کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں دنیاوی جاہ و مال کے علاوہ بہترین خصائل، اعلیٰ سیرت اور بہت سے فضائل و محاسن سے نوازا تھا۔ وہ ایک عالم دین اور متقی و پرہیزگار شخص تھے۔ حاجی غلام صمدانی کی صاحبزادی شیریں تاج لکھتی ہیں:

"والد صاحب تا زیست ان کی خوبی اخلاق اور کنبہ پروری کے صفات اور ان کے احسانات کو یاد کرتے تھے۔ والد صاحب کی پہلی شادی بھی انہی کی دختر نیک اختر کے ساتھ ہوئی تھی۔"

حاجی غلام صمدانی کے ماموں نے صرف زبانی ہمدردی نہیں کی بلکہ اس کا پورا پورا ثبوت اپنے عمل سے دیا۔ ان کی اس ہمدردی اور سرپرستی کا حاجی غلام صمدانی نے نہایت کھلے الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔ فرماتے تھے کہ:

"ماموں بڑے با اخلاق اور ہمدرد انسان تھے۔ وہ ہم سب سے نہایت شفقت اور محبت سے پیش آتے۔ ہمدردی اور دلداری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ہم لوگوں کو غریب الوطنی اور کسمپرسی کا احساس نہ ہونے دیا اور ہم سب بھائیوں اور بہنوں کو اپنی اولاد کی طرح رکھا۔"

حاجی غلام صمدانی کے والد نے اپنے بیٹوں اور صاحبزادی کو پشاور بھیج دیا اور انھیں ہدایت کر دی کہ وہ بہت جلد اپنے پیروں پہ کھڑے ہونے کی کوشش

کریں اور انھیں سمجھا دیا کہ وہ اپنی کمائی کی روزی حاصل کرنے میں کسی قسم کا عار نہ سمجھیں اور ضرورت پڑنے پر چھوٹے سے چھوٹا کام از قسمِ محنت مزدوری بھی ضرور کرلیں۔ لائق اور سعادت مند بیٹوں نے باپ کی یہ نصیحت پلو میں باندھ لی۔
یہی وجہ تھی کہ ماموں کی دلداری اور خاطر مدارات کے باوجود غلام صمدانی اور ان کے بھائیوں نے اس بات کو گوارا نہ کیا کہ وہ یوں پڑے روٹیاں توڑتے رہیں اور کوئی کام دھندا نہ کریں اور اپنی روزی آپ کمانے کی طرف سے غفلت برتیں۔ ان کی تربیت جس شخصیت کے زیر سایہ ہوئی تھی اور جن ہاتھوں نے ان کی سیرت اور شخصیت کی تعمیر میں حصہ لیا تھا اور اس طرح وہ اخلاق و سیرت اور غیرت و خودداری کے جن سانچوں میں ڈھل گئے تھے وہ گوارا ہی نہ کر سکتے تھے کہ کسی کا زیر بارِ احسان ہوا جائے۔ ان کے نزدیک یہ بڑی زبوں بات تھی کہ روزی کمانے کا کوئی وسیلہ ڈھونڈنے کے بجائے ماموں کی دولت و ثروت پر عیش کی زندگی بسر کی جائے۔
چنانچہ چند دن ماموں کی مہمان داری میں گزارنے کے بعد تمام بھائیوں نے مل کر آپس میں مشورہ کیا کہ انھیں اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی جلد از جلد کوئی سبیل نکالنی چاہیئے۔

پھر سب بھائیوں نے روزگار تلاش کرنا شروع کر دیا اور اس بات کا خیال کئے بغیر کہ ان کے ماموں کس حیثیت کے مالک ہیں اور جب انھیں معلوم ہو گا کہ ان کے بھانجے کسی درزی کی دوکان یا چائے کی دوکان میں مزدوری کرتے ہیں تو وہ کیا کہیں گے۔ حاجی غلام صمدانی نے ایک درزی کی دوکان پر نوکری کر لی اور دوسرے بھائیوں نے دوسری مختلف دکانوں پر چھوٹی چھوٹی ملازمتیں کرلیں۔ اس زمانے



بائیں سے دائیں بیٹھے ہوئے ۔ محمد اسحاق پسر، حاجی محمد امین پسر محمد سعید (بچہ گود میں پوتا)
حاجی غلام صمدانی (والد) محمد عثمان پسر، عبدالرحمٰن پسر، محمد نعیم پسر۔ کھڑے ہوئے بائیں سے دائیں ۔ محمد حسن پسر محمد عمر پسر
فرش پر بیٹھے ہوئے دائیں سے بائیں پسر محمد یوسف پسر ۔

میں انگریز پشاور میں فوجی چھاؤنی قائم کر چکے تھے اور فوج کے مختلف کام انگریزوں کی نگرانی میں ٹھیکے پر ہو رہے تھے۔ اس لئے کام کی کوئی کمی نہ تھی۔ حاجی غلام صمدانی نے پوری توجہ سے کام سیکھنا شروع کر دیا لیکن ابھی ایک مہینہ ہی گزرا تھا کہ انہیں چائے کا ایک چھوٹا سا ٹھیکہ مل گیا۔ انہوں نے یہ کام ایسی ہوشیاری، ذمہ داری اور مستعدی کے ساتھ کیا کہ متعلقہ انگریز افسر اُن سے بہت خوش ہوئے اور نتیجہ یہ نکلا کہ ایک سے ایک بہتر اور فائدہ مند کام ان کے ہاتھ آنے لگا اور وہ اپنی مستعدی، دیانت داری اور فرض شناسی کی بدولت نہایت تیزی کے ساتھ ترقی کرنے لگے۔ یہاں تک کہ ٹھیکے کے کئی کام بیک وقت ان کے ہاتھ میں آگئے۔ حاجی غلام صمدانی فرماتے تھے:

"میری مستعدی، حسنِ انتظام، سلیقہ شعاری، دیانت داری اور معاملہ فہمی سے انگریز بہت خوش تھے۔ جب کئی کام میری نگرانی میں چل رہے تھے تو ایک دن انگریز افسرِ ٹھیکہ دار نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تم پوری رجمنٹ کا کام سنبھال لوگے۔ میں نے بڑے وثوق سے کہا، کیوں نہیں سنبھال لوں گا۔ چنانچہ جلد ہی ٹھیکے کی شرائط طے کر کے میرے نام مکمل ٹھیکہ جاری کر دیا۔"

حاجی غلام صمدانی، اپنی محنت، دیانت، کام کے شوق اور لگن اور احساس ذمہ داری کی بنا پر تھوڑے ہی دنوں میں لاکھوں میں کھیلنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے کروڑپتی بن گئے۔ ان کی جس چیز نے انگریزوں کو نہ صرف متاثر کیا بلکہ ان کا گرویدہ بنا دیا تھا وہ ان کی اصول پرستی، دیانت، شرافت، اعلیٰ اخلاق اور بلند سیرت تھی۔ وہ کبھی کسی ٹھیکے کی شرائط بجا آوری میں نہ خود کوئی کمی چھوڑتے تھے اور نہ کسی

بڑے سے بڑے انگریز کو ان شرائط کے خلاف فائدہ اٹھانے کا موقع دیتے تھے۔ وہ جس طرح سختی کے ساتھ خود شرائط کی پابندی کرتے تھے اسی طرح انگریزوں سے بھی اس کی پابندی کرواتے تھے۔ ان کی شرافت اور دیانت کا انگریزوں کے دلوں پر ایسا سکہ بیٹھا ہوا تھا کہ بڑے سے بڑا انگریز بھی شرائط کے خلاف ان کے سامنے چوں نہ کرتا تھا۔ ان کی سیرت میں یہ واقعہ خاص اہمیت کا حامل ہے کہ انہوں نے کبھی شراب اور سور کا گوشت سپلائی کرنے کا ٹھیکہ نہیں لیا۔ اور اس قسم کی سپلائی کی شرط کی صورت میں بڑے سے بڑے ٹھیکے کو نہایت حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا۔ حالانکہ دوسرے ٹھیکوں کے مقابلے میں یہ نہایت منافع بخش کاروبار تھا لیکن ان کی دینی حمیت اور اسلامی غیرت اس بات کو گوارا ہی نہ کر سکتی تھی کہ ایک غیر مسلم کے سامنے ایک مسلمان دنیاوی فائدے اور ہوس زر کے لئے اس درجہ زبوں اخلاق اور پست سیرت کا ثبوت دے۔

حاجی غلام صمدانی آج کل کی اصطلاح میں پڑھے لکھے بزرگ نہ تھے لیکن وہ نہایت ذہین اور حیرت انگیز حافظہ کے مالک تھے۔ اس دوران میں انہوں نے سینکڑوں مرلہ زمین اور باغات خریدے۔ ان کے بے شمار مسائل تھے۔ بیک وقت بیس بیس، پچیس پچیس ٹھیکوں کا کام ہوتا تھا، روزانہ لاکھوں روپے کی الٹ پھیر ہوتی تھی۔ لیکن انہیں پائی پائی کے آمد و خرچ کا حساب زبانی یاد ہوتا تھا۔ بیک وقت تمام ٹھیکوں کے کاموں اور ان کی جزئیات پر ان کی نظر رہتی تھی اور وہ بغیر کسی قلمی یادداشت کے اور کسی کی یاد دہانی کرائے بغیر ہر کام کے بارے میں متعلقہ افراد کو ہدایات جاری کرتے رہتے تھے ایک ہندو منشی ان کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ اُسے ہزاروں روپے

کی آمد و خرچ زبانی لکھوا دیتے تھے۔

حاجی غلام صمدانی کو اللہ تعالیٰ نے بہترین خصائل اور محاسن اخلاق اور فضائل سیرت سے نوازا تھا۔ ذہنی خوبیاں بھی کمال درجے کی تھیں۔ علمائے دین اور صوفیائے کرام کی صحبتوں کو بہت پسند کرتے تھے۔ حلیم الطبع اور سادہ مزاج تھے۔ سیر چشمی، فراخدلی اور غریب نوازی کی خوبیوں سے مالا مال تھے۔ ہوس مال و زر اور حرص دنیا کا دل میں شائبہ تک نہ تھا۔ انہوں نے کبھی کسی کام میں اپنی طرف سے بے توجہی نہیں برتی۔ کسی کام میں سعی سے کوتاہی نہیں کی۔ لیکن کبھی اپنی صلاحیتوں، اپنی کوششوں اور مادی وسائل پر کامیابی کے لئے اعتماد نہ کیا۔ ان کے اعتماد کا مرکز اللہ تعالیٰ کی ذات تھی اور خدا ہی پر ان کا تکیہ تھا۔ انہوں نے اپنے کاروبار میں بہترین نتائج کے لئے تمنا کی اور کوشش بھی کی لیکن اپنی لو کارساز عالم سے لگائی۔

حاجی غلام صمدانی کی زندگی میں متعدد ایسے واقعات پیش آئے جس سے ان کی سیرت کے بعض پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ ان واقعات سے ان کی دین داری، قناعت پسندی، انفاق فی سبیل اللہ اور دیگر خوبیوں کا پتہ چلتا ہے۔ بطور مشتے نمونہ از خروارے یہاں چند واقعات نقل کئے جاتے ہیں۔

(۱) غلام صمدانی مرحوم کا قالینوں کا بہت بڑا کاروبار تھا۔ اس کا مرکز پشاور میں تھا اور شاخیں دہلی، انبالہ اور راولپنڈی میں پھیلی ہوئی تھیں۔ جب پچھلی صدی کے آخر میں ڈیوک آف کناٹ ہندوستان تشریف لائے تو انہوں نے قالین خریدنے کا ارادہ کیا۔ مقامی انگریز آفیسر نے حاجی غلام صمدانی سے اس کا تذکرہ کیا اور یہ پروگرام بنایا کہ جب ڈیوک آف کناٹ

پشاور تشریف لائیں تو انھیں قالین دکھائیں ۔ حاجی غلام صمدانی مرحوم نے دہلی انبالہ اور راولپنڈی سے اعلیٰ درجہ کے قالین منگوا لئے ۔ اور جب ڈیوک پشاور کے دورے پر آئے تو وہ انھیں قالین دکھلائے ۔ ڈیوک ہندوستان کی اس صنعت کے بے نظیر نمونوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور ان میں سے چند قالین پسند کئے ۔ جب انھوں نے حاجی غلام صمدانی مرحوم سے ان کی قیمت دریافت کی تو آپ نے کہا: ”ان کی تین قیمتیں ہیں ۔“

ڈیوک کو بڑا تعجب ہوا کہ ایک چیز کی تین قیمتیں کیوں کر ہو سکتی ہیں ۔ ڈیوک نے اس کی وضاحت چاہی تو آپ نے جواب دیا :

- اس کی ایک قیمت تو یہ ہے کہ آپ اسے میری طرف سے ”تحفتہً“ قبول فرمائیں ۔ یہ میرے لئے بہت بڑا اعزاز ہو گا ۔
- اس کی اصل لاگت جس قدر ہے صرف یہی آپ عنایت فرما دیں ۔ یہ بھی میرے لئے خوشی کا موجب ہو گا ۔ یہ اس کی دوسری قیمت ہے ۔
- اس کی تیسری قیمت یہ ہے کہ لاگت مع کچھ منافع کے عنایت فرمائیں ۔

ڈیوک آف کناٹ ان کی اس بات سے بہت خوش ہوئے ۔ انھوں نے حاجی غلام صمدانی کی تیسری بات قبول کی اور قالینوں کی قیمت مع منافع کے ادا کی ۔

حاجی غلام صمدانی نے ڈیوک آف کناٹ سے درخواست کی کہ وہ ان کے مکان پر قدم رنجہ فرمائیں اور چائے نوش فرما کر عزت افزائی کریں ۔ ڈیوک نے ان کی اس درخواست کو شرف قبولیت سے نوازا ۔ حاجی غلام صمدانی مرحوم نے اِس

موقع پر ڈیوک کی خوشنودی طبع کے لئے بڑا اہتمام کیا۔ مکان کے در و دیوار کو خوب سجایا۔ گلی تک قالینوں کا فرش کیا۔ ڈیوک اپنی ڈچسز کے ساتھ تشریف لائے اور چائے نوش کی۔ حاجی غلام صمدانی نے اس موقع پر نہایت قیمتی اور خوب صورت سچے موتیوں کا ہار ڈچز کی خدمت میں بطور نذر پیش کیا۔ ڈیوک اور ان کی بیگم پشاور کے ایک معزز خاندان میں اس شاندار پذیرائی اور تواضع سے بہت مسرور ہوئے۔

ڈیوک آف کناٹ جو ملکہ وکٹوریہ کے چھوٹے بیٹے تھے، انہوں نے اس موقع پر فرمایا کہ میں چاہتا ہوں آپ میرے ساتھ انگلستان چلیں۔ میں آپ کا تعارف ملکہ وکٹوریہ سے کراؤں گا اور انھیں بتاؤں گا کہ ان کی سلطنت میں آپ جیسے قابل اعتماد، دیانت دار اور منتظم شخص بھی موجود ہیں جو نہایت خوش اسلوبی اور فرض شناسی کے ساتھ اپنی ذمہ داریوں اور اپنے معاہدوں سے عہدہ برآ ہوتے ہیں۔ انہوں نے حاجی غلام صمدانی مرحوم سے بہت اصرار کیا کہ وہ ان کے ساتھ انگلستان چلیں لیکن وہ اس پر آمادہ نہیں ہوئے اور مناسب عذر کر دیا۔ درحقیقت ان کے انکار کی وجہ یورپ کی آزادانہ زندگی اور خورد و نوش میں حلال و حرام کی عدم تمیز کی وہ باتیں تھیں جو عام طور پر ہر شخص کو معلوم ہیں اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ اپنے آپ کو کسی آزمائش میں ڈالیں۔

(۲) محترمہ شیریں تاج نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ آپ کو شہر پشاور کے نصف علاقہ پر ایک اعلیٰ عہدے کی پیش کش کی گئی لیکن انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ اپنی ذمہ داریوں میں مزید اضافے کے خواہش نہیں رکھتے اور مبادا ان ذمہ داریوں کی وجہ سے وہ فرائض دینی اور عبادتِ الٰہی سے غافل ہو جائیں۔

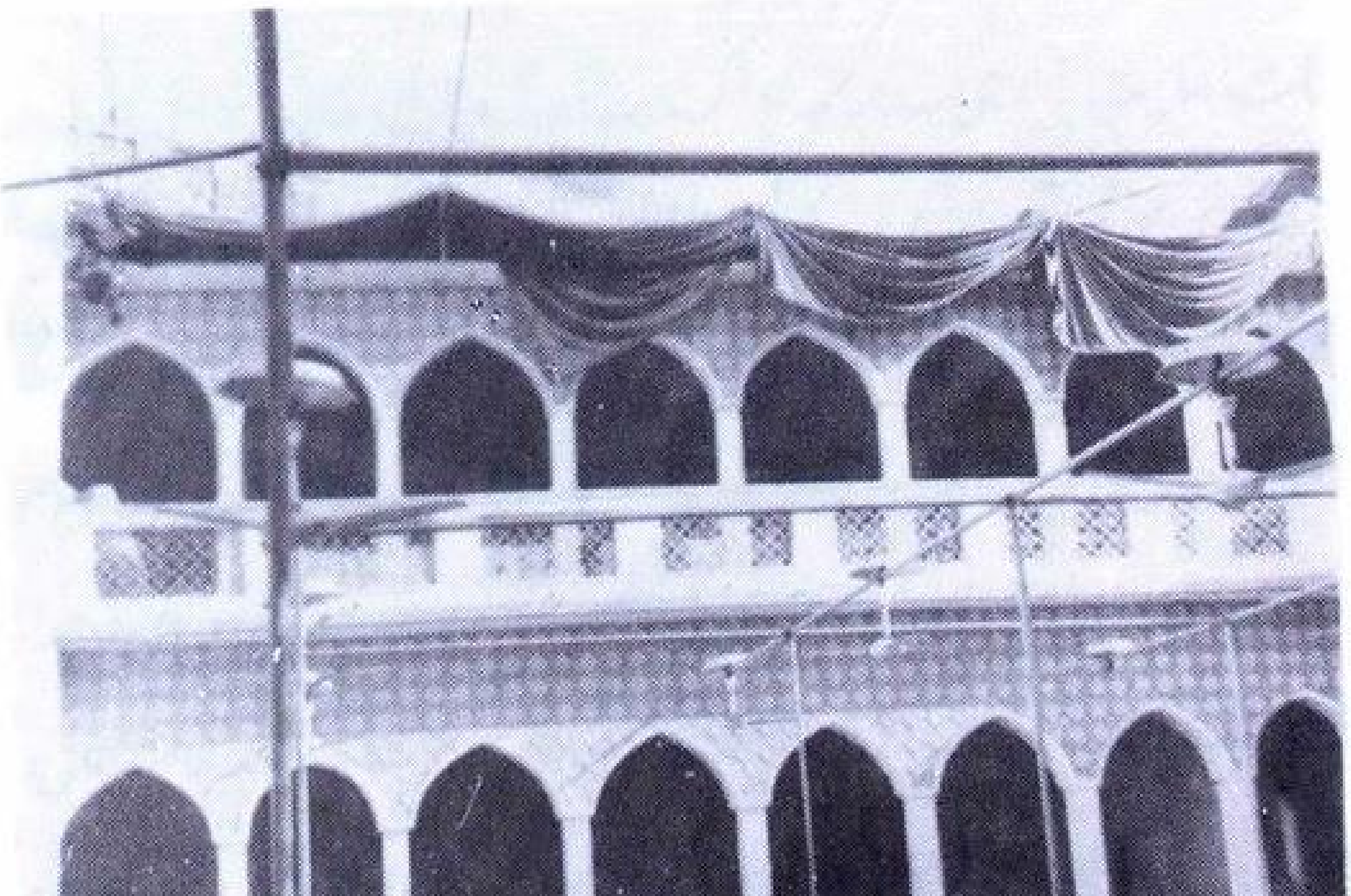
(۳) نمود و نمائش انھیں بالکل پسند نہ تھی۔ انہوں نے جب کسی کے ساتھ کوئی نیکی کی تو اس سے شکریے اور احسان مندی کے اعتراف و اظہار کی توقع رکھی اور نہ اس نیکی اور احسان کی شہرت چاہی اور نہ کسی بدلے اور معاوضے کی خواہش۔ انہوں نے غربا اور مساکین کی ہمیشہ اس راز داری کے ساتھ امداد کی کہ ایک ہاتھ سے جو کچھ دیا دوسرے ہاتھ کو خبر نہ ہوئی۔ لیکن بعض کام ان کے ایسے بھی تھے جنھیں وہ کوشش کے باوجود نہ چھپا سکے اور وہ چھپ بھی نہ سکتے تھے۔ اس قسم کے کاموں میں مسجد قاسم علی خاں کی توسیع و تعمیر بھی ہے۔ یہ حکایت محترمہ شیریں تاج کی زبانی سنئے۔

"بازار مس گراں قصہ خوانی بازار کے متصل ہے۔ یہاں ایک کچی اور چھوٹی سی مسجد قاسم علی خاں کے نام سے منسوب ہے۔ یہ مسجد علاقے کی ضرورت کے لئے بالکل ناکافی تھی۔ والد صاحب نے علاقہ کی اس ضرورت کے پیش نظر مسجد کے آس پاس کی عمارتوں اور زمینوں کو خرید کر نہایت وسیع اور مستحکم بنیادوں پہ ایک پختہ مسجد تعمیر کروا دی۔ مسجد کے ساتھ مکتب کے لئے ایک عمارت تعمیر کر کے علاقے کے بچوں کی تعلیم کا بندوبست کیا۔ پڑھے لکھے لوگوں کے لئے ایک کتب خانہ قائم کیا۔ اخراجات کے لئے ساتھ ہی آٹھ دکانیں اور ان پہ ایک بالاخانہ تعمیر کروا دیا جس کی آمدنی سے مسجد کے اخراجات پورے ہوتے ہیں۔"

(۴) اسی طرح ایک مسجد بزازلڑہ (بزازہ میں دکانوں کی قطار میں) مسجد قصہ خوانی کے نام سے مشہور ہے اس کے ساتھ تیرہ دکانیں مع ایک بالاخانہ کے تعمیر کروائیں اور



مسجد قاسم علی خاں پشاور جس کو حاجی غلام صمدانی نے وسیع اور پختہ کرایا



مسجد قاسم علی خاں کا اندرونی حصہ

انھیں وقف کر دیا۔ یہ مسجد کچی تھی۔ اس کو پختہ کرائی اور ... دیا۔ یہ پشاور کی دوسری سب سے بڑی مسجد ہے۔ پہلی بڑی مسجد وہ ہے جو جہانگیر کے جرنیل مہابت خان نے بنوائی اور اس سلسلہ میں ہزاروں روپے خرچ کیے اور لوگوں کے اصرار کے باوجود نہ تو یہ گوارا کیا کہ مسجد ان کے نام سے منسوب کی جائے اور نہ یہ پسند فرمایا کہ مدرسہ یا کتب خانہ ہی کا نام ان کے نام پر رکھا جائے یا بطور یادگار ان کے نام کی ایک تختی نصب کی جائے۔ حاجی صاحب مرحوم اور ان کے بیٹے حاجی محمد امین اسی مسجد کے احاطے میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔

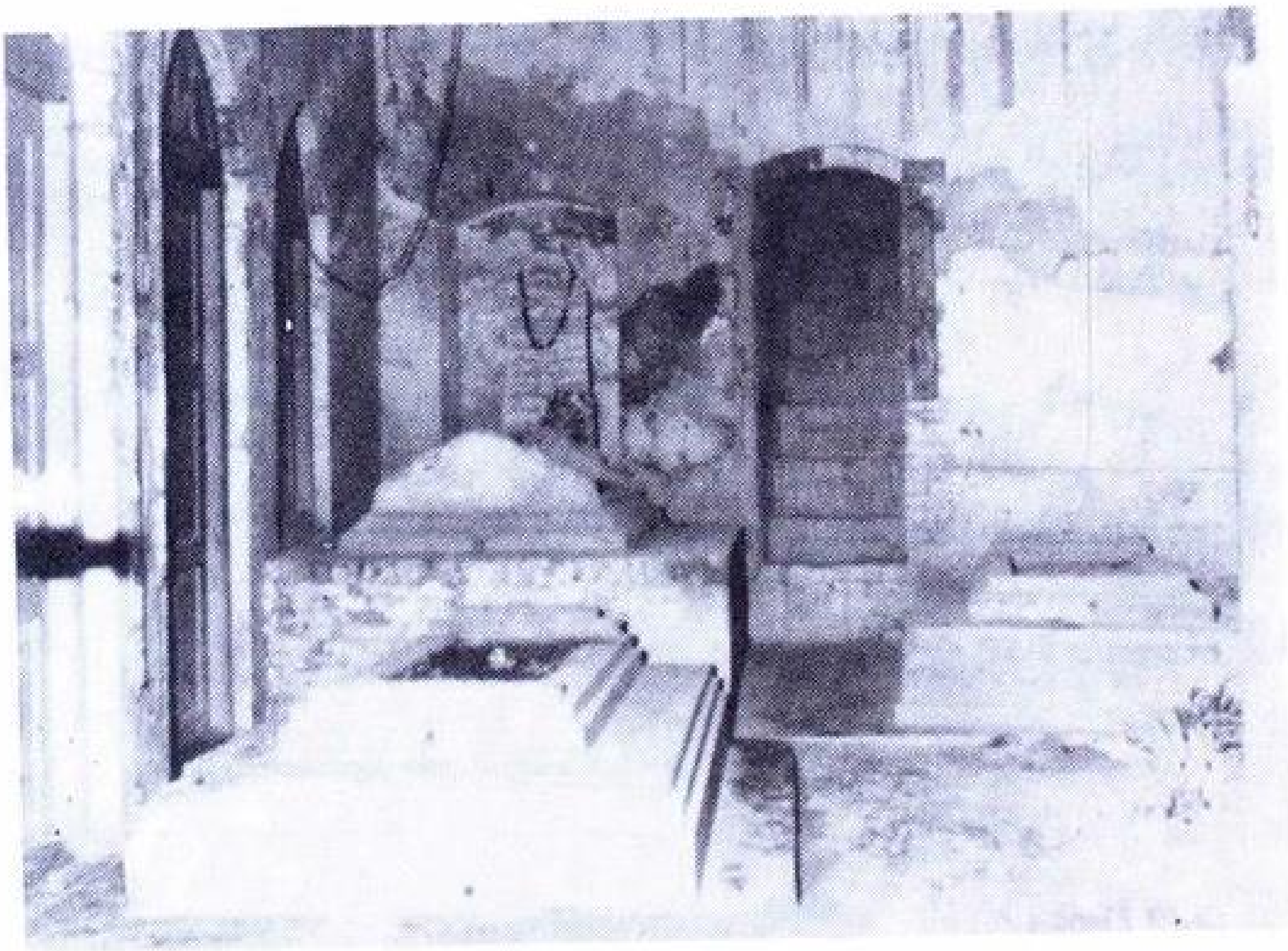
حاجی غلام صمدانی احکام خداوندی کو نہایت خلوص سے انجام دیتے تھے۔ نہ صرف پانچ وقت کی نماز کی پابندی کرتے تھے بلکہ تہجد گزار اور زاہد شب زندہ دار بھی تھے اور اوراد و وظائف کو نہایت پابندی کے ساتھ ادا کرتے تھے۔ زکوٰۃ کے علاوہ خیرات و صدقات نہایت پابندی کے ساتھ ادا کرتے تھے۔ اسی طرح انفاق فی سبیل اللہ سے وہ نہایت خوش ہوتے تھے۔ ان کی زندگی کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دنیا میں رہ کر بھی دنیا سے الگ ہی رہتے۔ انہوں نے اس حقیقت کو خوب اچھی طرح جان لیا تھا کہ دنیا اہل و عیال کی کثرت اور مال و زر کی فراوانی کا نام نہیں بلکہ دنیا خدا سے غافل ہو جانے کا نام ہے۔ اس لئے ان کی اولاد ان کی آنکھوں کا نور بنی۔ ان کی بیویاں ان کے لئے رحمت کا باعث بنیں اور پشاور پہنچنے کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد تمام عمر مال و دولت سے کھیلنے کے باوجود وہ خدا سے اور اس کے فرائض سے غافل نہیں ہوئے۔ وہ ایک مسلمان کی زندگی کا نمونہ تھے۔

حاجی غلام صمدانی مرحوم نے متعدد شادیاں کیں اور بیک وقت تین اور چار بیویاں

بھی رہیں لیکن انہوں نے کبھی شریعت سے تجاوز نہیں کیا۔ کسی بیوی کے نان، نفقہ کی ادائیگی میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ الفت کے برتاؤ میں کبھی کسی کی حق تلفی نہیں کی۔ بعض اوقات ان کی اولاد میں سے کوئی پوچھتا کہ آپ نے اتنی شادیاں کیوں کیں تو مسکراتے اور فرماتے کہ جب اسلام نے اس کو جائز قرار دیا ہے اور مسلمانوں میں اس کا رواج رہا ہے پھر میں اپنی بیویوں کے حقوق ادا کرسکتا ہوں اور ان کے ساتھ انصاف اور مساوات کا برتاؤ کر سکتا ہوں اور مجھے کثرت اولاد کی خواہش ہے اور ان کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داریوں سے بھی بحسن خوبی عہدہ برآ ہو سکتا ہوں تو پھر کون سی چیز مانع ہے کہ میں شادی نہ کروں۔

بیویوں کے معاملے میں وہ نہایت خوش نصیب واقع ہوتے تھے۔ ان کی تمام بیویاں نیک سیرت، سلیقہ شعار، اطاعت گزار و فرمانبردار اور ان کی جاں نثار خدمت گزار تھیں۔ ان کی بیویوں کی یہ آرزو تھی کہ ان کا اپنے شوہر کی موجودگی میں انتقال ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا ایسی سُنی کہ ان کی تمام بیویاں ان کی زندگی ہی میں اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ الحمدللہ تمام بیویوں سے نیک اور صالح اولاد پیدا ہوئی۔

- ان کی پہلی شادی، ان کے ماموں کی دختر فرخندہ اختر سے ہوئی تھی، ان سے ایک صاحبزادے عبداللہ جان پیدا ہوئے۔ دوسری بیوی نے عبدالعزیز اور عبدالرشید یادگار چھوڑے تھے۔ عبدالعزیز بیرسٹر ایٹ لاء تھے اور انہوں نے ایک قانون دان کی حیثیت سے کل ہند شہرت حاصل کی اور مسلمانوں کی سیاست میں بھی حصّہ لیا۔
- تیسری بیوی سے محمد امین اور عبدالرحمٰن دو صاحبزادے تھے۔ یہی عبدالرحمٰن ہیں۔ جو اس تصنیف کا موضوع ہیں۔ ان بیوی سے ایک صاحبزادی بھی تھیں جن کی شادی میاں احمد جان سے ہوئی تھی۔



مزار حاجی غلام صمدانی لوحِ مزار کے ساتھ (تاریخ وفات ۱۸ ر نومبر ۱۹۲۶ء) اس کے نیچے حاجی محمد امین (پسر حاجی غلام صمدانی) کا مزار ہے۔ یہ مزارات مسجد قاسم علی خاں کے احاطے میں ہیں۔

- چوتھی بیوی سے جو کابل کے ایک سردار ذکریا جان کی صاحبزادی تھیں ایک بیٹا اکبر جان تھا۔
- پانچویں بیوی بھی کابل کے ایک معزز اور صاحبِ ثروت خاندان کی بیٹی تھیں۔ ان سے ایک صاحبزادی اور تین صاحبزادے ہوئے، جن کے نام یہ ہیں۔ محمد حسن، محمد اسحٰق اور محمد یوسف۔ صاحبزادیوں کے نام زبیدہ بیگم اور فاطمہ بیگم تھے۔ زبیدہ بیگم بھائیوں سے بڑی تھیں۔ ان کی شادی آغا تجمل حسین کے ساتھ ہوئی۔ آغا صاحب درویش صفت انسان تھے۔
- چھٹی بیوی سے پانچ اولادیں ہوئیں۔ ان میں سے ایک صاحبزادی اور چار صاحبزادے تھے۔ صاحبزادوں کے نام، محمد نعیم، محمد عمر، محمد یحییٰ اور محمد یونس اور صاحبزادی کا نام محترمہ شیریں تاج ہے۔

تیسرا باب

عبدالرّحمٰن شہید

(اِبتدائی دوَر)

عبدالرحمٰن ۶؍دسمبر ۱۸۸۶ء کو بروز پنجشنبہ پشاور میں پیدا ہوئے۔ اردو کی ایک مثل ہے ”پوت کے پاؤں پالنے میں معلوم ہو جاتے ہیں“ یعنی اولاد کی نیک بختی یا کم نصیبی کا حال بچپن ہی میں کھل جاتا ہے۔ بلاشبہ عبدالرحمٰن کے طالع کی بلندی اور بخت کی فیروزمندی کی علامت بچپن ہی سے ہویدا تھیں۔ وہ اپنی پیدائش سے سعادت آثار اور اقبال مند تھے۔ عبدالرحمٰن کی بڑی ہمشیرہ، میاں احمد جان کی زوجہ مرحومہ فرماتی تھیں کہ ان کی ولادت سے قبل والد صاحب نے خواب دیکھا کہ ایک چمکدار ستارہ ان کی دستار پر چسپاں ہے[1]۔ انہوں نے کسی عالمِ دین سے اس خواب کی تعبیر پوچھی تو عالم

---

[1]: عبدالرحمٰن کے چھوٹے بھائی آغا محمد یوسف کا بیان ہے کہ خواب عبدالرحمٰن کی والدہ مرحومہ نے دیکھا کہ ایک چمکتا ہوا ستارہ ان کی دستار پر آگرا ہے۔ اس کی تعبیر کسی عالم دین سے والد نے پوچھی تھی۔ تعبیر وہی تھی جو اوپر بیان کی گئی ہے۔

صاحب نے کہا کہ اس خواب کی تعبیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں ایک نیک بخت بیٹے سے سرفراز فرمائے گا جو تمہارے لیئے نیک نامی اور شہرت و عزت کا باعث ہوگا۔ غلام صمدانی مرحوم کو خواب کی اس تعبیر سے نہایت خوشی ہوئی اور شاید یہی وجہ تھی کہ انہوں نے عبدالرحمٰن کی پیدائش پر انتہائی خوشی اور مسرّت کا اظہار کیا۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں مال و ثروت سے سرفراز کیا تھا۔ انہوں نے بیٹے کی پیدائش کی تقریب مسرّت نہایت شان کے ساتھ منائی۔

عبدالرحمٰن کے والد نے ان کی ولادت پر خوشی کا جو اظہار کیا تھا وہ صرف وقتی جوش نہ تھا جتنی خوشی انہوں نے بیٹے کی ولادت پر منائی اس سے کہیں جوش و مسرت کے ساتھ ناز و نعم میں ان کی پرورش اور غور و پرداخت شروع ہوئی اور سب سے بڑھ کر توجہ ان کی تعلیم و تربیت پر کی گئی۔ ابتدائی تعلیم والد صاحب کی نگرانی میں گھر پر شروع ہوئی اور جیسا کہ مسلمان خاندانوں میں دستور چلا آتا ہے۔ پہلے قرآن مجید ناظرہ پڑھایا گیا۔ ناظرہ ختم کرنے کے بعد قرآن حفظ کرنا شروع کروایا۔ عبدالرحمٰن بچپن ہی سے غیر معمولی حافظہ رکھتے تھے اس لیئے وہ بہت آسانی اور تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ بارہ برس کی عمر کو پہنچے تو وہ چودہ پاروں کے حافظ بھی ہو چکے تھے۔ لیکن انھیں دِنوں ان کے گلے میں کوئی خرابی پیدا ہوگئی جس سے آواز بیٹھ گئی اس سبب سے مجبوراً حفظ کا سلسلہ ختم کرنا پڑا۔ اگرچہ کافی علاج معالجہ کے بعد گلے کی تکلیف جاتی رہی اور آواز بھی درست ہوگئی لیکن حفظ کرنے کی صورت میں گلے پر مسلسل دباؤ پڑنے سے پھر تکلیف کے عود کر آنے اور آواز کے مستقل طور پر بیٹھ جانے کا خطرہ تھا اس لیئے حفظ کا سلسلہ ختم کرا دیا گیا۔ اس کے بعد انھیں میونسپل بورڈ

اسکول میں داخل کرا دیا گیا جہاں سے انہوں نے ۱۹۰۵ء میں ساتویں جماعت کا امتحان پاس کر لیا۔ عبدالرحمٰن اسکول کے ہونہار طالب علموں میں سے تھے۔ وہ نہایت ذہین، طباع اور سریع الفہم تھے۔ حافظہ نہایت قوی تھا۔ انھیں اردو، فارسی اور انگریزی تینوں زبانوں سے ذہنی مناسبت اور دلچسپی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ساتویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے ان کا انگریزی کا مطالعہ صرف درس تک محدود نہ رہا تھا۔ بلکہ انہوں نے تاریخ وسوانح کی بہت سی کتابیں دیکھ ڈالی تھیں۔ فارسی اور اردو میں خاصی مہارت ہو گئی تھی۔ چھوٹی عمر میں بیک وقت تین غیر مادری زبانوں کی تحصیل مشکل تھی لیکن ان کے لئے یہ مشکل مشکل نہ رہی۔ قواعد کی مشق بھی اچھی تھی۔ تاریخ وجغرافیہ سے بھی دلچسپی تھی البتہ حساب سے انھیں کوئی خاص دلچسپی نہ تھی اس لئے حساب پر انھیں ویسا عبور بھی نہ تھا جیسا کہ دوسرے مضامین پر تھا لیکن ایسا بھی نہ تھا کہ جماعت کے دوسرے طلبہ کے مقابلے میں وہ بہت کمزور ہوں وہ حساب سے اپنی عدم ذہنی مناسبت کو محنت اور توجہ سے پورا کر لیتے تھے۔

ان کے اسکول کے دوستوں میں دو نام آتے ہیں۔ اول سردار عبدالرؤف کا ہے۔ انہوں نے علی گڑھ میں تعلیم مکمل کی۔ یہ نواب سر اسلم خان کے پوتے تھے۔ نواب صاحب کی انگریز بڑی عزت کرتے تھے۔ جب ۱۸۹۲ء میں امیر عبدالرحمٰن خان والی کابل اور انگریزوں کے درمیان سرحد کا معاہدہ ہوا جو معاہدہ ڈیورنڈ لائن کے نام سے مشہور ہے تو اس معاہدے پر انگریزوں کی طرف سے نواب سر اسلم خان کے بھی دستخط ہیں۔ ۱۹۱۱ء کے دہلی دربار میں جب سب راجوں اور مہاراجوں نے شاہ جارج پنجم کا کھڑے ہو کر استقبال کیا تو نواب صاحب کو بیٹھے رہنے کی اجازت تھی۔ سردار عبدالرؤف کی

شادی عبدالرحمن کی بڑی بہن فاطمہ بیگم سے ہوئی تھی۔ ان کا دوسرا دوست ایک ہندو پرمانند تھا جو خاصا پڑھا لکھا اور علم دوست تھا۔

تعلیم سے کمال درجہ کی دلچسپی کے ساتھ وہ کھیل کود کے بھی شوقین تھے فٹ بال اور کرکٹ کے وہ بہت عمدہ کھلاڑی تھے اور کسی ٹیم میں ان کا شامل ہونا کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔ انہوں نے کھیلوں کے کئی معرکہ آرا مقابلوں میں حصہ لیا اور ہمیشہ اپنی ٹیم کے لئے کامیابی اور فتح مندی کا موجب بنے ۱۹۰۴ء میں ایک ٹورنامنٹ میں پشاور بورڈ اسکول اور کوہاٹ بورڈ اسکول کی کرکٹ ٹیموں کا مقابلہ تھا۔ اس مقابلے میں عبدالرحمن نے نہایت عمدہ کھیل کا مظاہرہ کیا۔ میچ کی آخری اننگ میں ایسا اتفاق ہوا کہ کوہاٹ کی ٹیم کے چھ کھلاڑی ابھی باقی تھے اور جیتنے کے لئے صرف پانچ رنز کی ضرورت تھی۔ اس نازک موقع پر عبدالرحمن کو بولنگ کے لئے مقرر کیا گیا۔ عبدالرحمن نے ایسی شاندار بولنگ کی کہ چھ بالوں میں ان کے چھیوں کھلاڑی آؤٹ کر دیئے۔ ان کی اس شاندار بولنگ پر نہ صرف ان کے ساتھیوں نے واہ وا کی بلکہ مخالف ٹیم کے کھلاڑی بھی عش عش کر اٹھے۔

کرکٹ اور فٹ بال کے علاوہ انھیں دوسرے کھیلوں سے بھی دلچسپی تھی۔ انھیں گھڑسواری کا بہت شوق تھا اور ان کا یہ شوق جنون کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ اصطبل میں سواری کے لئے کئی گھوڑے موجود تھے جن پر وہ وقتاً فوقتاً سواری کرتے تھے۔ یہ ایک خطرناک شوق تھا۔ ان کے اس شوق سے ان کے والد بھی خوف زدہ تھے۔

ایک مرتبہ عبدالرحمن کے والد کے ایک دوست ان سے ملنے آئے۔ باہر ان

کا گھوڑا کھڑا ہوا تھا۔ عبدالرحمٰن کو موقع مل گیا وہ اس پر سوار ہو کر چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد ملازم کو گھوڑے کا خیال آیا تو معلوم ہوا کہ عبدالرحمٰن لے گئے ہیں۔ ملازم ان کی تلاش میں نکلا۔ دیکھا کہ عبدالرحمٰن گھوڑے کو سرپٹ بھگاتے ہوئے لا رہے ہیں اور گھوڑا ان کے قابو سے باہر ہو چکا ہے۔ گھوڑا قریب آیا تو ملازم کو دیکھ کر ایک دم رُک گیا۔ عبدالرحمٰن کا توازن تو پہلے ہی بگڑ چکا تھا۔ گھوڑے کے ایک دم رُک جانے سے زمین پر گر گئے اور سر میں ایسی چوٹ آئی کہ بے ہوش ہو گئے۔ اصطبل میں ان کے جانے اور گھوڑے پر سوار ہونے پر پابندی، ان پر متعدد بار گھوڑے سے گرنے اور خطرات سے دوچار ہونے کے بعد عائد کی گئی تھی۔

عبدالرحمٰن اپنے بزرگوں کی بہت عزت کرتے تھے۔ والدین کے نہایت فرمانبردار اور خدمت گزار فرزند تھے۔ اساتذہ کے انتہائی اطاعت شعار تھے۔ ان کی عزت اور احترام میں کبھی کوتاہی نہ کرتے تھے۔ ملازموں کے ساتھ ان کا برتاؤ مشفقانہ ہوتا تھا۔ ان کے ساتھ ہمیشہ نرمی سے پیش آتے تھے۔ ان کے لئے کبھی کوئی سخت یا خلافِ تہذیب لفظ ان کی زبان سے نہیں نکلا۔ عبدالرحمٰن کو اس بات سے بہت نفرت تھی کہ کوئی شخص معقول رویہ اور مہذب گفتگو اختیار کرنے کی بجائے کوئی غلط طریقہ اختیار کرے۔

عبدالرحمٰن کی سیرت اسلام کی تعلیمات کی آئینہ دار تھی۔ وہ اپنے ملازموں کے کاموں میں ہاتھ بٹاتے۔ کام میں ان کا دل بڑھاتے اور ان کی حوصلہ افزائی کے لئے انھیں انعام بھی دیتے تھے۔

وہ اپنے کمزور ساتھیوں کے لئے سپر تھے۔ وہ ہمیشہ کمزور اور کمی لوگوں

کے مقابلے میں تنہا شخص کا ساتھی بننا پسند کرتے۔ کئی آدمیوں کے مقابلے میں تنہا شخص کی ہمت افزائی کرتے۔ مقابلے کے لئے اس کا دل بڑھاتے اگر وہ جیت جاتا تو خوشی سے پھولے نہ سماتے۔ ایک مرتبہ ان کے ایک دوست محمد اکبر خاں پھلور کے قلعے میں اپنے چند ہمراہیوں سے لڑ پڑے۔ جھگڑا بڑھا تو اکبر خاں نے اکیلے کئی آدمیوں کی اچھی طرح نصیحت کر دی۔ عبدالرحمٰن کو اس واقعے کی اطلاع ملی اور اکبر خاں کی بہادری کا حال معلوم ہوا تو بہت خوش ہوئے اور اکبر خاں کو ایک کلاہ اور ایک لنگی ان کی بہادری کے انعام کے طور پر بھیجی۔

عبدالرحمٰن بچپن میں شریر بھی تھے۔ ان کی شرارتیں بھی ان کی بہادری کے کھیلوں میں یا جسمانی قوت کے اظہار کی شکل میں ظاہر ہوتی تھیں۔ مثلاً چارپائیوں کو درمیان میں ڈال لیا ہے اور ان کے اوپر سے چھلانگ لگا رہے ہیں۔ دیوار یا درخت پر چڑھ گئے ہیں اور کود رہے ہیں۔

انگریز دشمنی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور جوں جوں ان کی عمر بڑھتی گئی۔ انگریز دشمنی میں اضافہ ہوتا گیا۔ اور مسلمانوں کو کہیں اور کسی طرح بھی انگریزوں کی طرف سے تکلیف پہنچتی تو انگریزوں سے نفرت میں اضافہ ہو جاتا۔ وہ جب تک پشاور میں رہے صبح کو گھوڑے گاڑی میں سیر کے لئے جاتے تھے۔ لیکن انہوں نے یہ کبھی گوارا نہ کیا کہ کسی انگریز کو راستہ دینے کے لئے اپنی گاڑی کو روک لیں یا سڑک سے نیچے اتار لیں۔ عام، علمی، معاشرتی، تہذیبی معاملات میں وہ انگریزوں کی برتری تسلیم کرنے کے لئے بالکل تیار نہ تھے۔ انگریز حکام کو ان کے دائرہ کار کے باہر عام ملکی اور سماجی زندگی میں وہ اہمیت نہ دیتے تھے۔

فی الحقیقت یہ ان کی انگریز دشمنی کے مختلف مظاہر تھے جو قومی اخلاق اور تہذیب کے سانچوں میں ڈھل گئے تھے۔

عبدالرحمٰن نہایت راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ اسلامی احکام پر وہ حتی الامکان عمل کرتے تھے نماز کے پابند تھے۔ اور قرآن حکیم کی تلاوت بڑی پابندی کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ دل کے بے حد سخی اور ہمدرد و غم گسار تھے۔ وہ کسی شخص کو تکلیف میں نہ دیکھ سکتے تھے۔ اور اپنی قیمتی سے قیمتی چیز بھی، اگر اس سے اس کی تکلیف دور ہو سکتی ہو تو، دے دینے میں دریغ نہ کرتے تھے۔ ایک مرتبہ سفر سے گھر واپس آ رہے تھے۔ ایک اسٹیشن پر ایک فقیر کو سردی میں ٹھٹھرتے دیکھا تو اپنا قیمتی بنارسی لحاف اس پر ڈال دیا اور نرم و گداز تکیہ اس کے سر کے نیچے رکھ کر نہایت اطمینان سے گھر چلے آئے۔ اس کے بعد اس واقعہ کا کبھی کسی سے ذکر نہ کیا۔

اللہ تعالیٰ نے انھیں نیکی و شرافت، غیرت و خودداری اور ادب و اخلاق، تہذیب و سیرت کے بہترین محاسن کے ساتھ انسانی ہمدردی و غم گساری، سیر چشمی اور ذہن و فکر کے بہت سے خصائص سے بہرہ ور کیا تھا۔ نیز جسمانی صحت، قدو قامت اور حسن و جمال کی خوبیوں سے متصف فرمایا تھا جیسا ان کی تصویر سے ظاہر ہوتا ہے۔ وہ دراز قد، گورے رنگ، مضبوط ہاتھ پاؤں اور کسرتی بدن کے نہایت وجیہہ و شکیل نوجوان تھے۔ روشن آنکھیں ان کی ذہانت کی غماز تھیں تو کشادہ پیشانی طالع کی بلندی پر دلالت کرتی تھی۔ ان کی کھڑی اور ستواں ناک ان کے نسب و خاندان کی علویت اور نجابت کی شاہد تھیں۔ چہرہ لمبائی لیے اور لبوں پر ہمیشہ تبسم رقصاں رہتا تھا۔ وہ نہایت دھیمے لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر گفتگو کرنے کے عادی تھے۔ ان کے لہجے میں بڑا رکھ رکھاؤ ہوتا تھا محبت

اور شفقت آمیز گفتگو میں ان کے منہ سے پھول جھڑتے معلوم ہوتے تھے لیکن اگر کبھی غصہ آگیا تو معلوم ہوتا کہ گویا آتش فشاں کا دہانہ کھل گیا ہے اور منہ سے الفاظ کی جگہ شعلے نکل رہے ہیں۔

عبدالرحمٰن نہایت نفاست پسند شخص تھے۔ ہمیشہ بہترین لباس زیب تن کرتے۔ بوٹ اعلیٰ درجہ کا ہوتا۔ انھیں گھڑی کا بہت شوق تھا۔ ہمیشہ ہاتھ کی بڑی گھڑی استعمال کرتے تھے یہ گویا ان کا شوق تھا۔ وہ گھوڑے گاڑی کی سواری کے بڑے رسیا تھے۔ وہ گاڑی خود چلاتے تھے اور نہایت شان و تمکنت کے ساتھ بیٹھتے تھے۔

وہ بچپن سے ہمیشہ بہت سویرے اُٹھنے کے عادی تھے۔ سب سے پہلے خود ہی اسٹو پر دودھ گرم کر کے پیتے اور پھر سیر کو نکل جاتے، خواہ کوئی موسم ہو، ان کے معمول میں کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔

چوتھا باب

علی گڑھ کا زمانۂ طالب علمی

علی گڑھ کالج میں الفرض کے نام سے ایک انجمن طلبہ نے قائم کی تھی۔ اس انجمن کا مقصد یہ تھا کہ ان طلبہ کی مدد کی جائے جو علی گڑھ کی تعلیمی زندگی کے اخراجات کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے یا دوران تعلیم میں ایسے حالات پیش آجاتے تھے جن کی وجہ سے ان کا تعلیم جاری رکھنا مشکل ہو جاتا تھا۔ ابتدا میں طلبہ صرف اپنے وسائل سے کام لے کر مستحق طلبہ کی امداد کر دیتے تھے لیکن بعد میں ضروریات کی کثرت اور طلبہ کے محدود وسائل نے اس کے دائرے کو وسیع کرنے پر مجبور کر دیا تو اس میں کالج کے اساتذہ اور دیگر مقامی حضرات شریک ہو گئے۔ یہ سلسلہ نہایت کامیابی سے آگے بڑھا اور بہت سے مستحق طلبہ کو اس سے فائدہ پہنچا اور حالات نے اس کی ضرورت اور اہمیت کو اور زیادہ بڑھا دیا تو اس کو ملک گیر پیمانہ پر چلایا گیا۔ اس سلسلے میں اخبارات میں اپیلیں شائع کی گئیں اور اہل ملک کو غریب اور نادار طلبہ کی امداد کی اس تحریک میں حصّہ لینے کی ترغیب دی گئی۔ اور کالج کی طرف سے اس سلسلے میں ملک کے مختلف علاقوں اور شہروں میں وفود بھیجے گئے۔

اس انجمن الفرض کا ایک وفد ۱۹۰۵ء میں پشاور گیا۔ اس وفد کے سیکرٹری

خان محمد حسین خاں (علیگ) تھے۔ حاجی غلام صمدانی مرحوم سے ان کی واقفیت پہلے سے تھی۔ چنانچہ خاں صاحب ان سے ملے اور انجمن القرض کے مقاصد اور روشنی کی غرض وغایت سے روشناس کرایا۔ حاجی غلام صمدانی نے ایک معقول رقم ان کی خدمت میں نادار طلبہ کے لئے پیش کی۔ خان محمد حسین خاں نے حاجی غلام صمدانی سے کہا کہ وہ اپنے چھوٹے بیٹے عبدالرحمٰن کو تعلیم کے لئے علی گڑھ بھیج دیں۔ انہوں نے وعدہ بھی کرلیا کہ وہ عبدالرحمٰن کو علی گڑھ میں تعلیم کے لئے بھیج دیں گے۔ عبدالرحمٰن نے اس سال ساتویں جماعت کا امتحان دیا تھا اور تعطیلات گزارنے اس وقت پشاور سے باہر اپنے بڑے بھائی کے پاس گئے ہوئے تھے۔ عبدالرحمٰن پشاور واپس آئے تو انھیں القرض کے وفد کے آنے، حاجی صاحب سے خان محمد حسین خاں کی گفتگو اور ان کے وعدے کا حال معلوم ہوا۔ عبدالرحمٰن پہلے ہی علی گڑھ کی شہرت کا حال سن چکے تھے۔ چنانچہ ایک طرف تو علی گڑھ سے خط وکتابت شروع کی گئی اور دوسری طرف سفر کی تیاری کا سروسامان کیا گیا اور تمام معاملات وانتظامات کی طرف سے مطمئن ہوکر عبدالرحمٰن کو علی گڑھ روانہ کر دیا گیا۔ مارچ ۱۹۰۶ء میں انھیں آٹھویں جماعت میں داخلہ مل گیا۔

علی گڑھ اپنے زمانے میں مسلمانوں کی تعلیم کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ ہندوستان اور بیرون ملک میں اس کی تعلیم کی شہرت تھی۔ عام مسلمانوں اور علی گڑھ کے اساتذہ اور طلبہ میں ایک جوش پایا جاتا ہے۔ علی گڑھ کے تعلیمی ماحول اور اساتذہ کی رہنمائی اور طالب علم ساتھیوں سے دن رات کی ملاقاتوں اور علمی وتعلیمی موضوعات پر گفتگوؤں اور مباحثوں نے عبدالرحمٰن کی فطری ذہانت اور علمی وتعلیمی شوق اور صلاحیتوں کو ابھارا اور انھیں

جلا بخشی۔ علی گڑھ کے تعلیمی ماحول نے ان کی فطری ذہانت اور طلب علم کے حق میں سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ طلبہ سے گفتگوئیں اور مباحثے ان کے سمند شوق کے لئے تازیانہ بنے اور ان کی محنت اور توجہ نے انھیں بہت جلد علی گڑھ کے ذہین طلبہ کی فہرست میں شامل کر دیا۔ نصابی کتب کے علاوہ انھیں تاریخ و سوانح سے خاص دلچسپی تھی۔ نپولین سے انھیں عشق کی حد تک محبت تھی اور اس کی زندگی کا بار بار مطالعہ کر چکے تھے۔ اس کی زندگی کے جلی و خفی گوشے ان کی نظر میں سما گئے تھے۔ اور اس کی گفتگوئیں اور تقریریں انھیں ازبر ہو گئی تھیں جنھیں وہ اپنی گفتگو میں روانی کے ساتھ پیش کرتے تھے اور اپنے اس امتیاز کی بنا پر حافظ نپولین کے نام سے مشہور تھے۔ نپولین کے جذبے اور اس کے کارناموں سے وہ بہت متاثر تھے۔ ان کا خیال تھا کہ قوم کا بیڑا پار لگانے کے لئے نپولین جیسے جوشِ عمل کی ضرورت ہے۔ نپولین کے مطالعہ نے ان کے دل کو جوش و جذبات و خدمتِ ملی سے بھر دیا تھا۔ انگریزی اور فارسی ادب سے بھی انھیں خاص دلچسپی تھی۔ شاہنامہ فردوسی اور دیوانِ حافظ کے مطالعہ کے وہ بہت شوقین تھے لیکن ان کے علمی شوق میں خاصا اضافہ ہوا جب وہ کالج میں داخل ہوئے۔

ان کے شوقِ علمی و تعلیمی سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ محض کتابی کیڑے بن کر رہ گئے تھے بلاشبہ وہ مطالعے کے شوقین تھے لیکن وہ اپنی زندگی میں اور علیگڑھ کے زمانہ طالب علمی میں ایک عملی انسان رہے۔ ان کی علی گڑھ کی زندگی، شوقِ علمی و تعلیمی، کھیل اور تفریحات کے شغف و انہماک اور زندہ دلی کا ایک حسین مرقع ہے۔ انھوں نے کھیلوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ہمیشہ اپنی مخالف ٹیموں کے کھلاڑیوں پر اپنے بہترین کھیل کی دھاک بٹھا دی۔

علی گڑھ کے زمانہ طالب علمی میں ان کا مطالعہ صرف کتب نصاب یا عام ادبی تاریخی اور سوانحی کتب تک محدود نہیں رہا بلکہ اخبار بینی کا شوق بھی پیدا ہوا اور ملک کی سیاسی تحریکات اور عالمی سیاسی صورت حال سے بھی واقفیت بڑھی مصر اس وقت ترکی کی خلافت کا زیرِ نگیں تھا اگرچہ ترکی خلیفہ کے اثرات واحکام برائے نام تھے اور ترکی فی الحقیقت انگریزوں کی عمل داری بن چکا تھا۔ ترکی میں مجلس اتحاد وترقی کی بنا پڑ چکی تھی۔ انقلاب کے بیج بوئے جا رہے تھے۔ انگریزوں نے ترکی کو کمزور کرنے اور اس کے مقبوضات پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنا لیا تھا۔ ۱۸۷۸ء میں ترکی مقبوضات میں رومانیہ، بلغاریہ اور سرویا کی تین آزاد بلقانی ریاستیں قائم کی جا چکی تھیں۔ اب ترکی عملداری میں مصر سے اس کے علاقہ سوڈان کو الگ کرنے کے منصوبے پر عمل ہو رہا تھا۔ عبدالرحمٰن کا دل شروع ہی سے اسلامی غیرت اور ملی ہمدردی سے پُر تھا۔ یہ حالات ان کی بے چینی کا مزید باعث تھے۔ ان حالات نے ترکوں سے محبت اور انگریزوں سے ان کی نفرت کے جذبات کو اور بھڑکا دیا تھا۔

مولانا حسرت موہانی اس زمانے (۱۹۰۳ء تا ۱۹۰۸ء) میں علی گڑھ سے اردوئے معلی نکال رہے تھے۔ علی گڑھ کالج کے ارباب اختیار کو ان کے سیاسی اور انقلابی خیالات سے سخت اختلاف تھا۔ وہ کسی طرح برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ یہ نوائے انقلاب علی گڑھ سے بلند ہو اور طلبہ کو متاثر کرے۔ کالج کے ارباب بست وکشاد نے اپنے آقایان ولی نعمت کے اشارے پر یا جذبہ وفاداری سے سرشار ہو کر اس آواز کو دبانے کی انتہائی کوشش کی۔ ان کے پریس مین (Press Man) کو بھگوا دیا۔ طلبہ کو اس کے مطالعے سے روک دیا۔ طلبہ کے لئے اس کی

خریداری پر پابندی لگادی۔ طلباء پر حسرت موہانی سے ملنے جلنے پر پابندی عاید کی گئی۔ جو طالب علم ان جرائم میں سے کسی جرم کا مرتکب ہوتا اسے سرزنش کی جاتی۔ سزا دی جاتی۔ اس کے باوجود کالج کے ارباب اختیار اور انگریزوں کے بہی خواہوں نے طلبہ کو اردوئے معلی کی تحریک اور اس کی دعوتِ انقلاب سے بچانے کی ہر چند کوشش کی لیکن طلبہ اس سے متاثر ہو رہے تھے اور حسرت کے انقلابی خیالات جنگل کی آگ کی طرح پھیل رہے تھے۔ ۱۹۰۸ء میں جب انگریزوں نے مصر میں اپنی نئی پالیسی کے مطابق ریشہ دوانیاں شروع کیں تو حسرت کا لہجہ اور بھی تیکھا ہو گیا، اور اپریل ۱۹۰۸ء میں اردوئے معلی کا جو شمارہ شائع ہوا[۱] اس میں ایک مضمون "مصر میں انگریزوں کی پالیسی" کے عنوان سے تھا۔ مضمون نگار کے نام کے بجائے "ایک طالب علم" درج تھا۔ بقول عبدالقوی دسنوی کے اس کا لب و لہجہ اگرچہ زیادہ سخت نہ تھا لیکن حکومت کی نظرِ عتاب اس پر پڑنے لگی۔ حسرت موہانی سے مضمون نگار کا نام پوچھا گیا۔ انہوں نے نام بتانے سے انکار کر دیا کہ یہ آدابِ صحافت کے منافی تھا۔ انھیں قید و بند اور پریس کی ضبطی کی دھمکیاں دی گئیں۔ لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ چنانچہ ۲۳ جون ۱۹۰۸ء کو انھیں زیرِ دفعہ ۱۲۴ (الف) یعنی بغاوت کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا اور دو سال قید بامشقت کے ساتھ پانچ سو روپے جرمانے کی سزا سنائی گئی۔ حسرت کے پاس دل گردہ تھا کہ قید بامشقت کی سختیاں جھیل جائیں۔ لیکن روپیہ کہاں تھا کہ جرمانہ ادا کریں۔ حکومت کو ان کے حالات سے غرض نہ تھی اس نے حسرت کا نادر کتب خانہ کوڑیوں کے مول نیلام کر دیا اور جو کچھ ملا اسے جرمانے میں وصول کر لیا۔

[۱] دیکھو ضمیمہ نمبر ۶

اس مضمون کی اشاعت سے یہ تو حسرت بیچارے پر بیتی۔ کالج کے بہی خواہاں حکومت نے اپنی وفاداری کا ثبوت پیش کرنا بھی ضروری سمجھا۔ چنانچہ تفتیش شروع ہوئی کہ وہ طالب علم کون ہے جس نے انگریزوں کے خلاف یہ مضمون لکھا ہے۔ اصل مضمون لکھنے والے کا صحیح پتہ نہ چل سکا لیکن شبہ ان کے ایک ہم خیال اور انقلابی ساتھی فضل امین پر کیا گیا اور اگرچہ اس بات کا کوئی ثبوت نہ تھا کہ مضمون واقعی انھوں نے لکھا ہے لیکن کالج کے نزدیک سب سے اہم مسئلہ برٹش استعمار کو اپنی وفاداری کا ثبوت پیش کرنا تھا۔ اس لئے فضل امین کو یک لخت کالج سے نکال دیا گیا۔ لیکن صرف فضل امین کے اخراج سے ارباب کالج اپنے انگریز آقاؤں کو کامل خوشی نہیں بخش سکتے تھے۔ اظہار وفاداری کو مزید دلکش اور دلآویز بنانے کے لئے کچھ اور رنگ و روغن کی بھی ضرورت تھی۔ چنانچہ عبدالرحمٰن کو فضل امین کے ساتھ دوستی کا مجرم ٹھہرایا گیا اور دونوں دردمندان اسلام اور غمخواران ملت کو ایک ساتھ کالج سے رخصت کر دیا گیا انہیں اس امر کی اجازت بھی نہیں دی گئی کہ وہ ہوسٹل چھوڑیں اور اپنے طور پر رہائش کا انتظام کریں اور امتحان میں شریک ہو جائیں اس وقت وہ میٹرک میں پڑھ رہے تھے۔

عبدالرحمٰن کے خیالات اور ان کی سیرت کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس زمانے کے علی گڑھ کالج کے ماحول پر ایک نظر ڈالی جائے۔ عبدالرحمٰن مارچ ۱۹۰۶ء میں علی گڑھ پہنچے اور وسط ۱۹۰۸ء میں ان کا اخراج عمل میں آیا گویا کہ تقریباً سوا دو برس وہ علی گڑھ میں رہے۔

کالج میں یورپین اسٹاف خاص کر پرنسپل سیاہ و سفید کا مالک بنا ہوا تھا۔

کالج کے اساتذہ اور ٹرسٹیوں کا ایک بڑا طبقہ ان کے اقتدار اور کالج کے تمام اور ہمہ قسم کے معاملات میں ان کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ کو پسند نہ کرتا تھا۔ خود سید احمد خاں بھی آخر زمانے میں انگریزوں کو شک کی نظر سے دیکھنے لگے تھے۔ ان کی ناپسندیدگی کا برملا اظہار سرسید کی زندگی میں کیا جا چکا تھا! ور ان کی وفات کے بعد بھی یہ اختلاف اور بڑھ گیا۔ کچھ لوگ سرسید کے مقرر کردہ تعلیمی لائحہ عمل اور سیاسی پالیسی کو مقدس سمجھ کر ان سے انحراف کرنا قومی معصیت خیال کرتے تھے۔ کچھ بہی خواہانِ ملت تبدیلی اور اقتدار کو دوسرے ہاتھوں میں منتقلی اور یورپین اسٹاف کے عمل دخل کے حدود متعین کر دینے کے خواہاں تھے۔ ان دونوں گروہوں میں کشمکش جاری تھی اور جوں جوں ملک کی سیاسی آب وہوا بدلتی جارہی تھی اس کے اثرات کالج کی فضا پر پڑ رہے تھے۔ انھیں اثرات کا نتیجہ عبدالرحمٰن کے دورانِ تعلیم یعنی ۱۹۰۷ء میں علی گڑھ کے طلبا کی ہڑتال ہے جسے خود علی گڑھ کالج سے تعلق رکھنے والوں نے "ہولناک ہڑتال" کہا ہے۔ اس کے علاوہ دوسری تحریکات و واقعات ہیں جنھوں نے نوجوان عبدالرحمٰن کو متاثر کیا ہے۔ بلکہ نوجوان عبدالرحمٰن ان واقعات و تحریکات میں شامل رہے ہے۔

فروری ۱۹۰۷ء میں علی گڑھ میں جو ہولناک ہڑتال ہوئی۔ اس کے پس منظر میں چودھری خلیق الزماں مرحوم نے ان خیالات کا اظہار کیا ہے کہ علی گڑھ کے ٹرسٹی دو مشتعل گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک گروہ کی قیادت صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کے ہاتھ میں تھی۔ اور دوسرے گروہ کے خیالات کی رہنمائی مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کر رہے تھے۔ مسئلہ مابہ النزاع ٹرسٹیوں کا انتخاب تھا۔ نئی پود جس کی قیادت علی برادران کر رہے تھے شاکی تھی کہ مقامی ٹرسٹی دوسروں کو آنے کا موقع نہیں

دیتے اور صرف اپنے دوست اور احباب کی خاطر تواضع کرتے ہیں۔ اندرونی کشمکش نے جذبات کی رد دوسری طرف موڑ دی اور رفتہ رفتہ نئی پود بنگالیوں کی انقلابی تحریک سے متاثر ہوئی جس کا رُخ انگریز پروفیسروں کے خلاف پڑ گیا کیونکہ اس وقت تک طلبہ میں یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ انگریز پروفیسر اپنے آپ کو استاد کی بجائے گورنمنٹ کا ایجنٹ سمجھتے ہیں اور لڑکوں کی آزادیٔ خیال و فکر پر بے جا قیود عائد کرتے رہتے ہیں۔ نواب محسن الملک ان دونوں گروہوں کے بیچ میں ایک حدِ فاصل بنے ہوئے تھے جن سے بعض اوقات دونوں کو شکایت پیدا ہو جاتی تھی۔

فروری ۱۹۰۷ء کی نمائش میں طلبہ اور پولیس میں جھگڑا ہو گیا اس میں راجہ غلام حسین اور ان کے کئی دوستوں نے حصہ لیا۔ راجہ غلام حسین علی گڑھ کے نہایت ہونہار طالبعلم تھے اور بعد کو مولانا محمد علی کے ہفتہ وار اخبار کامریڈ کے نائب مدیر ہوئے۔ جب پولیس نے رپورٹ کی تو پرنسپل نے راجہ غلام حسین، عبدالرحمٰن بجنوری اور پانچ دوسرے لڑکوں کے کالج سے اخراج کا حکم دے دیا۔ اس حکم پر طلبہ میں ہیجان پیدا ہو گیا اور تمام طلبہ نے بیک وقت ہڑتال کر دی۔ کالج کے تمام ٹرسٹی فوراً علی گڑھ پہنچے۔ جلسہ کیا اور نواب وقار الملک کی صدارت میں ایک کمیٹی قائم کی جس کے تین ممبروں میں ایک ممبر مولانا محمد علی بھی تھے۔ ٹرسٹیوں سے گفتگو کے بعد پرنسپل نے اور لڑکوں کو تو معاف کر دیا مگر راجہ غلام حسین اور عبدالرحمٰن بجنوری کے خلاف اخراج کا حکم واپس نہیں لیا۔ اس میں اس زمانے کے پرنسپل مسٹر آرچ بولڈ کا ہاتھ تھا۔

یہاں عبدالرحمٰن کے زمانہ طالب علمی علی گڑھ کے دو امور کی طرف توجہ دلائی گئی

ہے۔ ایک تو طلبہ کے عام رجحان و انقلاب فکر اور احساس کے بارے میں، دوسرے نمائش میں طلبہ کے پولیس سے تصادم کے واقعہ کی طرف۔ عبدالرحمٰن کا ان دونوں امور سے براہِ راست اور بلا واسطہ تعلق تھا۔ ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت اور اوائل عمری سے جہاں اسلام سے محبت اور ملت کی بہی خواہی کی ان کے دل و دماغ میں میں تخم ریزی کی گئی تھی وہاں حریت طلبی اور انگریز سے شدید نفرت کے جراثیم بھی ان کی اسلامی اور حریت پسند فطرت میں شامل تھے۔ وہ ابتدائی تعلیم و تربیت اور اپنے خیالات سے دوسروں کو متاثر تو کر سکتے تھے۔ لیکن ان کے خلاف اثرات قبول کرنا ان کی حریت پسند فطرت کے خلاف تھا۔ اس لئے انہوں نے وہاں جو اثرات قبول کئے وہ وہ تھے جو بنگال کے انقلابیوں اور دہشت پسندوں کے علی گڑھ پر پڑ رہے تھے اور اور چودھری خلیق الزماں نے جن کی طرف اشارہ کیا ہے اور جہاں تک دوسرے واقعہ کا تعلق ہے تو اس میں عبدالرحمٰن خود اپنے دوسرے ساتھیوں کے شانہ بشانہ پولیس کی بربریت کے خلاف دادِ شجاعت دے رہے تھے۔ لیکن نمائش کے ہنگامے اور بہت سے طلبا کی بھیڑ میں ان کی شخصیت چھپی رہی اور کالج سے نکالے جانے والے طلبا کی فہرست میں ان کا نام شامل ہونے سے رہ گیا۔

مثل مشہور ہے کہ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ آخر عبدالرحمٰن کو ان کی حریت پسندی اور افضل امین کی دوستی میں مجرم گردان کر نکالا گیا۔

علی گڑھ کا تعلیمی دور وسط ۱۹۰۸ء میں ختم ہو گیا۔ لیکن علی گڑھ کے زمانۂ قیام میں متعدد ایسے واقعات پیش آئے جن کے تذکرے کے بغیر یہ باب مکمل نہیں ہو سکتا۔ ان واقعات سے عبدالرحمٰن کی سیرت کے بعض پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔

یہ واقعات آپ اپنی شرح ہیں اس لئے بغیر کسی تبصرے کے پیش کئے جا رہے ہیں۔

• ایک مرتبہ کالج کے میدان میں بہت سے طلبہ کھیل رہے تھے اور سینکڑوں طلبہ، اساتذہ اور دیگر حضرات بھی اِدھر اُدھر موجود تھے۔ اتنے میں ایک مست بھینسا کہیں سے آنکلا۔ تمام لڑکے اسے دیکھ کر اِدھر اُدھر بھاگ گئے لیکن ایسے موقع پر عبدالرحمٰن کا میدان سے ہٹ جانا ان کی فطرت کے خلاف تھا، چنانچہ عبدالرحمٰن راہ فرار اختیار کرنے کی بجائے اس کے مقابلے میں ڈٹ گئے۔ طلبہ اور اساتذہ انھیں بھاگ جانے کا مشورہ دیتے رہے لیکن وہ اس سے ذرا بھی خوف زدہ نہ ہوئے۔ بھینسے نے جوں ہی ان پر حملہ کیا انہوں نے مضبوطی کے ساتھ اس کے سینگوں کو پکڑ لیا اور اس زور سے انھیں موڑا کہ بھاری بھرکم بھینسا دھڑام سے فرشِ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

• ایک لڑکے نے اپنے والد کی شہ زوری کے بارے میں بیان کیا کہ وہ چارپائی کے چاروں کونوں پر چار آدمیوں کو بٹھا کر چارپائی اٹھا لیتے تھے۔ عبدالرحمٰن کے سمند غیرت پر گویا یہ ایک تازیانہ تھا۔ انہوں نے اسی وقت ایک چارپائی کے چاروں کونوں پہ دو دو طلبہ کو بٹھا دیا اور بیک جنبش چارپائی کو اپنے ہاتھوں پر اٹھا لیا اور کہا اگر دنیا کے حافظے میں اس قسم کی بھی ایک مثال رہ جائے تو کیا بُرا ہے۔

• کالج کی چھٹیوں کے زمانے میں ایک دفعہ جب کہ وہ پشاور آئے ہوئے تھے۔ ان کے والد ماجد لوہے کی ایک چھ من وزنی نجوری ایک گھر سے دوسرے

گھر میں لے جانے کے لئے مزدوروں کے انتظار میں تھے۔ عبدالرحمٰن کو معلوم ہوا تو انہوں نے وہ تجوری نہایت آسانی کے ساتھ اپنی پیٹھ پر لادی اور دوسرے مکان میں پہنچادی۔

علی گڑھ کی زندگی میں ان کی سیرت اور فکر کے لئے بڑی آزمائشیں تھیں۔ وہ اگر چاہتے تو علی گڑھ کے ایک طبقے کی مخصوص روایات کے سانچے میں ڈھل جاتے اور برٹش استعمار کی کاسہ لیسی کی زندگی اختیار کر کے بہت سے دنیوی فوائد حاصل کر سکتے تھے۔ وہ سول سروس، پولیس یا سی آئی ڈی میں بڑی آسانی کے ساتھ کوئی عہدہ حاصل کر سکتے تھے۔ کسی مسلمان ریاست میں اہل کار بن سکتے تھے۔ انگریز حکومت کی انتظامیہ کا پرزہ بن سکتے تھے اور خواہ دین و ملت کا اس میں کوئی فائدہ نہ ہوتا لیکن اپنی اور اپنے خاندان کے لئے انگریز کے در دولت سے اپنے لئے خطاب و انعام حاصل کر سکتے تھے لیکن ان کے دل میں نہ انگریز سے خطاب و انعام حاصل کرنے کی آرزو تھی نہ کسی ریاست کی چاکری کی خواہش تھی اور نہ انگریزی انتظامیہ کا پرزہ بن کر وہ اپنی صلاحیتوں کو اپنے اہل وطن کے خلاف استعمال کرنا گوارا کر سکتے تھے۔ انہوں نے اپنے لئے جو راہ اختیار کی وہ ملت کی خدمت گزاری کی راہ تھی اور جو عہد کیا تھا وہ خدا کی چاکری کا عہد تھا۔ وہ زندگی بھر اسی راہ پر چلتے رہے اور زندگی کی آخری سانسوں تک خدا کی چاکری میں مصروف رہے۔ البتہ علی گڑھ کے زمانہ قیام سے انہوں نے فائدہ پورا پورا اٹھایا اور سب سے بڑا فائدہ وہی تھا جو ایک تعلیمی ماحول کا تھا۔ یہاں ان کی معلومات میں بھی اضافہ ہوا۔ ان کے خیالات میں بھی وسعت ہوئی۔ ملک اور بیرونِ ملک کے سیاسی حالات پر ان کی نظر

بہت گہری ہوگئی۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع ہوگیا۔ مختلف تحریکوں اور جماعتوں کے بارے میں غور و خوض کا موقع ملا اور یہ تمام چیزیں ان کی آئندہ زندگی میں بہت کام آئیں۔

ان کے قلب میں مسلمانوں کی خدمت گزاری کی جو شمع روشن تھی وہ آخر تک فروزاں رہی اور ان کی طبیعت کے فطری عجز و انکسار نے اس شمع کی لو کو کچھ اور دلکش اور نظر فریب بنا دیا تھا۔ ان کی سیرت کے اس رُخ کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جاسکتا ہے کہ علی گڑھ کے زمانہ قیام میں ایک دفعہ جب کہ وہ گھر آئے ہوئے تھے۔ علی الصبح سیر کے لئے گھر سے نکلے انھوں نے دیکھا کہ ایک بوڑھا اور ایک لڑکا راستے میں کھڑے ہیں۔ عبدالرحمن ان کے پاس سے گزر گئے تو انھوں نے سنا کہ لڑکا بوڑھے سے کہہ رہا تھا کہ یہ آدمی انگریزی پڑھا لکھا معلوم ہوتا ہے۔ آپ تار کیوں نہیں پڑھوا لیتے۔ پھر بوڑھے شخص کی آواز آئی۔ بیٹا یہ انگریزی پڑھے نوجوان بہت مغرور ہوتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ میں اسے کہوں اور یہ انکار کر دے۔ عبدالرحمن معاملے کو فوراً سمجھ گئے۔ واپس لوٹے اور کہا، انگریزی پڑھے لکھے شاید ایسے ہی ہوتے ہیں جیسا کہ آپ فرماتے ہیں لیکن سب کے بارے میں تو یہ بات نہیں کہی جاسکتی۔ لائیے میں آپ کا تار پڑھ دوں۔ بوڑھے نے تار ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔ انہوں نے اسے بتا دیا کہ تار میں کیا لکھا ہے اور سیر کو چلے گئے۔

علی گڑھ سے عبدالرحمن کو جس طرح نکالا گیا تھا اور تعلیمی سال کے جس موقع پر نکالا گیا تھا اس کے پیش نظر ممکن تھا کہ وہ مشتعل ہو جاتے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس واقعے سے نہ تو وہ مشتعل ہوئے اور نہ اس کی وجہ سے وہاں کے اساتذہ یا دوسرے حضرات کے بارے میں ان کی زبان سے کبھی کوئی بات ایسی نکلی جو ان کے اشتعال یا ان کی ناراضگی پر دلالت کرتی ہو۔ انہوں نے جب بھی علی گڑھ کے ارباب بست و کشاد اور اساتذہ کا تذکرہ کیا زبان نے ان کی دلی محبت اور تعلق کی ترجمانی کی

علی گڑھ کی یادوں کا بہترین سرمایہ اور علی گڑھ کے زمانۂ قیام کا حاصل وہ متعدد حضرات تھے جو ان کے ہم جماعت تھے یا بعض ان سے سینیئر اور بعض ان سے جونیئر تھے لیکن دوستی کے رشتے میں ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لئے وابستہ ہو گئے تھے۔ ان میں سے فضل امین کا نام تو آچکا ہے۔ دیگر حضرات ہیں، سید حسین، شعیب قریشی، عبدالرحمٰن بجنوری، عبدالرحمٰن صدیقی، عبدالرحمٰن گورکھپوری، راجہ غلام حسین وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کی دوستی اور تعلقات کی خوشگوار یادیں عبدالرحمٰن کی زندگی کا سرمایہ تھیں۔ یہ تمام حضرات اپنے کمالات اور خصائص کی بنا پر ادب، سیاست، صحافت تعلیم وغیرہ کے مختلف میدانوں میں بہت مشہور ہوئے۔ خصوصاً علی گڑھ کے "چار عبدالرحمٰن" علی گڑھ کے ماحول میں بہت مشہور ہوئے! اور جب کبھی علی گڑھ کی خدمات و امتیاز کا تذکرہ آتا ہے تو چار عبدالرحمٰن کی مثال دی جاتی تھی۔

پانچواں باب

علی گڑھ کے بعد

علی گڑھ سے نکلنے کے بعد عبدالرحمٰن کے لئے سب سے اہم مسئلہ تعلیم کو جاری رکھنے کا تھا اور اس کے لئے کوئی فوری انتظام کرنا تھا۔ دوستوں اور مخلصوں سے مشورہ کے بعد عبدالرحمٰن اور فضل ابین نے شملہ کے لئے رختِ سفر باندھا اور وہاں کے ایک یورپین اسکول میں داخلہ لے لیا۔ زمانہ کا کتنا عجیب اتفاق ہے کہ اپنوں نے اور پھر انھوں نے جو ملت کی بھی خواہی اور غم خواری کے مدعی تھے۔ انگریزوں کے خلاف مضمون لکھنے کے ناکردہ گناہ شبہ کی پاداش میں اپنے کالج سے نکالا اور جن کی خوشنودی کی خاطر تعزیر کی یہ تلوار چلائی گئی تھی تعلیم کا انتظام ہوا تو انھیں کی درس گاہ میں شاید اس اسکول کی تعلیمی حالت اور اسکولوں سے بہتر تھی۔

شملہ میں تعلیم کے دوران میں عبدالرحمٰن کو دل کی بیماری لاحق ہوگئی۔ انھوں نے دہلی، کلکتہ، لاہور وغیرہ کے مشہور ڈاکٹروں اور نامی اطباء سے علاج کروایا لیکن مرض میں کوئی افاقہ نہ ہوا۔ ان دنوں قادیان کے حکیم نورالدین کی طبابت و حذاقت کا بڑا شہرہ تھا اپنے علاج کے لئے قادیان جانا پڑا اور ایک مدت کے قیام کے باوجود ان کے علاج سے بھی کوئی فائدہ نہ ہوا تو واپس چلے آئے۔ ان کے والد ماجد ان کا قادیان جانا پسند نہ کرتے تھے لیکن علاج کی مجبوری کی بنا پہ اجازت دے دی تھی۔ لیکن جب کوئی افاقہ نہ ہوا اور مدتِ قیام

بھی توقع سے زیادہ بڑھ گئی تو انھیں تشویش ہوگئی۔ بعض دیگر حضرات نے بھی انھیں توجہ دلائی تھی کہ قادیان میں عبدالرحمٰن کا قیام مناسب نہیں ہے۔ والد ماجد نے ایک خط میں اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ عبدالرحمٰن نے والد کو جو خط لکھا اس میں ان کی تشویش کو صاف اور واضح الفاظ میں دور کر دیا اور صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ وہ قادیان کے قیام کی مدت کو مختصر کر کے گھر واپس آ گئے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ شکاریوں نے دام نہ بچھایا ہوگا اور دانے کی ترغیب نہ دی ہوگی۔ لیکن عبدالرحمٰن نے اپنے عمل سے یہ ثابت کر دیا کہ اس طائر بلند پرواز کو نہ کسی دام میں پھنسایا جا سکتا ہے اور نہ کسی قسم کی ترغیب اس کو صراطِ مستقیم سے ہٹا سکتی ہے۔

قادیان سے واپسی کے بعد عبدالرحمٰن نے ڈاکٹر مختار احمد انصاری کا دہلی میں علاج شروع کیا۔ لیکن ابھی خدا کی طرف سے ان کی صحت کا حکم نہ ہوا تھا اس لئے ڈاکٹر انصاری کے علاج سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ لیکن دسمبر ۱۹۱۲ء میں جب طبی مشن کے ساتھ ترکوں کے زخموں پر مرہم لگانے کے لئے انہوں نے ترکی کے لئے رختِ سفر باندھا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے مرض کا دفعیہ کر دیا۔ اس کے بعد انہیں کبھی دل کی شکایت پیدا نہیں ہوئی اور خدا کے فضل و کرم سے کئی سال پرانی بیماری سے جس نے انھیں خاصا پریشان کر دیا تھا، ہمیشہ کے لئے نجات مل گئی۔

بمبئی کے سفر کے موقع پر ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ ایک روز ایک جگہ لوگوں کا مجمع دیکھا تو یہ بھی کھڑے ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ یورپ کا کوئی پہلوان ہے اور کشتی ہو رہی ہے۔ دل میں نہ جانے کیا سمائی کہ اس سے کشتی مانگ لی۔ پہلوان یہ سمجھا کہ واقعی کوئی پہلوان ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہاں جوانی کے جوش اور جسم کی طاقت کے سوا فن اور مہارت نامی کوئی چیز نہ تھی اس نے اٹھا کر دور پھینک دیا۔ یہ اٹھے اور اس سے پھر گتھ گئے۔ اس نے پھر ایک پٹخنی دی۔ یہ گرتے ہی تیزی

کے ساتھ پھر اُٹھے اور اس سے چمٹ گئے۔ اس طرح کئی بار ہوا۔ یہ غیر فنکارانہ کشتی لوگوں کی دلچسپی کا خوب موضوع بنی۔ تماشائی خوب لطف اندوز ہوئے۔ آخر اس پہلوان نے ان سے پوچھا کہ تم کون ہو، کہاں سے آئے ہو، تم نے کشتی کا فن کسی سے سیکھا بھی ہے یا نہیں؟ عبدالرحمن نے کہا۔ نہ تو میں پہلوان ہوں، نہ میں نے کشتی کا فن کسی سے سیکھا ہے۔ میں تو کالج کا ایک طالب علم ہوں۔ ادھر سے گزر رہا تھا۔ تمہیں دیکھا، سوچا کہ دو دو ہاتھ ہو جائیں، اکھاڑے میں اُتر آیا۔ اب تم ہمارے سامنے ہو۔ پہلوان یہ سن کر خجل ہوا پھر مسکرایا اور کہا، کاش میں تمہاری اس فن میں مدد کر سکتا۔ تم میں ایک اچھا پہلوان بننے کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں۔ عبدالرحمن نے کپڑے پہنے اور اپنی راہ لی۔

چھٹا باب

علی گڑھ میں دوبارہ داخلہ

۴ راگست ۱۹۰۸ء کو مولانا حسرت موہانی کو دفعہ ۱۲۴ الف یعنی بغاوت کے جرم میں دو سال کی قید بامشقت کی سزا سنائی گئی لیکن عبدالرحمٰن اور فضل امین کو بھی علی گڑھ کالج سے تین سال کے لئے نکال دیا گیا۔ حسرت کو دو سال کے بعد رہائی مل گئی لیکن عبدالرحمٰن کو تین سال سے پہلے کالج میں دوبارہ داخلے کی اجازت نہیں ملی۔ انگریزوں کے لئے علی گڑھ کی یہ وہ چاہت تھی جو ماں کی چاہت سے زیادہ تھی۔ غرضیکہ تین سال کے بعد ۱۹۱۱ء میں عبدالرحمٰن دوبارہ علی گڑھ میں داخل ہو گئے۔ لیکن اس مدت میں علی گڑھ میں ایک بڑا انقلاب آچکا تھا۔

لیکن تین سال کے بعد عبدالرحمٰن دوبارہ کالج میں داخل ہوتے تو اسلامی ممالک میں انگریزوں کی ریشہ دوانیوں کے تذکرے علی گڑھ کے ایک ایک طالب علم کی زبان پر تھے۔ پہلے کالج کے ارباب اختیار کی سخت گیری سے لڑکے سہمے ہوتے رہتے تھے۔ لیکن ملک میں جو ذہنی وفکری انقلاب آیا تھا اور انگریزوں کی پالیسی کے خلاف جو ہیجان عوام میں اور خصوصاً مسلمانوں میں پیدا ہو چکا تھا اس نے علی گڑھ کے طلبہ کو بھی انگریزوں کے خلاف صف آرا کر دیا تھا اور اب طلبہ کے جوش کے سامنے کالج کے ارباب بست وکشاد دبجے اور سہمے ہوئے نظر

آتے تھے۔

اس انقلابی حالت کی وضاحت کے لئے ضروری ہے کہ چند سطروں میں اس کے پس منظر پر روشنی ڈالی جائے۔ ۱۸۷۸ء میں روس نے ترکی کے ساتھ جنگ کر کے، رومانیہ، بلغاریہ اور سردیا کی تین آزاد بلقانی ریاستیں قائم کرالی تھیں اور ترکی کے دو صوبوں بوسنیا اور ہرزے گودینا (Herzegovina) پر آسٹریا نے اپنا حق جتا دیا تھا اور ۱۹۰۸ء میں اس نے ان دونوں صوبوں پر قبضہ بھی کر لیا لیکن سلطان عبدالحمید جو ترکی کا مطلق العنان بادشاہ تھا آسٹریا کے اس غاصبانہ قبضے کے خلاف کچھ بھی نہ کر سکا تھا۔ نوجوان ترکوں نے اسے معزول کر کے اس کی جگہ محمد خامس کو سلطان اور خلیفۃ المسلمین بنا کر تخت پر بٹھایا۔ اگرچہ اسلامی اقدار کی بحالی اور کھوتے ہوئے مقبوضات کی واپسی کا مداوا نہ ہو سکا لیکن ترکی کے اس انقلاب اور نوجوان ترکوں اور ان کی انجمن "اتحاد و ترقی" کے اثر درسوخ کو انگریزوں نے اپنے لئے خطرے کی علامت سمجھا۔ انگریزوں نے اٹلی کو شہ دی۔ اٹلی نے ۱۹۱۱ء میں ترکی کے مقبوضہ طرابلس الغرب پر حملہ کر دیا۔ ترکوں کے پاس کوئی بڑا بحری بیڑہ نہ تھا کہ وہ اپنی سلطنت کے اس دور دراز خطے کی مدافعت کے لئے فوج بھیج سکتے۔ ترکوں نے مصر کی راہ سے فوجیں بھیجنے کی کوشش کی لیکن مصر عملی طور پر انگریزوں کے اقتدار میں جا چکا تھا۔ مصر پر ترکی کی سیادت محض کاغذ پر تسلیم کی جا رہی تھی۔ لارڈ کچنر نے جو اس زمانے میں مصر میں انگریزوں کے ہائی کمشنر تھے ترکی فوج کو مصر سے گزرنے کی اجازت نہیں دی حالانکہ مصر اس وقت تک ترکوں کی قانونی سیادت میں تھا۔ ترکی فوج میں صرف انور پاشا، مصطفیٰ کمال اور چند دیگر فوجی افسر بھیس بدل کر مصر کی راہ سے طرابلس پہنچنے میں کامیاب ہو سکے۔ طرابلس میں شیخ سنوسی کے مریدوں نے ان ترک افسروں کے زیرِ قیادت اٹلی کی فوجوں کا مقابلہ کیا لیکن ترکی سے

انھیں فوجی کمک نہ پہنچ سکتی تھی۔ اس لئے اٹلی کی فوجیں طرابلس اور بعض دیگر ساحلی مقاموں پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوگئیں اور ترکی حکومت دول یورپ کے دباؤ کے تحت طرابلس کو خود مختاری دینے پر آمادہ ہوگئی لیکن اس حکم کو انور بے اور شیخ سنوسی نے ماننے سے انکار کر دیا۔ اس صورتِ حال نے معاملات کو اور نازک بنا دیا۔ اس موقع پر انگریزوں نے ایک اور شاطرانہ چال چلی۔ انور پاشا، مصطفےٰ کمال اور شیخ سنوسی کے مریدین نے خلیفہ ترکی کے اعلانِ خود مختاری طرابلس سن کر ہتھیار نہ رکھے تھے کہ سر دیا، بلغاریہ اور یونان کی بلقانی ریاستوں نے اکتوبر ۱۹۱۲ء میں انگریزوں کی شہ پاکر ترکی کے ساتھ جنگ شروع کر دی مجبوراً ترک فوجی افسروں کو جو طرابلس میں اٹلی کے ساتھ نبرد آزما تھے محاذِ جنگ چھوڑ کر ترکی واپس آنا پڑا۔ اس دوران میں بلقانی ریاستوں کی فوجوں نے تھریس (یورپین ترکی) کے بیشتر حصے پر قبضہ جما لیا اور ان کی فوجیں قسطنطنیہ کے دروازے پر شتلجہ کے مقام پر پہنچ گئیں۔ شتلجہ کے مقام پر ترکوں نے حملہ آوروں کو شکست دی۔ اس شکست کے بعد تینوں ریاستیں فتح کئے ہوئے علاقے کی تقسیم کے سوال پر آپس میں لڑ پڑیں اس جنگ میں رومانیہ نے بھی حصہ لیا۔ غازی انور بے نے موقع غنیمت جان کے ادرنہ پر حملہ کر دیا اور جو رقبہ ہاتھ سے نکل گیا تھا اسے دوبارہ حاصل کر لیا۔ یہ حال دیکھ کر دول عظمیٰ نے مداخلت کی اور ترکی اور اس پر حملہ آوروں کے درمیان صلح کرا دی۔ اس صلح نامہ کی رو سے البانیہ کی ریاست قائم کر دی گئی جس کے متعلق بلقانی ریاستوں میں جھگڑا ہوا تھا۔

۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۲ء تک کا زمانہ ایشیائی مسلمانوں کی تاریخ میں نہایت پُر آشوب زمانہ تھا۔ اس دور میں انگریزوں کی ایما پر آسٹریا نے ترکی کے دو صوبوں پر قبضہ کر لیا۔ ۱۹۱۱ء میں اٹلی کا طرابلس الغرب پر حملہ، ترکی کے خلیفہ پر دباؤ ڈال کر

طرابلس کی خود مختاری کا اعلان کر والینا اور اس کے خلاف ردعمل کی صورت میں اکتوبر ۱۹۱۲ء میں بلقانی ریاستوں سے ترکی پر حملہ کروالینا وہ واقعات ہیں جنہوں نے مسلمانوں کے دل ودماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا مسلمانوں میں غم وغصہ نقطۂ عروج پر پہنچ چکا تھا۔ انگریزوں کے خلاف غم وغصہ کا اظہار برملا کیا جا رہا تھا۔ علی گڑھ میں کوئی ایسا شخص نہ تھا جو طلبہ کے اشتعال کو ٹھنڈا کرے اور انگریزوں کے خلاف ان کے غصے کو فرو کرے۔ علی گڑھ کے طلبہ کے جوش وجذبات پر قابو پانے کی تمام تدبیریں بے کار ہو گئیں۔ ملک کے طول وعرض میں شہر شہر اور قریہ قریہ ترکوں کی حمایت میں جلسے ہو رہے تھے اور ان میں انگریزوں کے خلاف غم وغصہ کا اظہار کیا جاتا تھا۔ خطیب اپنی شعلہ نوائی سے عوام کے دلوں کو گرماتے اور شعرا اپنی نظموں سے سامعین کے دلوں میں شعلے بھر دیتے۔ ہر طرف بلقان بلقان چل بلقان چل کا شور تھا۔ اس زمانے کے اسلامی جذبات کے بارے میں علامہ سلیمان ندوی لکھتے ہیں :۔

"طرابلس کی اس لڑائی کے زمانے میں اسلامی جوش وخروش ایک طوفان خیز سمندر بن گیا تھا۔ ابھی طرابلس الغرب کی یہ مصیبت ختم بھی نہیں ہونے پائی تھی کہ اکتوبر ۱۹۱۲ء میں یورپ کی بڑی سلطنتوں کی شہ پا کر بلقان کی ریاستوں نے ترکی کے خلاف لڑائی کا اعلان کر دیا۔ اسلامی جذبات کا وہ سمندر جو ابھی ٹھہرنے بھی نہیں پایا تھا پھر جوش میں آیا اور مسلمانوں کے دلوں میں علانیہ آزادی اور حریت کی تحریک لہریں لینے لگی۔ اس زمانے میں اس تحریک کی رہنمائی جن لوگوں نے کی ان میں ایک نام مولانا شبلی کا بھی ہے۔ شہر آشوب اسلام کے نام پر غم وحسرت سے بھری ایک ایسی نظم لکھی جس نے اس حادثہ

پر مسلمانوں کے دامن کو آنسوؤں سے تر کر دیا اور آج بھی کوئی اس کو پڑھے یا سنے گا تو اس کی آنکھوں سے اشکِ غم کے چند قطرے بے اختیار نکل آئیں گے۔"

اس نظم کے بعض اشعار یہ ہیں۔

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک
چراغِ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک

قبائے سلطنت کے گر فلک نے کر دیئے پرزے
فضائے آسمانی میں اڑیں گی دھجیاں کب تک

مراکش جا چکا، فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریضِ سخت جاں کب تک

یہ سیلابِ بلا بلقان سے جو بڑھتا آتا ہے
اسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کب تک

یہ سب ہیں رقصِ بسمل کا تماشہ دیکھنے والے
یہ سیر ان کو دکھائے گا شہیدِ نیم جاں کب تک

یہ وہ ہیں نالۂ مظلوم کی لے جن کو بھاتی ہے
یہ راگ ان کو سنائے گا یتیمِ ناتواں کب تک

کوئی پوچھے کہ اے تہذیبِ انسانی کے استاد!
یہ ظلم آرائیاں تا کے یہ حشر انگیزیاں کب تک

بہ مانا ہم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے
ہماری گردنوں پہ ہوگا اس کا امتحاں کب تک
کہاں تک لوگے ہم سے انتقام فتح ایوبی
دکھاؤگے ہمیں جنگِ صلیبی کا سماں کب تک
سمجھ کر یہ کہ دھندلے سے نشانِ رفتگاں ہیں ہم
مٹاؤگے ہمارا اس طرح نام و نشاں کب تک
زوالِ دولتِ عثمان، زوالِ شرع و ملت ہے
عزیزو! فکرِ فرزند و عیال و خاناں کب تک
خدارا تم یہ سمجھے بھی کہ یہ طیاریاں کیا ہیں
نہ سمجھے اب تو پھر سمجھوگے تم یہ چیستاں کب تک
پرستارانِ خاکِ کعبہ دنیا سے اگر اٹھے
تو پھر یہ احترامِ سجدہ گاہ قدسیاں کب تک
جو گونج اٹھے گا عالم شورِ ناقوسِ کلیسا سے
تو پھر یہ نغمۂ توحید گلبانگِ اذاں کب تک
بکھرتے جاتے ہیں شیرازۂ اوراقِ اسلامی
چلیں گی تند بادِ کفر کی یہ آندھیاں کب تک
کہیں اڑ کر نہ دامانِ حرم کو بھی یہ چھو آئیں
غبارِ کفر کی یہ بے محابہ شوخیاں کب تک

حرم کی سمت بھی صید افگنوں کی جب نگاہیں ہیں
تو پھر سمجھو کہ مرغان حرم کے آشیاں کب تک
جو ہجرت کر کے بھی جائیں تو شبلی اب کہاں جائیں
کہ اب امن و امان شام و نجد و قیرواں کب تک

مولانا شبلی نے یہ نظم لکھنؤ کے ایک عام جلسے میں جو ترکی کی فراہمی چندہ کے لئے ہوا تھا، پڑھی تھی۔ مولانا خود بھی روئے اور دوسروں کو بھی رلایا۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ بھی لکھنؤ کی کوئی ماتمی مجلس ہے۔

مسلمانوں نے بارہا حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ مسلمانوں کے احساس کا لحاظ کرے اور بلقانی ریاستوں کی سرکاری امداد سے باز رہے۔ مگر اس کا جواب ہمیشہ یاس انگیز ملا۔ مولانا شبلی نے اس پر بھی ایک نظم میں اپنے دل کے پھپھولے پھوڑے اور مسلمانوں کے جذبات کو جھنجھوڑا اور انہیں بھی خون کے آنسو رُلائے۔ مولانا کی یہ نظم کلیات شبلی (اردو) میں موجود ہے۔ چونکہ اس نظم کا تعلق ہمارے موضوع سے براہِ راست ہے اس لئے اسے من و عن نقل کیا جاتا ہے۔

ہستی مسلم کی رہائی

جنگِ بلقان میں وزرائے برطانیہ کے دعویٰ اسلام دوستی کی تردید۔

وہ کہتے ہیں کہ ہم کو پاس ہے احساس مسلم کا
مگر اس کا اثر جو کچھ ہے بس ہندستان تک ہے

مگر ہم کیا کریں اس کو کہ عالم گیری ملت

عراق و فارس و نجد و حجاز و قیرواں تک ہے

منافق ہے جو کہتا ہے کہ "میں ترکی سے یکسو ہوں"

یہ وہ الفاظ ہیں جن کی جہانگیری زباں تک ہے

ہمارا جوش اسلامی انہیں باور نہیں کرتا !

یہ انداز تغافل جلوہ گاہ امتحاں تک ہے

پڑا سوتا ہے کوئی گنبد خضرائے یثرب میں

کہ جس کا بندۂ فرماں زمیں سے آسماں تک ہے

کوئی جا کر یہ کہہ دے ہم گنہگاروں کی جانب سے

کہ اب مسلم کی ہستی تیرے الطاف نہاں تک ہے

ہاشمی فرید آبادی شاعر کی حیثیت سے مشہور نہیں ہوئے۔ ان کا اصل میدان تاریخ تھا۔ لیکن اس زمانے میں ان کی ایک نظم "چل بلقان چل" جو دسمبر ۱۹۱۲ء میں لکھنؤ میں شائع ہوئی تھی، نہایت مشہور ہوئی اور ہندوستان کے بچے بچے کی زبان پر چڑھی ہوئی تھی۔ اس کا پہلا بند یہ ہے۔

دعوئ ایمان رکھتا ہے تو اے مومن نکل

شمہ غیرت کا ہے اگر باقی تو چل بلقان چل

اس نظم کا ایک شعر ہے : ؎

وہ بھی کیا مرنا کہ خود فطرت تجھے دیدے جواب

لطف مرنے کا اگر چاہے تو چل بلقان چل

علامہ شبلی اور ہاشمی فرید آبادی کے علاوہ علامہ اقبال، حسرت موہانی، ظفر علی خاں اور بہت سے دوسرے شعرا کی نظموں، مولانا ابوالکلام آزاد کی تقریروں اور الہلال، کامریڈ اور زمیندار کے پُرزور مقالوں نے پورے ہندوستان میں ایک آگ سی لگادی تھی۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی نے دارالعلوم دیوبند کو بند کر دیا، طلبہ کے وفود کو ترکوں کے لئے چندہ کی فراہمی کے لئے اطراف مُلک میں بھیجا۔ بڑھاپے اور بیماری کے باوجود خود بھی خاموش نہیں بیٹھے، جلوسوں کا اہتمام کیا، تقریریں کیں، دوسرے مسلمان رہنماؤں سے ملے۔ ترکی کی مدد کی راہیں ڈھونڈیں۔ انگریزوں کی حکومت پر کاری ضرب لگانے کے طریقے سوچے اور مواقع تلاش کئے۔ ابوالکلام سے کہا۔ "حدی را تیز ترمی خواں چو ذوق نغمہ کمیابی"، محمد علی سے کہا۔" ترکوں کی جنگ میں عملی امداد کے لئے کچھ کرو"۔ ڈاکٹر انصاری سے کہا:" اسلام کے زخموں کو تمہاری چارہ گری کی ضرورت ہے"۔ مسلمانوں سے کہا، " اگر آج بھی تم نے اپنے زرومال سے اسلام کی مدد نہ کی تو پھر کس دن کا انتظار ہے۔ ہندوؤں سے کہا، مسلمانوں کو تمہارے اعلانِ ہمدردی اور اخلاقی امداد کی ضرورت ہے۔ انہوں نے ہندوستان میں بسنے والے ہر طبقے کو مخاطب کیا اور اسے مسلمانوں کی عملی، مالی، اخلاقی امداد اور استعمار پر کاری ضرب لگانے کی دعوت دی۔

جنگِ طرابلس و بلقان کے نتیجے میں یہ حالات تھے جو ہندوستان میں پیدا ہو چکے تھے۔ عبدالرحمٰن پشاوری بھی ان حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتے تھے جب کہ وہ ڈاکٹر انصاری سے اس سے قبل متعارف ہو چکے تھے اور ان کے زیرِ علاج بھی رہ چکے تھے۔ مولوی سیف الرحمٰن صدر مدرس، مدرسہ فتح پوری دہلی جو حضرت شیخ الہند

کے شاگرد تھے، دہلی میں مقیم تھے۔ اور عبدالرحمٰن ان سے واقف تھے، مولانا عبید اللہ سندھی اس وقت دہلی منتقل ہو چکے تھے اور نظارۃ المعارف القرآنیہ قائم کر کے دیوبند اور علی گڑھ کے طلبہ کی سیاسی تربیت میں مصروف تھے اور مدرسہ فتح پوری کو مرکز بنایا تھا۔ عبدالرحمٰن اپنے ہم وطن مولوی سیف الرحمٰن کے ذریعہ ان سے واقف ہو کر حضرت شیخ الہند کی تحریک سے متعارف و وابستہ ہو چکے تھے۔ اُدھر علی گڑھ کی فضا بھی بدل چکی تھی۔ جو حالت یونیورسٹی سے باہر تھی اب یونیورسٹی کے اندر بھی حالت اس سے زیادہ مختلف نہ تھی۔ حسرت موہانی اگرچہ جیل سے رہا ہو چکے تھے لیکن اب وہ ادب و صحافت کے بجائے عملی سیاست میں داخل ہو چکے تھے۔ اردوئے معلیٰ بند تھا اس لئے علی گڑھ میں بیٹھنے کی کوئی مجبوری نہ تھی۔ پورا ملک ان کی سیاست کی جولان گاہ بنا ہوا تھا۔ حسرت اب علی گڑھ کے طلبہ کے محبوب لیڈر تھے۔ مولانا محمد علی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خاں اپنی تقریروں کے ذریعہ ملک میں جوش و جذبات اسلامی کے شعلوں کو ہوا دے رہے تھے۔ اب وہ زمانہ لد چکا تھا جب اردوئے معلیٰ پڑھنے پر اور کالج میں اس کے داخلہ پر پابندی تھی۔ اب الہلال، کامریڈ اور زمیندار کالج میں آتے تھے اور انھیں مجمع لگا کر پڑھا جاتا تھا۔ اب کالج میں انگریزوں کے خلاف تقریریں ہوتی تھیں اور طلبہ جوق در جوق اور نہایت ذوق و شوق کے ساتھ ان میں شریک ہوتے تھے۔ لیکن کسی کی مجال نہ تھی کہ انھیں جلسوں کے انعقاد اور انگریزوں کے خلاف اور ترکی کی حمایت میں تقریریں کرنے سے روک دے۔ اب ان طلبا کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا جو کالج کے ارباب بست و کشاد کے لئے جاسوسی کرتے تھے اور انگریزوں کے مفاد یا ان کی خوشنودی کے لئے کام کرتے تھے۔ چودھری

خلیق الزماں اس زمانے کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جب ۱۹۱۱ئہ میں اٹلی کے حملہ کی خبر کالج میں پہنچی تو لڑکوں کی زندگی میں ایک بھونچال آگیا۔ صدمہ تو اور جگہ بھی مسلمانوں کو ہوا ہوگا مگر علی گڑھ کے طلبہ میں جو جوش و خروش پیدا ہوا، اس کی کوئی نظیر نہ تھی۔ سرسید کے زمانے میں جب ترکی اور یونان کے خلاف جنگ ہوئی تو لڑکوں میں بھی بے چینی پیدا ہوئی۔ سرسید نے ایک بہت بڑا مضمون لکھا جس میں اس بات پر زور دیا کہ ترکوں سے ہمدردی مسلمانوں کو بہ حیثیت ایک مسلم حکومت کے ضرور ہے مگر وہ ترکوں کی خلافت کی وجہ سے نہیں ہے کیونکہ ان کی رائے میں کوئی غیر قریش خلافت کا مستحق نہیں ہو سکتا تھا اور ترک قریش نہیں ہیں۔ یہ حالات حاضرہ کو دیکھتے ہوئے سیاسی لیپ پوت تھی کیونکہ الائمۃ من القریش کی روایت پایۂ دار نہیں۔ علاوہ ازیں سلطان سلیم کے وقت سے کئی صدی تک عامۃ المسلمین ترکی خلافت کو جائز سمجھتے رہے تھے۔ اس طرح جب عقبہ پر سلطان عبدالحمید کے زمانے میں ترکوں اور انگریزوں کے درمیان جنگ کا خطرہ پیدا ہوا تو نواب محسن الملک نے ہندوستان کے حالات پر نظر کرتے ہوتے اس طرح کا ایک بیان شائع کر دیا مگر ان بیانوں سے انگریز کبھی مطمئن نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ وہ خود جانتے تھے کہ مسلمانوں کو ترکی خلافت سے دلی لگاؤ ہے۔ اگر ان کو یہ علم نہ ہوتا تو ۱۷۹۹ئہ میں شاہِ انگلستان کی طرف سے سلطانِ ترکی کو یہ اپیل نہ کی گئی ہوتی کہ وہ ٹیپو سلطان کو ہندوستان میں سمجھائیں

کہ نپولین کی امداد نہ کریں اور ہندوستان میں فرانسیسیوں کے مقابلے میں انگریزوں کی مدد کریں۔ بعدہ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے پھر سلطان ترکی سے استدعا کی کہ وہ مسلمانوں کو ہدایت کریں کہ غدر میں شرکت کرنے سے باز آئیں۔ جب ۱۸۷۷ء میں انگریزوں نے روس کے مقابلے میں ترکوں کی مدد کی جس سے روسی خطرہ ٹل گیا تو اس وقت خود انگریزی حکومت نے ہندوستان میں چراغاں کرایا تاکہ مسلمان خوش ہوں۔ لہٰذا طرابلس الغرب کی جنگ کے سلسلے میں یہ سمجھنا کہ انگریزوں نے کسی لاعلمی کی بناء پر اٹلی کی مدد کی، معاونت کی صحیح نہیں۔ یہ قدم جان بوجھ کر اٹھایا گیا تھا۔ جو برٹش سیاست کا نہایت احمقانہ فعل تھا۔"

"علی گڑھ کے طلبہ روز بعد نماز مغرب مسجد میں اپنے جلسے کر کے انگریزوں کے خلاف اپنے جذبات کا برملا اظہار کرنے لگے۔ اس وقت لڑکوں کی قیادت نورالدین ہاکی کپتان اور میں خود کرتا تھا۔ جس میں پرنس حمید اللہ خاں، عبدالوحید خاں کرکٹ کپتان اور تمام دوسرے طلبہ ہمارے ہمنوا تھے۔ بڑی خوشی یہ تھی کہ کامریڈ اخبار جو مولانا محمد علی نے جنوری ۱۹۱۱ء میں کلکتہ سے جاری کیا تھا وہ ہمارے جذبات اور خیالات کی بے لاگ تائید کرتا تھا۔ کامریڈ کے پرچے لوگ بھوکے رہ کر بھی خریدتے تھے تاکہ وہ مولانا محمد علی کے آتش فشاں اداریے پڑھ سکیں۔ اسی زمانے میں اخبار زمیندار بھی روزنامہ ہو گیا تھا اور لاہور سے مولانا ظفر علی خاں کی ادارت میں برٹش سیاست پر بے لاگ تنقید کرنے لگا تھا۔ مولانا ظفر علی خاں اور مولانا محمد علی دونوں علی گڑھ کے تعلیم یافتہ تھے اور طلبہ کے جوش و خروش کا پورا اندازہ کرنے کے اہل تھے۔ مزید برآں علامہ اقبال کی نظم

"فاطمہ" نے لڑکوں میں بے پناہ جگر خراشی کی۔ دوسرے سال شروع ۱۹۱۲ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کا الہلال بھی کلکتہ سے جاری ہوگیا۔ اس کے طرزِ تحریر اور علمی و معنوی صحافت کے متعلق کچھ کہنا عبث ہے۔ خود مولانا ابوالکلام آزاد کی شعلہ بیانی قال اللہ و قال الرسول کے پیرائے میں کیا کم تھی جس پر مولانا سید سلیمان ندوی کی الہلال کی ادارت میں شرکت نے سونے پر سہاگہ کا کام دیا۔ ان اخبارات نے قومی زندگی میں پہلی بار سیاسی ہیجان برپا کیا جس کے بہت دور رس نتائج ہوئے۔"



ڈاکٹر مختار احمد انصاری صدر ہندی طبی وفد بلقان (کرسی پر ٹیک لگائے ہوئے)
اور مولانا محمد علی جوہر (یہ تصویر بمبئی میں لی گئی)

ساتواں باب

طبّی مشن میں شرکت

اکتوبر ۱۹۱۲ء میں بلقان کی عیسائی ریاستوں نے ترکی پر حملہ کر دیا۔ ہندوستان میں اس خبر سے سخت ہیجان پیدا ہو گیا۔ پھر جوں جوں حالات نے خطرناک صورت اختیار کی اور اس کی خبریں ہندوستان میں پہنچنی شروع ہوئیں، مسلمانوں کی بے چینی میں بھی اضافہ ہوتا گیا اور ترکوں کی امداد کی مختلف صورتوں پر غور کیا جانے لگا۔ اس وقت جو تجاویز زیر بحث آئیں اور جن پر عمل کیا گیا، ان میں ایک تجویز یہ تھی کہ ترک مجاہدین کی امداد اور زخمیوں کی دیکھ بھال کے لئے ایک طبی وفد روانہ کیا جائے۔ طبی وفد کی سربراہی کا قرعہ فال حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی کے عقیدت مند قوم پرور رہنما اور ملک کے نامور طبیب ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے نام نکلا۔ مشن کی ضروریات کی تکمیل اور سامان سفر کی فراہمی کے لئے حضرت شیخ الہندؒ، مولانا ابوالکلام آزاد اور سب سے بڑھ کر مولانا محمد علی نے کوشش کی۔ اس مشن میں ہندوستان سے جانے والوں میں ۲۴ افراد شریک تھے۔ ان میں پانچ ڈاکٹر تھے اور انیس مرہم پٹی کرنے والے اور زخمیوں کو میدان جنگ سے لانے والے تھے۔ بعد کو انگلستان سے بھی کچھ لوگ آ کر شامل ہو گئے۔ اب مجموعی تعداد ۲۷ یا ۲۸ ہو گئی۔ چودھری خلیق الزماں نے ان میں سے ۲۲ افراد کے نام بھی بتائے ہیں۔ جن کی تفصیل

یہ ہے۔

مشن کے سربراہ : ڈاکٹر مختار احمد انصاری

ڈاکٹر : ڈاکٹر محمد نعیم انصاری، ڈاکٹر فیضی، ڈاکٹر باری اور ڈاکٹر محمود اللہ۔

ممبران : عبدالرحمٰن صدیقی، عبدالعزیز انصاری، منظور محمود، محمد یوسف عبدالرحمٰن پشاوری، توکل حسین، تفضل حسین، قاضی بشیرالدین (میرٹھ)، وحید الدین، نورالحسن، چراغ علی، غلام احمد، شعیب قریشی، خلیق الزماں، رضا حسین، اسماعیل شیرازی اور تونگر حسین۔ ان میں سے چھ ممبر یعنی عبدالرحمٰن صدیقی، شعیب قریشی، عبدالعزیز انصاری، منظور محمود، عبدالرحمٰن پشاوری اور چودھری خلیق الزماں علی گڑھ کے طالب علم تھے۔ ڈاکٹر ریاض الحسن صاحب فرماتے ہیں کہ حامد رسول نامی بھی ایک صاحب بہار کے تھے۔ ان کی ان سے مکہ میں ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ ایک غلام جیلانی صاحب بھی تھے جو بعد کو سنگاپور میں تجارت کرنے لگے تھے۔ حامد رسول اور قاضی بشیرالدین (میرٹھ) مشن میں کمپاونڈر تھے اور عبدالرحمٰن صدیقی وفد کے مینجر تھے۔

ریشمی رومال سازش کیس کے سلسلہ کی دستاویزات جو ابھی حال ہی میں تحریک شیخ الہند۔ ریشمی خطوط سازش کیس کے عنوان سے مولانا محمد میاں کے مفصّل مقدمہ کے ساتھ شائع ہوئے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ یہ قاضی بشیرالدین دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل مولانا رشید احمد گنگوہی کے نواسے تھے۔ طبی مشن کی واپسی پر اٹاوہ کنال ڈپارٹمنٹ میں ضلع دار ہوگئے تھے۔ ریشمی رومال کی سازش میں ان کا نام بھی شامل تھا اور جنود ربانیہ کے نام پر مولانا عبیداللہ سندھی آزادیٔ ملک کے لئے ایک قومی فوج تیار کرنا چاہتے تھے اس میں انہیں کرنل کا عہدہ دیا گیا تھا۔

ممبروں میں سے کوئی بھی ڈاکٹری یا مریضوں کی دیکھ بھال اور مرہم پٹی کرنے کے فن سے واقف نہیں تھا لیکن ڈاکٹر انصاری کو توقع تھی کہ یہ حضرات جس جذبۂ خدمت کے ساتھ شریک ہو رہے ہیں اس کی وجہ سے انتظامی معاملات میں یہ بہت مفید کام انجام دیں گے اور زخمیوں کی مرہم پٹی اور دیکھ بھال میں بھی ان سے بہت مدد ملے گی۔ شرکائے وفد کے اخراجات مشن کے ذمہ تھے لیکن چند حضرات نے اپنے اخراجات کا بار مشن پر نہیں ڈالا، ان میں عبدالرحمٰن پشاوری بھی شامل تھے۔ سفر کے اخراجات کا تخمینہ ایک ہزار روپے فی کس لگایا گیا تھا۔

عبدالرحمٰن اس وقت ایک طویل عرصے سے دل کی بیماری میں مبتلا تھے۔ روپے پیسے سے ان کی جیب اس وقت بالکل خالی تھی۔ کسی کے سامنے دست سوال پھیلانا تو الگ بعض دوستوں نے از خود نہایت خوشی کے ساتھ مالی امداد کی پیش کش کی لیکن عبدالرحمٰن کسی سے امداد لے کر خدمت ملی کا فریضہ ادا کرنا حمیت اور غیرت کے خلاف سمجھتے تھے۔ اس سلسلے میں وہ اپنے بھائی یا والد کو لکھنا مناسب خیال نہیں کرتے تھے۔ ایک تو وہی غیرت کا سوال تھا دوسرے انھیں یہ خطرہ بھی تھا کہ اگر والد نے ترکی جانے ہی سے منع کر دیا تو وہ مسلمانوں کی ایک عظیم الشان خدمت سے محروم رہ جائیں گے۔ عبدالرحمٰن چونکہ طبی مشن کے ساتھ ترکی جانے اور ترک مجاہدین کی خدمت بجالانے کا قطعی فیصلہ کر چکے تھے اس لئے وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس سفر میں کوئی رکاوٹ ہو۔ انہوں نے طے کیا کہ اپنی کتابیں کپڑے اور دیگر سامان فروخت کر کے مطلوبہ رقم فراہم کریں گے اور والد صاحب کو اطلاع اور ان کی اجازت کے بغیر خاموشی کے ساتھ ترکی روانہ ہو جائیں گے۔ چنانچہ انہوں نے یہی کیا۔ اپنی کتابیں، کپڑے اور دیگر سامان فروخت کر کے مطلوبہ رقم فراہم کر لی۔ اپنی ہمشیرہ کے

نام ایک خط میں سفر کی تیاری کی یہ دلچسپ روداد انھوں نے خود اس طرح بیان کی ہے۔ یہ خط انھوں نے بمبئی سے ۱۳ر دسمبر یعنی روانگی سے صرف دو روز قبل لکھا تھا۔ فرماتے ہیں:

"یہ بیان کرنے سے عاجز ہوں کہ کن مشکلات سے اپنا سرمایہ سفر فراہم کرکے کس دل سے بلقان کی طرف جا رہا ہوں۔ ہماری جماعت طبیہ میں صحیح طور پر صرف چار ڈاکٹر ہیں۔ باقی تیئس ۲۳ افراد ہم میں سے ایسے ہیں کہ کوئی ڈاکٹری کا علم نہیں جانتا۔ انیس افراد امدادی خرچ پر جا رہے ہیں۔ میں اپنے مصارف سفر خود ادا کروں گا۔ مصارف سفر کا ایک ہزار فی کس اندازہ کیا گیا، اس صورت میں کہ میں نے نہ تو جناب قبلہ والد صاحب کو اطلاع دی اور نہ جناب بھائی (آغا لالہ جان یعنی حاجی محمد امین) کو خبر کی اور نہ کسی اور ہی سے امداد طلب کی۔ خیال کرو کہ میں نے یہ رقم کس طرح حاصل کی؟

میری بہن! میں نے اپنا تمام لباس، سوٹ وغیرہ فروخت کر دیئے کتابیں اور جتنی فالتو چیزیں تھیں۔ سب طالب علموں نے کافی گراں قیمت پر مجھ سے خرید لیں۔ مبلغ دو سو روپے میرے رفیق فضل امین نے دیئے۔ اب میرے پاس صرف چند خاکی سوٹ اور دو جوڑے کپڑے رہ گئے ہیں اور بس! لیکن میرا دل مطمئن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میرا دستِ سوال کسی کے سامنے نہ پھیلانے دیا۔

حقا کہ با عقوبت دوزخ برابر ست
رفتن بہ پائے مردیٔ ہمسایہ در بہشت

میری مہربان بہن! گو کہ میرے پاس اس وقت بہت کم رقم ہے لیکن غم

نہ کر! کیونکہ شیر جنگل میں کبھی بھوکا نہیں رہتا عبدالرحمٰن بھی جہاں جائے گا اپنی روزی پالے گا اور انشاء اللہ عزت کی روزی حاصل کرے گا۔

آغا لالہ جان نے اس لئے مجھے رقم نہیں بھیجی کہ میں بلقان نہ جا سکوں۔ غلطی فضل امین کی تھی کہ ان کو تار دیا کہ عبدالرحمٰن ترکی جا رہے ہیں۔ میرے چند ایسے واقف تھے جو مجھے مالی امداد دینا چاہتے تھے لیکن میں اس طرح کی خیراتی درخواست سے کانپتا تھا۔ اس لئے لینے سے انکار کر دیا۔ خیال کرتا تھا کہ جہاد کے لئے جاؤں اور دوسروں کی مدد سے! ایسے جانے پر حیف!!

بہرصورت میرے لباس، سوٹ، کتابیں، تصاویر سب چیزیں چونکہ قیمتی تھیں اس لئے علی گڑھ کے پروفیسروں اور طالب علموں نے معقول قیمت پر خرید لیں اور میرا کام نکل گیا۔ میرا ایک خیر خواہ رفیق خاں کا لڑکا جو میرے ساتھ تصویر میں ہے، لکھتا ہے کہ مجھے خبر ملی ہے کہ تم بہت تنگ دستی کی حالت میں ترکی جا رہے ہو۔ مجھے اطلاع دو کہ آیا یہ بات درست ہے؟ اگر ایسا ہے تو میں تمہیں کچھ رقم بھیج دوں اور اگر مجھ سے لینا نہیں چاہتے ہو تو پھر اجازت دو کہ تمہارے والد صاحب سے جا کر کہوں کہ وہ تمہیں رقم بھیجدیں۔ آہ! اس بیچارے کو کیا خبر کہ حقیقت کیا ہے، تاہم اسے سخت تاکید کی کہ جناب قبلہ کو ہرگز خبر نہ کرے۔

بہن! نوشتہ تقدیر نے فرصت نہیں دی کہ چند روز اور توقف کرتا۔ اپنے محبوب کی محبت یعنی بلقان پہنچنے کی بے قراری اور بے تابی میں ازحد مخمور رہتا ہوں۔ حتیٰ کہ اپنی بیماری کو بھی بھول چکا ہوں۔

دردلیست دردِ عشق کہ اندر علاج او
ہر چند سعی بیش نمائی بتر شود

ہاں بھائی محمد اسحاق سے کہہ دینا کہ بھائی شمشاد کے ذریعہ مجھے میری غلیل بھیجدیں۔ میں اس اثنا میں حصولِ علم اور ترکی زبان سیکھنے میں برابر مصروف رہتا ہوں۔ انشاء اللہ جلد اس زبان کو سیکھنے میں مہارت حاصل کرلوں گا۔"

ایک اور خط جو انہوں نے ۷ مئی ۱۹۱۳ء کو قسطنطنیہ سے لکھا تھا۔ اس میں اس سفر کے اخفا کی کوششوں اور سرو سامان کی تیاریوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

"عزیزم! شکایت کرتی ہو کہ بلقان جاتے وقت عزیزہ کو اطلاع دے کر نہیں گیا۔ آہ! یہ شکایت سب ہی کو مجھ سے ہے۔ عزیزہ! ناراض نہ ہونا۔ ہندوستان کا ملک تھا اگر کسی کو میرے جانے کا ادنیٰ سا اشارہ بھی مل جاتا تو میرا جانا ملتوی ہو سکتا تھا۔ نیز مصارفِ سفر نہ ہونے کی وجہ سے آخر وقت تک جانے کی کوئی امید بھی نہیں تھی۔ تمہیں کیا معلوم کہ کن کن تدابیر اور کیسی جانفشانی سے لیکن باعزت طریقے سے رقم حاصل کی۔ جس وقت ان حالات کو یاد کرتا ہوں تو میرا رواں رواں کانپ جاتا ہے۔ بات یہ تھی کہ رقم تو اکثر کالج کے دوست اور احباب دینے کو آمادہ تھے لیکن وہ دوستانہ طور پر دینا چاہتے تھے، قرض کے طور پر نہیں اور یہ بات مجھے منظور نہ تھی۔ خیال کرتا تھا کہ یا الٰہی کس کام پر جا رہا ہوں اور وہ بھی دوسروں کی امداد پر! قصہ مختصر یہ کہ اس مالک حقیقی نے میری ایسی

ہی امداد کی جیسی کہ میں چاہتا تھا۔ اکثر میرے دوستوں نے بطور تبرک میرے کپڑے وغیرہ خرید لئے۔ تم لکھتی ہو کہ میں نے تم سے رقم لینے سے کیوں اعتراض کیا جانتی ہو کہ وہ پیسے جو تم نے اپنے خرچ واخراجات سے جمع کئے تھے وہ پیسے میں اپنے ساتھ لے جاتا ! یہ میری طبیعت نے گوارا نہ کیا۔
حقیقت یہ تھی کہ اس سفر کا راز پوشیدہ رکھنا ضروری تھا۔ بھائی فضل امین کی غلطی کی وجہ سے قریب تھا کہ یہ راز کھل جاتا کیونکہ میں تو اپنی تگ و دو میں مصروف و پریشان تھا اور انہوں نے میری بغیر اطلاع کے آغا لالہ جان (بڑے بھائی حاجی محمد امین) کو تار دے دیا کہ عبدالرحمان کے لئے جلدی رقم بھیجو۔ مجھے بعد میں جب انہوں نے یہ حال بتایا تو قریب تھا کہ میں انتہائی غصے میں ان کو کچھ کہہ دیتا۔ اسی وقت لالہ جان کو تار دیا کہ ابھی میرے جانے کا کوئی ارادہ نہیں۔ اس لئے رقم کی ضرورت نہیں ہے۔ پس ! میں نے علی گڑھ کے اپنے چند رفیقوں کے سوا اور کسی کو یہ حال نہیں بتایا اور علی گڑھ کے لوگ جانتے تھے کہ کوئی جائے یا نہ جائے عبدالرحمٰن ضرور جائے گا۔

پس میری عزیزہ بہن ! اب تو تم معاملہ سمجھ گئیں نا ؟ اب ناراض تو نہیں ہو ؟

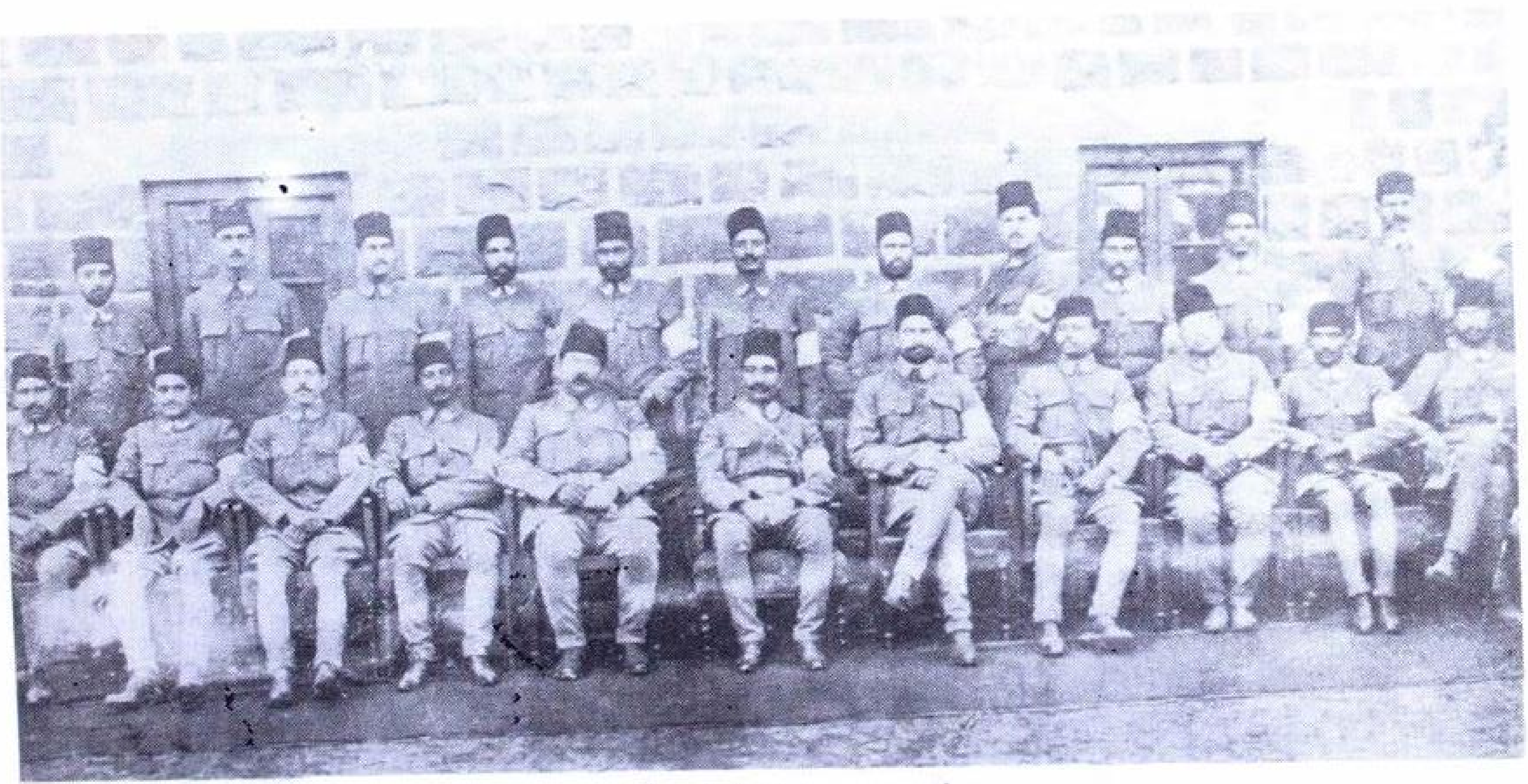
واللہ ان دنوں سخت گھبرایا ہوا تھا کہ مبادا آپ لوگوں کو پشاور میں خبر ہو جائے اور آپ لوگ رونا دھونا شروع کردیں اور واویلا کریں کہ ، اے لوگو ! خدا کے لئے ہمارے لالہ جان کو روکو۔ یہ اس بیماری کی حالت

میں کہاں جا رہا ہے ۔ جلدی کریں ۔ تار دیں ۔ لالہ جان کو پکڑیں اسے جانے نہ دیں یقین کرنا ۔ یہاں اب بھی خواب میں یہی نظارہ دیکھتا ہوں کہ اپنی پیاری زرتاج نو سے لڑتا ہوں کہ آپ لوگ کیوں گھبرا رہے ہیں اور کیوں میرا پیچھا نہیں چھوڑتے ہیں ۔

غرضیکہ اب وہ تمام کش مکش ختم ہوگئی اور میں آخر کار یہاں پہنچ ہی گیا ۔ ''

جنگِ بلقان کی خبروں نے مسلمانوں کے دلوں میں آگ لگا دی تھی ۔ طبی وفد کی روانگی سے وہ بہت خوش تھے ۔ دہلی سے بمبئی کے سفر میں یہ وفد جن جن شہروں سے گزرا ۔ اسٹیشنوں پر ہزارہا لوگوں نے دیدہ ہائے اشکبار سے ان کا استقبال کیا اور تحسین و آفرین کے پھول برسائے ۔ چودھری خلیق الزماں لکھتے ہیں :

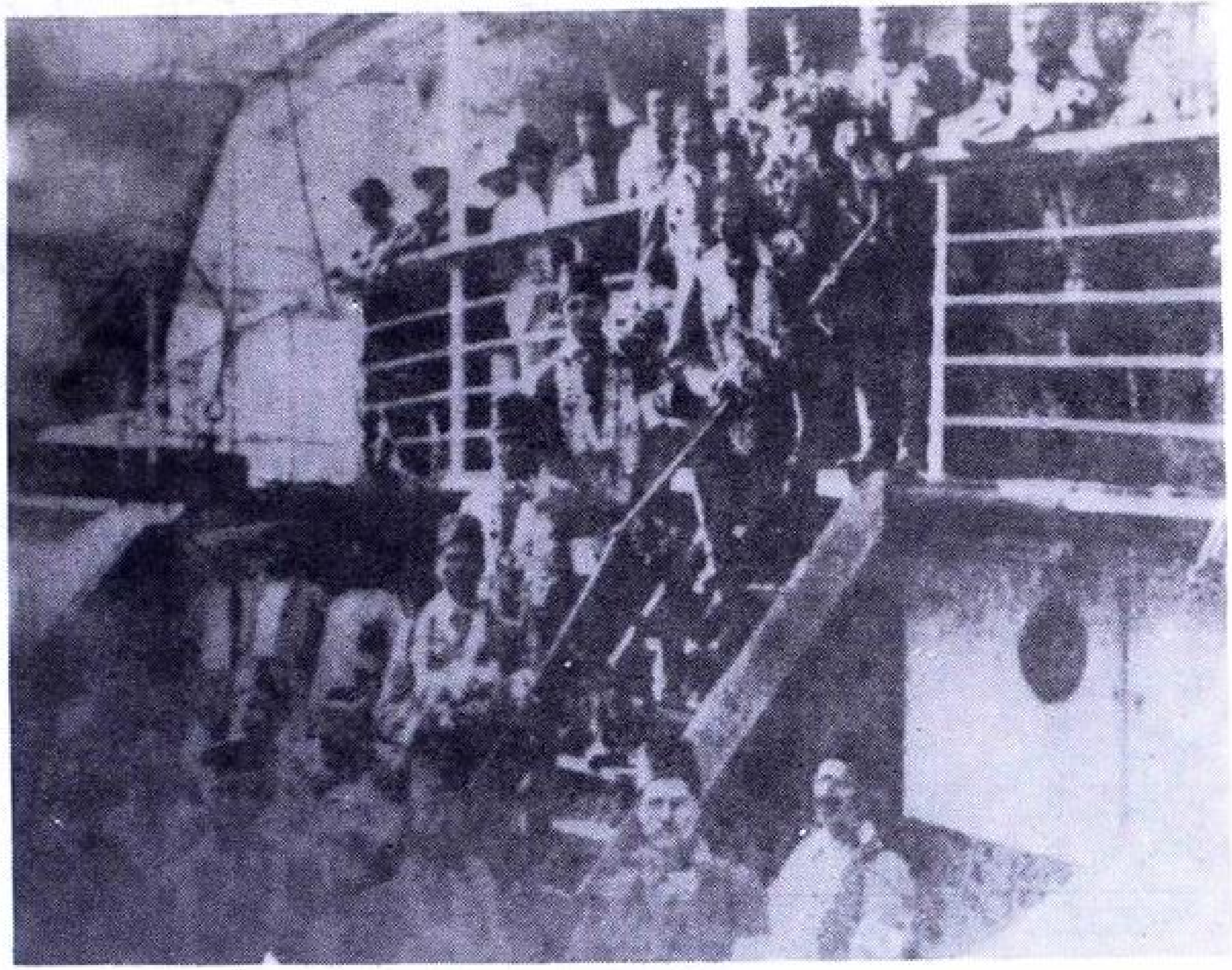
ل یہ ان کا گھریلو نام تھا ۔ یہ عبدالرحمٰن کی حقیقی بہن تھیں ۔ ان کا اصلی نام فاطمہ بیگم تھا یہ سردار عبدالرؤف سے منسوب تھیں ۔ سردار عبدالرؤف سردار سر محمد اسلم خان کے پوتے تھے ۔ سردار سر محمد اسلم خان کا ذکر پہلے آچکا ہے ۔ ۱۹۱۱ء کے دہلی دربار میں شاہ جارج پنجم کی آمد پر بھرے دربار میں یہ اپنی پیرانہ سالی کی معذرت کر کے بیٹھے رہے حالانکہ مہاراجہ بڑودہ پر انگریزوں نے صرف اتنی بات پر غیر وفاداری کا الزام لگایا تھا کہ وہ شاہ جارج کو نذر پیش کرنے کے بعد پیٹھ موڑ کر چلے آئے تھے ۔ لیکن سردار سر محمد اسلم خان جب لاہور میں اپنے پیر مرشد کے یہاں جاتے تو سب سے آخر میں یہاں جوتوں کی جگہ ہوتی ہے بڑی انکساری سے بیٹھ جاتے ۔



یہ تصویر بھوپال کے اسٹیشن پر لی گئی۔

دائیں سے بائیں۔ (۳) عبدالرحمٰن صدیقی مینجر طبی وفد (۴) ڈاکٹر باری (۵) ڈاکٹر نعیم انصاری امروہوی (۶) ڈاکٹر مختار احمد انصاری (۷) مولانا محمد علی (۸) چوہدری خلیق الزمان۔

کھڑے ہوئے۔ بائیں سے دائیں۔ (۱) عبدالعزیز انصاری (۲) شعیب قریشی (۶) قاضی بشیرالدین (۸) عبدالرحمٰن پشاوری (۹) اسمٰعیل شیرازی۔



بمبئی میں 'سارد یمیا' جہاز کی روانگی سے قبل طبی وفد کے ممبران سیڑھی پر اور کچھ عرشہ پر کھڑے ہیں۔ نیچے دائیں سے بائیں دوسرے نمبر پر عبدالرحمٰن پشاوری کھڑے ہیں۔

"ہم سب لوگ نومبر کے آخری ہفتہ میں بمبئی روانہ ہوئے ۔ اسٹیشن پر اتنا ہجوم تھا کہ اپنے درجوں تک جانا مشکل ہوگیا ۔"

علامہ سید سلیمان ندوی نے لکھنؤ کے اسٹیشن پر ڈاکٹر انصاری کی روانگی کا منظر بیان کیا ہے ۔ تحریر فرماتے ہیں :

"مولانا شبلی اور ڈاکٹر انصاری کی عمروں میں بڑا تفاوت تھا ۔ ڈاکٹر صاحب اس وقت بالکل جوان تھے اور مولانا بوڑھے ۔ اس پر بھی یہ منظر آنکھوں نے دیکھا کہ ڈاکٹر انصاری لکھنؤ ہو کر روانگی کے لئے دہلی جا رہے تھے ۔ لکھنؤ کے اور چند ممتاز لوگ بھی الوداع کہنے کو موجود ہیں ۔ گاڑی روانہ ہونے کو ہے ۔ مولانا پلیٹ فارم پر کھڑے ہیں ۔ ڈاکٹر صاحب ڈبے کے دروازے پر کھڑے وداعی سلام کر رہے ہیں کہ دفعتہً اس ہمہ تن جوش علامہ وقت کا وہ سر جو بڑے بڑے جیالوں کے سامنے بھی نہیں جھکا تھا، ڈاکٹر انصاری کے بوٹ پر جھک گیا ۔ آنسوؤں نے اس کے گرد وغبار کو دھویا اور لب نے اس کے بوسے لئے اور گاڑی اسلامی غیرت وحمیت کے ان گہرہائے گرانمایہ کو لے کر آگے بڑھ گئی ۔"

بھوپال کے اسٹیشن پر بھی زبردست استقبال کیا گیا اور کھانے پینے کی چیزوں سے ارکان وفد کی تواضع کی گئی اور تحائف پیش کئے گئے ۔ یہاں اسٹیشن پر طبی وفد کا ایک گروپ فوٹو بھی کھینچا گیا ۔ یہ فوٹو تمکین محمد خاں کے کمال فن کا شاہکار ہے ۔ موصوف اس زمانے میں آرٹ اسکول بمبئی میں زیر تعلیم تھے ۔ اس فوٹو میں گیارہ افراد کرسیوں پر فروکش ہیں اور گیارہ افراد ان کی پشت پر کھڑے ہیں ۔ درمیان میں مولانا محمد علی بھی ہیں

سو بمبئی تک وفد کے ساتھ گئے تھے۔ یہ تاریخی فوٹو ۱۸ دسمبر ۱۹۱۲ء کے الہلال کلکتہ میں مولانا کی اس تحریر کے ساتھ شائع ہوا۔

دیدۂ سعدی و دل ہمراہ تست
تا نہ پنداری کہ تنہا می روی

اے وہ لوگو کہ زخمیوں کے ملک میں جا رہے ہو، جب وہاں پہنچ کر زخموں کو دھونا تو خدارا سختی نہ کرنا کہ وہ زخم زخمیوں کے نہیں بلکہ اسلام کے ہیں۔

"شفی اللہ مرضی بالعراق فانتی
علی کل مرضی بالعراق شفیق"

فوٹو کے نیچے تحریر ہے۔

"ہلال احمر کا میڈیکل مشن جو ڈاکٹر انصاری کی سرکردگی میں ۱۵ دسمبر کو بمبئی سے روانہ ہو گیا۔ یہ گروپ فوٹو بھوپال کے اسٹیشن پر مسٹر تمکین محمد خاں متعلم آرٹ اسکول بمبئی نے کھینچا ہے۔"

اس طرح اہالیانِ بمبئی نے وفد کے لئے دیدہ و دل فرش راہ کئے۔ چند دن بمبئی میں قیام کے بعد "سارڈینیا" نامی جہاز سے استنبول روانہ ہو گیا۔ راستے کے حالات کے لئے ہمارے سامنے صرف ایک ہی ماخذ ہے اور وہ ہے چودھری خلیق الزماں کی خود نوشت "شاہراہ پاکستان"۔ اُس میں سفر کی مصروفیات و مناظر کے بارے میں چودھری صاحب مرحوم لکھتے ہیں:

"بمبئی پہنچ کر ہم چار دن ٹھہرے۔ اس کے بعد ۱۵ دسمبر کو اطالوی جہاز

سارڈینیا سے استنبول روانہ ہو گئے۔ سفر میں ڈاکٹر انصاری ہم لوگوں کو فوری طبی امداد پر لکچر دیتے تھے۔ عدن میں ہم لوگوں کا بڑا شاندار استقبال ہوا اور اسی طرح سوئز اور اسکندریہ میں۔ یہاں سے ہم لوگ رومانیہ کے ایک جہاز پر استنبول روانہ ہوئے۔ تین دن کے سفر کے بعد جب درۂ دانیال کے قریب آ گئے۔ اس وقت ایک یونانی جہاز "آوارف" نے ایک ہوائی فائر کر کے ہمارے جہاز کے کپتان کو رُکنے کے لئے حکم دیا اور تھوڑی دیر بعد وہ جہاز ہم سے بہت قریب آ گیا جہاں سے اس نے کشتیوں پر اپنے سپاہی ہمارے جہاز پر بھیج دیئے تاکہ مسافروں کی جانچ پڑتال کریں۔ ہم مطمئن تھے کہ ہم ہندوستانی رعایا ہیں اس لئے یونانی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے مگر ایک ترک جو مصر سے ہمارے ساتھ سوار ہو گئے تھے بہت پریشان تھے کہ یونانی ان کو گرفتار کر لیں گے۔ میں نے ان کو اپنی کیبن میں چھپا لیا۔ یونانی ہم لوگوں کی کیبن تک نہیں آئے اور واپس چلے گئے۔ یونانیوں کا یہ جہاز بہت بڑا تھا اور اس کے مقابلے میں ترکوں کے پاس کوئی جہاز نہ تھا جس کی وجہ سے ترکی بیڑہ درۂ دانیال کے اندر محبوس تھا اور کھلے سمندر میں آنے کا حوصلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس واقعہ کے بعد ہم لوگ دو تین گھنٹے میں درۂ دانیال میں داخل ہو گئے جس کے دونوں جانب پہاڑیوں پر اوپر نیچے کئی قلعے دور تک چلے گئے تھے یہ قلعے ترکی کی حفاظت کا مضبوط ترین ذریعہ تھے اور یہی قلعے پہلی جنگِ عظیم میں تین برس بعد انگریزی بیڑے کے لئے بہت مہلک ثابت ہوتے۔ ہمارا

جہاز خراماں خراماں درۂ دانیال سے آگے بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ رات ہوگئی اور صبح ہوتے ہوتے ہم استنبول کے قریب پہنچ گئے۔ ہم لوگ اُٹھ کر تیار ہو رہے تھے کہ استنبول کی مساجد کے مینار ہم کو نظر آئے تا آنکہ تھوڑی دیر بعد ہمارا جہاز بندرگاہ پر جا لگا۔ ترکی بینڈ بج رہا تھا اور ہزاروں ترک ہمارے استقبال کو کھڑے تھے۔ سب سے پہلے ہلال احمر کے صدر رسیم عمر پاشا نے آگے بڑھ کر ڈاکٹر انصاری سے مصافحہ کیا اِس کے بعد ایک ایک کر کے ہم سب لوگوں سے مِلے۔ بعد ازاں ہم سب قادرگاہ اسپتال جہاں ہمارے ٹھہرنے کا انتظام تھا، لے جاتے گئے۔"

آٹھواں باب

ترکی میں طبی وفد کی پذیرائی

ہندوستان کا طبی وفد اواخر دسمبر ۱۹۱۲ء میں ترکی پہنچ گیا تھا۔ تقریباً سوا مہینے استنبول میں قیام کرنے کے بعد ۸ر فروری ۱۹۱۳ء کو میدانِ جنگ کی طرف روانہ ہوا۔ ترکی میں نہایت گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا گیا اور ہندوستانی مسلمانوں کے اس ایثار اور کارنامے کو نہایت قدر اور محبت کی نظر سے دیکھا گیا۔ امرا و اعیانِ حکومت نے ان کے اعزاز میں پارٹیاں دیں۔ ڈاکٹر محمود اللہ جو کلکتہ سے طبی وفد کے ایک ممبر تھے۔ انہوں نے ۵ر فروری ۱۹۱۳ء کو مولانا ابوالکلام آزاد کے نام جو خط لکھا تھا اس میں استنبول میں ترکی وفد کی مصروفیات اور دیگر امور پر روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے لکھا:-

"۵ر فروری

"ہمارا قیام اسپتال قادرگاہ میں ہے جو استنبول میں واقع ہے۔ یہ ایک بہت بڑا اسپتال قابلہ گری کا ہے مگر بالفعل اسے ایک جنگی اسپتال بنا دیا گیا ہے۔ یہاں کے مریض بہت اچھی حالت میں ہیں۔ بلجیم کی بیرنس روزین یہاں کی بڑی نرس اور ڈاکٹر سہامی جو ایک یہودی ہیں، اس کے بڑے ڈاکٹر ہیں۔ ترک ہمارے ساتھ نہایت خلق اور مہمان نوازی سے پیش

آتے ہیں۔

پرسوں جمعے کو ہم لوگ مسجد جامع میں نماز کے واسطے گئے تھے اس مسجد میں سلطان المعظم بھی تشریف لائے تھے۔ سلطان کی سواری ہمارے پاس سے نکلی۔ ہم نے سلام کیا اور خوشی کے نعرے بلند کئے۔ سلطان المعظم نے اپنے اے۔ ڈی۔ کانگ کے ذریعہ سلام کہلا بھیجا۔ ہم سب نے سلطان المعظم کے ہمراہ نماز ادا کی۔ اس کے بعد حضرت ابوایوب انصاری کے مزار پر گئے۔ یہ ایک عالی شان اور بہت آراستہ عمارت ہے۔ یہاں رسالتمآبؐ صلی اللہ علیہ وسلّم کے قدم مبارک کا نشان ہے۔ یہاں سے ہم سلطان محمد فاتح کے مقبرے کو گئے۔ یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک کی زیارت کی۔ مقبرے کی دیوار پر ایک نہایت خوشنما کتبہ ہے جس میں ایک حدیث بطور پیشین گوئی فتح قسطنطنیہ کے متعلق لکھی ہوئی ہے۔

اب ہم لوگ جلد میدانِ جنگ میں جانے والے ہیں۔ لڑائی کی خبریں یہاں بھی کمیاب ہیں۔ ہندوستان کے بعض اخبارات میں یہاں سے زیادہ وضاحت سے معلوم ہوتی ہیں۔ نیازی بے بڑی جانبازی سے کام کر رہے ہیں۔ جہاد کا کوئی اعلان نہیں ہوا ہے۔ سننے میں آیا ہے کہ عراق اور شام کی فوجیں لڑائی کے واسطے تیار ہیں۔

آج شام کو خبر آئی کہ لڑائی پھر شروع ہو گئی ہے۔ ترکی بیڑہ درہ دانیال سے نکل کر بحرایجین میں یونانیوں سے لڑنے گیا ہے۔ شتلجہ میں بھی لڑائی شروع ہو گئی۔ اب کی مرتبہ سخت لڑائی ہو گی اور خدا سے امید ہے کہ

ترکوں کو فتح ہو گی۔ دشمنوں نے مفتوحہ مقاموں کے کل مسلمانوں کے ساتھ جو قساوت برتی ہے۔ وہ بیان سے باہر ہے۔ اکثر چھوٹے چھوٹے بچے اور عورتوں کو پکڑ کر زندہ جلایا گیا ہے۔ ان کے ظلم کی باتیں سننے کی تاب نہیں۔

۱۴ر جنوری۔ کل ڈاکٹر انصاری مع چند ترکی افسروں اور ڈاکٹروں کے وہ مقام دیکھنے گئے جہاں ہم لوگوں کا اسپتال قائم ہو گا۔ اس مقام کا نام عمرلی ہے اور شتلجہ لین کے بہت قریب ہے۔ یہاں ناظم پاشا نہایت خلق اور گرمجوشی سے پیش آئے۔ لڑائی کی بابت بہت گفتگو رہی۔ پاشائے موصوف بہت افسوس کرتے تھے کہ فوجی انتظام بہت خراب ہے سننے میں آتا ہے کہ وزارت بدلی جائے گی۔ ایک پارٹی لڑائی جاری رکھنے کی طرف دار ہے اور دوسری پارٹی صلح کر لینا چاہتی ہے۔ وقت بہت نازک ہے مگر خدا میں سب قدرت ہے۔ وہ اسلام کا نام ہمیشہ زندہ رکھے گا۔ ترکی کی مالی حالت بھی اچھی نہیں ہے۔
عنقریب ایک عظیم الشان جنگ ہونے والی ہے۔ ایڈریانوپل کے محصورین کی حالت بہت اچھی ہے۔ ترکی قلعے بہت محفوظ حالت میں ہیں۔ یہ سُن کر کیسا افسوس ہوا کہ سالونیکا کو لڑائی کے بغیر تحسین پاشا نے یونانیوں کے حوالے کر دیا۔ مگر حال کی خبر ہے کہ پرسوں ترکوں نے ایک زبردست فتح یونانیوں پر اسی سالونیکا کے قریب حاصل کی۔
۱۶ر تاریخ کو ہز ایکسیلنسی نسیم عمر پاشا نے ہمارے طبی مشن کی ایک بے تکلف

دعوت کی۔ پاشائے موصوف کا محل نہایت شاندار اور آراستہ ہے۔
دعوت میں ہز ایکسیلنسی اسد پاشا جو امراض چشم کے ماہر خیال کیا جاتے ہیں۔ اور ڈاکٹر طلعت بے اور بعض اور مشہور ترکی ڈاکٹر بھی مدعو تھے۔
کھانے سب انگریزی اقسام کے تھے ایک مفصل تقریر میں میزبان نے ہمارے مشن کا شکریہ ادا کیا اور اثنائے گفتگو میں مختلف ممالک کے درمیان رشتہ اخوت و محبت قائم کرنے کے ذرائع پر بحث کرتے ہوئے کہا:

"کیا ہی اچھا ہوتا کہ اگر ہم میں اور ہندوستانی برادران دین میں رشتہ مناکحت قائم ہو جاتا۔ ہندوستانی لوگ ترک عورتوں سے اور ترک ہندوستانی کی عورتوں سے بے تکلف شادیاں کرتے اور اس طریقے سے وہ رشتہ یگانگت قائم ہو جاتا جس کی اسلام کو بہت سخت ضرورت ہے۔"

اس تجویز کو ہم سب نے بہت پسند کیا۔ بلکہ ہمارے ساتھ کے ایک شخص نے کہا" کہ تجویز تو بہت اچھی ہے۔ مگر ترک بھی آئندہ یورپ کی عیسائی عورتوں سے مناکحت کرنا چھوڑ دیں کیونکہ یہ ان کی خرابی نسل کا باعث ہوتا ہے۔ یورپ کی عیسائی لیڈیوں سے ہماری ہندوستانی عورتیں کہیں بہتر ہیں۔"

اس پر لطف تقریر کے بعد ڈاکٹر انصاری نے طلعت بے سے درخواست کی کہ ہم سب ہز ایکسیلنسی انور بے کی زیارت کے بے حد مشتاق ہیں۔ آپ ہمارا یہ اشتیاق کسی طرح ان کے گوش گزار کر دیں انھوں نے جواب



غازی انور پاشا۔ نیچے بائیں طرف ان کی دستخط ہے۔



ہندوستانی طبی وفد ترکی انجمن ہلال احمر کے بعض ڈاکٹروں کے ساتھ۔ اس تصویر میں
غازی انور پاشا بیچ میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان کے دائیں ڈاکٹر مختار احمد انصاری بیٹھے ہیں۔
فرش پہ بیٹھے ہوئے بائیں سے دائیں۔ ڈاکٹر نعیم انصاری امروہوی۔ عبدالرحمن پشاوری بشیرالدین (میرٹھ)

د۔ بہت اچھا میں ان کو فوراً مطلع کر دوں گا۔ وہ بالفعل شملہ میں ہیں۔ مگر امید ہے کہ کل آپ لوگوں سے ضرور ملیں گے۔ چنانچہ دوسرے دن ٹھیک تین بجے ہز ایکسیلنسی انور بے نہایت بے تکلفی سے تن تنہا اسپتال میں ہم لوگوں سے ملنے تشریف لائے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ہم نے ان کو دیکھا۔ وہ نہایت خوش رو جوان تھے۔ تقریباً تیس سال کے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے چہرے پر ایک عجیب دلفریب مسکراہٹ ہے۔ فوج میں ان سے زیادہ کوئی ہر دلعزیز نہیں۔ ہم سب نے نہایت گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا اور ان کے قومی کارناموں کی جس قدر تعریف الفاظ میں ہو سکی۔ ہم نے کی۔ انہوں نے بھی تہ دِل سے ہمارا شکریہ ادا کیا اور ہمارے خلوص و محبت کی قدر کی۔ اس کے بعد وہ ہم لوگوں کو ساتھ لے کر بیماروں کے وارڈ کی طرف چلے۔ ہر سپاہی کی پیٹھ نہایت شفقت سے ٹھونکتے اور نہایت محبت کے لہجہ میں اس سے باتیں کرتے تھے۔ ان کا ہر ہر لفظ ہمدردی اور امید سے بھرا ہوا تھا وہ ان کو سمجھاتے تھے کہ رنج نہ کرو اور اپنی تکلیفوں کا خیال اپنے دل سے اٹھا دو۔ دیکھو تمہارے یہ بھائی کتنے دور دراز فاصلے سے سفر کی مصیبتیں جھیل کے صرف اس لئے آتے ہیں تاکہ تمہاری مصیبت دور کریں اور تمہاری تکلیفوں میں شریک ہوں۔ پس تم کو چاہیئے کہ اپنے ان بھائیوں کی تکلیفوں کا خیال کرو اور اپنے مصائب بھول جاؤ۔ جلدی سے اچھے ہو جاؤ تاکہ ایک مرتبہ اور اپنی شجاعت اور جانبازی کے جوہر دنیا کو دکھلا سکو۔" اس قسم کے دل بڑھانے والے مگر محبت سے بھرے

ہوئے الفاظ ایک ایک سپاہی سے کہتے تھے۔ جس طرح کوئی شفیق باپ اپنے پیارے بیٹے سے باتیں کرتا ہے۔ ہر سپاہی ان باتوں کو سن کر جوش وخروش سے نعرہ ہائے تحسین بلند کرتا تھا۔ گویا واقعی اس کی تکلیفیں دور ہوگئی تھیں۔ اس کے بعد ہم سب صحن میں تھوڑی دیر بیٹھے جہاں بہت سے گروپ فوٹو لیئے گئے۔ جن میں سے ایک میں ہز اکسلنسی ہمارے مشن کے ساتھ بیٹھے ہیں، ایک تصویر تنہا علیحدہ خود ان کی ہے اور ایک گروپ ان مسلمان روسی عورتوں کا ہے جو مجروحین کی اعانت کے واسطے ملک روس سے آئی ہیں۔ سب تصویریں دستیاب ہونے پر آپ کی خدمت میں روانہ کردوں گا۔ ہز اکسلنسی نے یہ بھی وعدہ فرمایا ہے کہ اپنا ایک دستخطی فوٹو بطور یادگار مشن کے ہر ممبر کو عنایت کریں گے۔

۲۱ جنوری: تمام ترک اپنے برادران دینی کی ہمدردی کے بے حد مشکور ہیں۔ ان کو ہندوستان کے اس اظہار ہمدردی ومحبت پر سخت تعجب ہے۔ معزز پاشا اور دیگر اکابر قوم بھی ہمارے خلوص اور محبت سے بہت متاثر ہوتے ہیں اور ہم لوگوں سے نہایت محبت اور احسان مندی سے پیش آتے ہیں۔

دوشنبہ کے دن یقیناً ہمارا مشن عملی روانہ ہو جائے گا۔ ترکوں کی وہ جماعت جو انجمن ہلال احمر کی بانی ہے نہایت جوش اور ہمدردی سے مجروحین اور مہاجرین کی اعانت کا کام کر رہی ہے۔ تمام اسپتال دار السلطنت

ہیں یا اس کے قرب وجوار میں قائم ہیں وہ اسی ہلال احمر کا شعبہ ہیں۔ بسیم عمر پاشا، اسد پاشا اور طلعت پاشا کی کوششیں ہزاروں تعریفوں کے لائق ہیں۔ چار سو معزز خاندانوں کی خاتونیں دن رات اس کام میں مشغول ہیں کہ ان مصیبت زدہ ترکوں کی ہر طرح سے اعانت کریں۔ ایک معنی میں ان کی کوششیں گورنمنٹ سے زیادہ قابل تحسین ہیں۔"

نواں باب

ترکی میں وفد کی مصروفیات

طبی وفد ہندوستان سے روانہ ہوا تھا تو اس وقت جنگ بلقان کا شباب تھا۔ اسلامیان ترکی آگ اور خون میں ڈوبے ہوئے تھے لیکن جب استنبول وفد پہنچا تو اس وقت ادرنہ کا محاصرہ کیا جا چکا تھا اور جنگ میں کچھ کمی آگئی تھی۔ چوہدری خلیق الزماں لکھتے ہیں:۔

"یہاں ہم لوگوں کو معلوم ہوا کہ ہمارے ہندوستان سے روانگی کے بعد ترکی فوج کو بہت دل سوز اور روح فرسا حالات پیش آئے قرق کلیسا کی لڑائی میں فوجی بد انتظامی کی وجہ سے اندھیرے میں ترکوں کی فوج کے دو حصّوں میں تقریباً گھنٹہ دو گھنٹہ آپس میں گولہ باری ہوتی رہی جس سے فائدہ اٹھا کر صبح کو بلغاریوں نے بڑا سخت حملہ کر کے ترکوں کو پیچھے پھینک دیا اور ایڈریانوپل کا محاصرہ کر لیا۔ ترکی فوج پسپا ہو کر لولی بورغاس میں ٹھہری مگر یہاں بھی وہ نہ ٹھہر سکی اور بالآخر شتلجہ[1] پر آکر مدافعت کرنے

---

[1] شتلجہ، استنبول سے کوئی پچپن ساٹھ میل مغرب میں واقع ہے۔

میں کامیاب ہوئی اور فریقین کی فوجیں آمنے سامنے کھڑی ہو گئیں۔ اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انگریز اس قدر جلد ترکوں کی جنگی ناکامی کی توقع نہ رکھتے تھے کیونکہ یہ ان کے مفاد کے خلاف تھا لہٰذا وہ ترکوں اور بلغاریوں کے درمیان متارکہ کرا کے صلح کی شرائط طے کروانے لگے[1]۔ یہ سب حالات اس قدر جلد رونما ہوئے کہ دنیا متحیر تھی۔ ترکوں میں تو یہ خبر عام طور پر گشت کر رہی تھی کہ جب ترکی فوج کو یہ ہزیمتیں پیش آئیں اس وقت ناظم پاشا سر عسکر استنبول کے محلے پیرا میں یونانیوں کی لڑکیوں کے ساتھ ناچ رنگ میں مشغول تھے۔"

ادرنہ کا محاصرہ ایک بہت بڑا حادثہ تھا جس نے ساری اسلامی دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ ترکوں پر اس حادثہ سے جو کچھ بیتی ہو گی اس کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔ عبدالرحمن نے بھی اس دلدوز حادثے کا تذکرہ اپنے ایک خط میں کیا ہے۔ اپنی بہن کے نام خط میں لکھتے ہیں:

"ہاں عزیزہ! ایڈریانوپل (ادرنہ) ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔ اللہ پناہ دے۔ جس دن یہ منحوس خبر سنی، یہاں کیا حال تھا۔ بیان سے باہر ہے۔ لیکن نوشتہ تقدیر کا کون مقابلہ کر سکتا ہے۔ جانے والی چیز ہاتھ سے نکل گئی۔ تاریخ میں ایک نام رہ گیا کہ غازی شکری پاشا نے کس طرح

---

[1] انگریزوں کو ڈر تھا کہ کہیں استنبول بلغاریہ کے پاس نہ چلا جائے جس سے روسی غلبہ کا بڑھ جانا لازمی تھا۔ اس خیال سے انگریزوں نے جلد صلح کرانے کی کوشش کی۔

دشمن کا مقابلہ کیا۔ جانتی ہو کہ جس وقت دشمن کی فوج ان جاں نثاروں کو بے تحاشا قتل و غارت کر رہی تھی۔ ترک سپاہی شدتِ پیاس اور بھوک سے اپنی توپوں کے ڈھالوں پر اپنا منہ رکھ کر آخری سانس لے رہے تھے۔ اللہ اکبر، رحمت ہو ایسے جانبازوں کی ماؤں پر۔ کاش سب ترک ایسا ہی جذبہ پیدا کرتے۔

آہ افسوس صد افسوس! کہ چند بدبخت ترکوں کی غفلت اور بے اتفاقی اور ملت فروشی کے باعث یہ جانباز لوگ مفت میں مارے گئے۔"

ہندوستان کے اخبارات اور رسائل میں اس حادثے کی خبریں اور دیگر تفصیلات شائع ہوئیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ۹ اپریل ۱۹۱۳ء کے شمارہ الہلال میں "سقوط ادرنہ" کے عنوان سے ایک نہایت زوردار مضمون لکھا جو درحقیقت ترکی کی تباہی کا ایک دلدوز مرثیہ تھا۔ پھر ۲۱ مئی کے شمارے میں "عظیم الشان ادرنہ" کے عنوان سے ادرنہ پر ایک تاریخی مضمون شائع کیا۔ اس شمارے میں شکری پاشا کی جاں نثاری اور عزیمت کو زبردست خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے ۲ اپریل کے شمارے میں بھی شکری پاشا کے حالات اور ان کی محیر العقول بہادری اور جان سپاری کے تذکرہ میں ایک مضمون شائع کر چکے تھے۔

علامہ اقبال مرحوم نے ایک نظم "محاصرہ ادرنہ" کے نام سے لکھی جو روزنامہ زمیندار میں شائع ہوئی۔ یہ نظم "بانگ درا" میں موجود ہے۔ چونکہ اس نظم سے ترک مجاہدین کی اسلامی سیرت پر روشنی پڑتی ہے۔ اس لئے اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہو گا۔ نظم یہ ہے۔

محاصرۂ ادرنہ

یورپ میں جس گھڑی حق و باطل کی چھڑ گئی
حق خنجر آزمائی پہ مجبور ہو گیا!
گردِ صلیب گردِ قمر حلقہ زن ہوئی
لشکر حصارِ درنہ میں محصور ہو گیا!
مسلم سپاہیوں کے ذخیرے ہوئے تمام
روئے امید آنکھوں سے مستور ہو گیا
آخر امیرِ عسکرِ ترکی کے حکم سے
"آئینِ جنگ" شہر کا دستور ہو گیا
ہر شئے ہوئی ذخیرۂ لشکر میں منتقل!
شاہین گدائے دانۂ عصفور ہو گیا
لیکن فقیہہ شہر نے جس دم سُنی یہ بات
گرما کے مثلِ صاعقۂ طور ہو گیا
"ذمی کا مال لشکرِ مسلم پہ ہے حرام"
فتویٰ تمام شہر میں مشہور ہو گیا
چھوتی نہ تھی یہود و نصاریٰ کا مال فوج
مسلم خدا کے حکم سے مجبور ہو گیا

طبی وفد قسطنطنیہ ہی میں تھا کہ اس حادثہ کا شدید ردِعمل ظاہر ہوا۔ اس حادثے نے ناظم پاشا کے خلاف عوام اور خواص کے جذبات کو انتہائی مشتعل کر دیا۔ اس زمانے کے حالات اور نوجوان ترکوں کے جذبات سے ہندوستان کے اخبارات و رسائل بھرے پڑے ہیں۔ خصوصاً ۱۹۱۳ء کے تین چار مہینوں کے اخبارات میں اس سلسلے کا نہایت قیمتی مواد موجود ہے لیکن ہم یہاں چودھری خلیق الزماں کی کتاب "شاہراہ پاکستان" سے ایک اقتباس پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ چودھری صاحب لکھتے ہیں :

"شیخ عبدالعزیز شاویش ترکی کے ان بگڑے ہوئے حالات میں بھی اسلامی اخوت اور مروت کی بنا پر ترکی کے حالات سنوارنے کے لئے کوشاں تھے۔ اس طرح، جس طرح ہندی مسلمان ترکوں کی خلافت اور ترکی حکومت کو بچانے کے لئے سرگرمِ عمل تھے۔ جس روز کا واقعہ بیان کر رہا ہوں [1]، اس دن ہم میں سے بہت لوگ شیخ شاویش کے مکان پر جو باب عالی کے بالکل سامنے والی چوڑی سڑک پر واقع تھا، جمع تھے، انہوں نے بیان کیا کہ جنگِ بلقان کے متارکہ کے سلسلے میں یہ شرائط طے ہو رہی ہیں کہ ادرنہ بلغاریوں کو تفویض کر دیا جائے اور اس کے ملحقہ علاقہ کو بھی یونان، سرویا اور بلغاریہ میں تقسیم کر دیا جائے۔ اس کے بعد جو یورپ میں ترکی

---

[1] یہ واقعہ وسط فروری کا ہے۔ اس وقت شتلجہ میں اسپتال قائم ہو چکا تھا اور چودھری خلیق الزماں انتظامات کے قیام کے بعد شتلجہ سے استنبول آئے ہوئے تھے اس وقت عبدالرحمٰن شتلجہ کے طبی مرکز میں تھے۔

کا حصہ باقی رہے وہ ترکوں کے پاس رہنے دیا جائے ڈبڈبائی انکھوں
کے ساتھ انہوں نے کہا کاش کوئی ناظم پاشا[1] سپہ سالار اور ناظم حربیہ
کو ختم کر دیتا۔ شعیب نے کہا، وہ اس کے لئے تیار ہیں۔ بات یہیں تک
پہنچی تھی کہ لوگوں نے دیکھا انور بے مع اپنے اے ڈی سی کے اپنی موٹر
کار پر باب عالی میں داخل ہوئے اور چند ہی منٹ بعد تین چار پستول
چلنے کی آوازیں آئیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جتنے لوگ باب عالی کے
قرب و جوار میں بیٹھے تھے وہ سب اسی انتظار میں تھے اور پستولوں کی
آواز سنتے ہی سب باہر نکل آتے۔ انور بے کے لئے دعاؤں کے نعرے
لگنے لگے۔ ہم سب لوگ بھی دوڑ کر نیچے پہنچ گئے اور باب عالی میں گھس
گئے جیسے ہی انور بے باہر نکلے لوگ ان کو چپٹ گئے اور شعیب نے
ان کا بوسہ لے لیا۔ وہ اکیلے ہی اپنی کار میں بیٹھ کر چلے گئے۔ باب عالی
کے اندر اس وقت تین لاشیں پڑی ہوئی تھیں جن میں ایک لاش
ناظم پاشا کی تھی جو کرسی پر مردہ پڑے تھے۔ انور بے جب اندر گئے تو
مجوزہ صلحنامہ منبر پر رکھا ہوا تھا۔ انور بے نے ان سے کہا کہ یہ صلح
ہم کبھی منظور نہ کریں گے۔ اس پر ناظم پاشا نے بگڑ کر کہا "دور ہو
کتے" معاً انور بے کے اے ڈی سی نے ان پر دو فائر کئے اور

---

[1] ناظم و کامل پر حسرت موہانی کا تاثر غزل میں
ہم میں اب بھی کچھ نمونے ناظم و کامل کے ہیں

وہ ڈھیر ہو گئے ۔ اس اثناء میں ناظم پاشا کے اے ڈی سی نے انور بے
پر گولی چلائی وہ تو بچ گئے مگر ان کے اے ڈی سی کو گولی لگی جس نے گرتے
گرتے ناظم پاشا کے اے ڈی سی کو بھی گولی مار کر ختم کر دیا۔''

چودھری خلیق الزماں نے جو واقعہ لفظوں میں بیان کیا ہے ۔ اس واقعہ کی تصویر کیمرے کی آنکھ نے بھی محفوظ کر لی تھی جو ہندوستان کے اخباروں میں بھی شائع ہوئی۔ الہلال کلکتہ کے ۵ مارچ ۱۹۱۳ء کے شمارے میں ایک خاص صفحہ اس تصویر کا لگایا گیا ہے۔ جس میں ناظم پاشا کو گولی کھا کر گرتے ہوئے دکھایا گیا ہے ۔ اس کا اے ڈی سی انور بے کو نشانہ بنانا چاہتا تھا کہ انور بے کے اے ڈی سی نے اسے گولی کا نشانہ بنا دیا لیکن اس نے گرتے گرتے جو فائر کیا اس سے انور بے کے اے ڈی سی بھی ڈھیر ہو گئے ۔ دوسرے حضرات انتہائی سراسیمہ نظر آرہے ہیں لیکن انور بے کے چہرے پر اس وقت بھی انتہائی طمانیت نظر آرہی ہے ۔

یہ خیال پہلے ہی کیا جا رہا تھا کہ متارکہ جنگ جلد ختم ہو جائے گا۔ اس لئے وفد میدان جنگ کو روانہ ہونے کے لئے تیار تھا۔ ۷ ارجنوری ۱۹۱۳ء کی روداد کے بعد چودھری خلیق الزماں لکھتے ہیں :

''دو ایک دن کے بعد ڈاکٹر انصاری نے مجھ سے کہا غالباً متارکہ جنگ
جلد ختم ہو جائے گا اس لئے نسیم عمر پاشا چاہتے ہیں کہ شتلجہ سے دو میل
پیچھے عمرلی میں ہم اپنا اسپتال جلد سے جلد کھولیں لہٰذا تم رضا حسین
کو لے کر جلد سے جلد وہاں چلے جاؤ اور خیمے ڈیرے لگوا کر اپنا سفری
اسپتال بنوا لو۔ تم کو وہاں کام میں لگانے کے لئے بہت سے عسکر

موجود ملیں گے۔ یہ مقام استنبول سے تقریباً ساٹھ میل دور تھا اور ترکی فوجی پڑاؤ سے صرف دو میل اِدھر تھا۔ کہنے کو یہ ایک قریہ تھا۔ مگر پہاڑوں کے بیچ میں چند گھروں کے علاوہ یہاں کچھ نہ تھا۔ اپنے اسپتال کا سامان بھجوانے کے بعد میں اپنے ساتھ رضا حسین کو لے کر صبح تڑکے عمرلی روانہ ہوگیا۔ میرے ساتھ تین چار دن کے کھانے کا سامان تھا جو ریل سے اترتے وقت ہم ریل ہی میں چھوڑ آئے۔ عمرلی میں بہت سے فوجی جوان ہماری مدد کے لئے موجود تھے جنھوں نے فوراً ہمارے لئے خیمے ڈیرے کھڑے کرنے شروع کر دیئے۔ اس وقت تک میں کچھ شد بد ترکی زبان بولنے لگا تھا جس کی وجہ سے فوجیوں سے کام لینے میں بہت آسانی رہی۔ کھانے کے لئے ہمارے پاس سوائے پنیر اور پاؤ روٹی کے اور کچھ نہ تھا۔ پنیر سے مجھے کبھی رغبت نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے میں تین چار دن چائے اور توس ہی پہ گزارا کرتا رہا۔ یوں تو ترکی میں پانی اور کیچڑ بڑی تکلیف دہ صعوبتیں ہیں مگر بلقان میں خصوصیت کے ساتھ دل آزار ہوتی ہیں جہاں سردیہ کی سرد ہوائیں براہِ راست پہنچ کر سارے بلقان کو کرۂ زمہریر بنا دیتی ہیں۔ رات کو خیمہ میں ہم ہیٹر (Heater) لگا کر سوتے تھے اور پھر پوری جوانی کی نیند، مگر سردی کے مارے رات بھر آنکھ کھلتی اور بند ہوتی رہی۔ خدا خدا کر کے چار پانچ دن میں ہمارا سفری اسپتال قائم ہو گیا اور ڈاکٹر انصاری کو سب حالات بتانے کے لئے میں ایک روز

خود استنبول گیا۔"

اسی زمانے میں جب کہ چودھری صاحب شتلجہ سے استنبول آئے ہوئے تھے ناظم پاشا کے قتل کا واقعہ پیش آیا۔ چودھری صاحب لکھتے ہیں :

"انور بے کے جانے کے بعد جریدہ سلطانی جاری ہوا جس میں مشہور و معروف عرب سپہ سالار محمود شوکت پاشا کو وزارتِ عظمیٰ اور نظارتِ حربیہ سپرد کی گئی۔ اور احمد عزت پاشا کو سر عسکر بنایا گیا۔ اس کے بعد متارکہ کا ختم ہونا یقینی ہو گیا اور ہم سب لوگ استنبول سے عمر لی اُٹھ آئے۔ آنے کے دوسرے ہی دِن شتلجہ سے توپوں کی گرج پہاڑیوں سے گونجتی ہوئی ہمارے خیموں میں راتِ دن سنائی دینے لگی۔ دو ایک دن بعد میدانِ جنگ سے ہمارے اسپتال میں مریض بھی آنے شروع ہو گئے۔"

شتلجہ کے میدانِ جنگ کے حالات اور اسپتال میں مریضوں کی خدمت کے بارے میں چودھری صاحب نے اس سے زیادہ کچھ نہیں لکھا۔ اس لئے وہ جلد ہی گیلی پولی کے قریب دوسرے محاذِ جنگ پر چلے گئے اور چناق قلعہ میں طبی مرکز قائم کر کے مصروف علاج ہو گئے۔ البتہ عبدالرحمٰن نے دو خطوں میں جو انھوں نے شتلجہ سے ۲ مئی اور ۳ جون کو اپنی بہن بی بی کوجان (اصلی نام زبیدہ بیگم زوجہ سید تجمل حسین) اور اپنے بھائی محمد اسحٰق کو لکھے تھے ان میں شتلجہ کے میدانِ جنگ اور وہاں کے طبی مرکز کے بارے میں بعض معلومات تحریر کی ہیں۔ ان کے مطالعے سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وسط فروری سے لے کر اُس وقت یعنی شروع جون تک یہ محاذ کھلا ہوا تھا۔ بہن کے نام خط میں عبدالرحمٰن لکھتے ہیں :

"خواہر گل بن! خیریت تو تھی؟ میں تو جنگ کے میدان اور فتح کے انتظار میں مصروف تھا یقین کرو کہ اپنی جان تک کا ہوش نہ تھا۔

بقول غالب:

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی آپ اپنی خبر نہیں آتی!

مجھے جب بھی فرصت ملتی فوراً جنگی حالات کے دیکھنے کے لئے دوڑتا۔ البتہ مجھے عزیزہ سے شکایت ہے۔ آپ کو چاہیئے تھا کہ اس اثنا میں اپنی خیریت اور حالات سے آگاہی دیتی رہتیں۔"

اس خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

"بیچارہ انور بے بھی ہمارے قریب کوئی دو تین میل کے فاصلے پر میدانِ جنگ میں پڑا ہوا ہے ایک مرتبہ اس نے بلغاری فوجوں پر حملہ کر کے ان کو پسپا بھی کر دیا۔ لیکن جو کھیل ہاتھ سے نکل چکا ہو اسے دوبارہ ہاتھ میں لانا آسان کام نہیں ....

میری جان! باوجود گوناگوں مصائب کے شتلجہ کے پہاڑوں کو ہم نے خوب تہہ و بالا کیا کئی مرتبہ برف اور کیچڑ میں گردن اور کمر تک دھنس گئے تھے لیکن جن کا نگہبان اللہ تعالیٰ ہو انھیں کیا پرواہ ہو سکتی ہے۔ اگر ان تکالیف کا حال اپنے کو زبانی سناتا تو آپ کانوں پہ ہاتھ رکھ لیتیں کہ لالہ جان بس! اب ہمیں سننے کی تاب نہیں۔"

بھائی کے نام خط میں لکھتے ہیں:

"میدانِ جنگ ہم سے کچھ دور نہیں ہے۔ اپنے مقام سے جب اکثر

"کام سے فارغ ہو کر پہاڑ پر جاتا ہوں اور طرفین کی گولہ باری کی خوب سیر کرتا ہوں۔ خاص کر تشتلجہ گاؤں سے بلغاری لشکر کی پسپائی اور جنگِ بویوک چکمجہ کا نظارہ بالکل قریب جا کر ہم نے کیا ہے۔ آخر الذکر مقام کو انور بے نے دشمن کو عظیم الشان نقصان دے کر پسپا کیا تھا۔ ایک طرف ترکی جہازوں کی گولہ باری اور پھر طرفین کی توپوں کی گولہ باری ایک عجیب دہشت ناک منظر پیش کرتی تھی۔ جس طرح ہمارے ملازم لالہ دو غان اور چوکیدار کی گرجدار آواز کانوں کو ناگوار گزرتی تھی اسی طرح توپوں کی آواز کانوں کو ناگوار گزرتی تھی۔ اس میدان میں بھی شرکت کرتے ہیں اور ہم میں بس اتنا ہی فرق اور فاصلہ ہے کہ ہم بندوق کندھے پر رکھ کر مورچوں میں قدم جمائیں۔ تاہم بندوق اگرچہ ہمارے کندھے پر نہیں، لیکن ہمارا کام بندوق چلانے سے زیادہ مشکل ہے مگر بہتر ہے۔ خاص کر موجودہ حالت میں۔ آئندہ کے بارے میں اللہ ہی جانتا ہے کہ کیا ہونے والا ہے۔"

یہ حالات اور معلومات تو تشتلجہ کے محاذِ جنگ سے دو میل کے فاصلے پر عمرلی میں اسپتال کے بارے میں تھیں۔ جہاں عبدالرحمٰن زخمی فوجیوں کی خدمت میں مصروف تھے۔ عمرلی[1] میں سردیوں میں سخت سردی پڑتی ہے اور بارش کی کثرت کی وجہ سے موسم اور بھی تکلیف دہ ہو جاتا ہے۔

---

[1] عمرلی میں ایک یادگار پتھر ہندی وفد کی جاں نثاری کے سلسلہ میں لگا ہوا ہے۔ ڈاکٹر ریاض الحسن صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے اسے دیکھا ہے۔

اس کا کچھ تو اندازہ چودھری خلیق الزماں کی تحریر سے ہوتا ہے جس کا ایک اقتباس اوپر گزر چکا ہے۔ غازی عبدالرحمٰن نے بھی بہن کے نام ایک خط میں اس طرف اشارہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں :

"بہن خط میں دریافت کرتی ہو کہ آپ بڑے خوش نصیب ہیں کہ آبنائے باسفورس کے کنارے قیام رکھتے ہیں۔ لیکن آہ! بے خبر ہو۔ گو انسان کو ہر حال میں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے مگر پھر بھی مسافرت کے مصائب و آلام بے پایاں ہوتے ہیں اور آپ جو محض خانگی ناز و نعم میں زندگی بسر کرتی ہیں دنیا کے گرم و سرد، تلخ و شیریں کا اندازہ کس طرح کر سکتی ہیں۔ خیر، بہر صورت آپ کی محبت آمیز اور دلسوزی کی باتیں مجھے از حد متاثر کرتی ہیں۔"

عمرلی میں اسپتال کے قیام کے بعد چودھری خلیق الزماں کو چند ڈاکٹروں کے ساتھ دوسرے محاذ پر بھیج دیا گیا۔ جہاں وہ اپریل کے آخر تک مقیم رہے۔ اس محاذ پر طبی وفد کی خدمات اور دیگر تفصیلات چودھری صاحب نے ضبط کر دی ہیں۔ ان کا مطالعہ بھی افادیت سے خالی نہ ہوگا۔ نیز اس کے تذکرے کے بغیر یہ باب مکمل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اس کا ایک ضروری اقتباس یہاں درج کیا جاتا ہے۔ چودھری صاحب لکھتے ہیں :

"ہمارے ہسپتال (عمرلی) میں دو اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن بہاری اور اور رضا حیدر آبادی بھی شریک ہو گئے۔ یہ دونوں ڈاکٹر براہ راست لندن سے ڈگریاں لے کر ہمارے شریک کار ہو گئے۔ ان کو آتے

کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ ہلال احمر کی طرف سے ڈاکٹر انصاری کو یہ لکھا گیا کہ آپ کے پاس اب ڈاکٹروں کی کافی تعداد ہوگئی ہے اور آپ میں کچھ اور ممبروں کا اضافہ بھی ہوگیا ہے لہٰذا آپ اپنے مشن کے دو حصے کر دیں۔ ایک حصہ عمرلی میں رہ جائے اور دوسرا حصہ استنبول واپس آئے تاکہ اسے ایک دوسرے محاذ پر استعمال کیا جا سکے۔ جو نئے ممبر ہمارے شریک ہوئے تھے ان میں سے دو یعنی آل عمران اور حسن عابد جعفری[1] لندن سے آئے تھے اور عبدالقیوم ہندوستان سے آئے تھے۔ لوگوں میں یہ خبر پہلے سے گرم تھی کہ انور بے ایک دوسرا محاذ کھولنے والے ہیں۔ اس لئے وفد کے ہر ممبر کی خواہش تھی کہ وہ اس محاذِ جنگ کے لئے نامزد کیا جائے۔ ڈاکٹر انصاری نے یہ فیصلہ کیا کہ امروہے کے ڈاکٹر نعیم انصاری کو عمرلی کا انچارج کیا جائے اور ان کے ساتھ ڈاکٹر رضا، ڈاکٹر باری اور ڈاکٹر محمود اللہ ان کے شریک کار ہوں۔ شعیب قریشی اس حصے کے منیجر مقرر کئے گئے۔ دوسرے حصے کے لئے انہوں نے خود اپنے آپ کو انچارج اور ڈاکٹر فیضی، ڈاکٹر عبدالرحمٰن اور ڈاکٹر فواد[1] کو جو ایک مصری ڈاکٹر تھے

---

[1] ان کے بارے میں ڈاکٹر ریاض الحسن لکھتے ہیں: "ڈاکٹر فواد بعد میں پیرس میں مطب کرتے تھے۔ ترکوں کے دوست تھے، پیرس میں ایک مٹھائی (ٹافی) کا کارخانہ بھی کھولا تھا۔ حسن عابد جعفری آکسفورڈ میں اپنی تعلیم چھوڑ کر آئے تھے۔ آگرہ کے رہنے والے تھے۔ مذہباً شیعہ تھے مگر ترکوں کی ہمدردی دامنگیر تھی۔ یہ ڈاکٹر نہیں تھے۔ محض مریض کی مرہم پٹی کرتے تھے انھوں نے بعد کو ایک ماہوار رسالہ "شمع" آگرے سے جاری کیا تھا۔

اپنا شریک کار بنا لیا اور مجھے اس حصے کا مینجر مقرر کیا۔ اس طرح ممبران کی بھی تقسیم ہو گئی۔ عبدالرحمٰن صدیقی کو استنبول میں بہ حیثیت جنرل مینجر مقرر کیا گیا تاکہ وہ دونوں حصوں کی ضروریات کو پورا کرتے رہیں۔ ہم لوگ جو استنبول جانے والے تھے۔ عمرلی سے رخصت ہو کر استنبول آگئے اور احکامات کا انتظار کرنے لگے یہ دن بڑی بے چینی کے تھے خصوصاً اس لئے برف و باراں کا سخت طوفان آیا ہوا تھا اور باہر نکلنا بڑا دشوار تھا۔ بعد از خرابی بسیار ایک دن ہلال احمر کا حکم ملا کہ فلاں گودی سے ہمارا جہاز سات بجے شام کو روانہ ہو گا اس لئے میں نے بڑی کوشش کی کہ اپنا تمام سامان لے کر گودی پر بر وقت پہنچ جاؤں مگر برف باری اس قدر شدت سے ہو رہی تھی اور ہمارا بڑا سامان اس قدر زاید تھا کہ میں وقت پر نہ پہنچ سکا اور اس طرح جہاز کے چھوٹنے میں تاخیر ہو گئی۔ جب جہاز روانہ ہوا تو میں ایک کیبن میں جا کر پڑ رہا کیونکہ دن بھر بھیگنے کی وجہ سے مجھے سخت بخار ہو گیا جب صبح کو میری آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ اس وقت ہمارا جہاز گیلی پولی کے شہر کے مقابل کھڑا ہوا ہے۔ یہ بھی پتہ چلا کہ انور بے گیلی پولی میں مقیم ہیں۔ ڈاکٹر انصاری ان سے ملنے خشکی پر گئے اور دو گھنٹہ بعد آ کر انہوں نے بتایا کہ انور بے کی ساری اسکیم کو چار دن کے طوفان و برف باری نے ناکام بنا دیا کیونکہ غنیم کو اس عرصے میں نئے محاذ اور اچانک حملے کی تجویز کا علم ہو گیا اس لئے انہوں نے ڈاکٹر انصاری کو یہ مشورہ دیا کہ وہ اس جہاز پر تین چار میل

اور آگے بڑھ کر چناق پر اسپتال قائم کرلیں تاکہ یہاں کے نئے محاذ کے مریض ہمارے اسپتال بھیجے جائیں۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ چناق قلعے میں جو ترکی فوجی اسپتال ہے، اس کو ہدایت کردی گئی ہے کہ وہ ہمارے اسپتال کے قائم کرانے میں ہماری پوری مدد کرے اس لئے حسب ہدایت جب ہم چناق قلعے پہنچے تو ترکی اسپتال کے ڈاکٹر اور قلعے کے کچھ فوجی افسران ہمارے استقبال کے لئے کھڑے ملے اور ہم فوراً جہاز سے اترنے کے بعد ترکی اسپتال کی ایک چھوٹی سی عمارت میں مہمان کی حیثیت سے ٹھہر گئے۔ اسپتال کے ڈاکٹر ایک ہنس مکھ، حسین نوجوان توفیق رشدی[1] تھے جن کے اخلاق سے ہم بہت متاثر ہوئے ....

چند دن بعد ہم کو سمندر کے کنارے رہنے کے لئے ایک مکان مل گیا اور اس اثنا میں ہم نے ایک یونانی اسکول کی عمارت میں رات دن کام کرکے اپنا اسپتال الگ کھول لیا۔ دو چار دن تو ہم لوگوں نے برف باری کی بھی پرداہ نہ کی اور برابر کھلے آسمان کے نیچے کام کرتے رہے۔ اب ہمارے اسپتال میں مریض بھی آنے لگے۔ ان کا سب سے پہلا گروہ اندھیری رات میں پہنچا جس کے لئے مجھے کئی گھنٹے گودی میں انتظار

---

[1] توفیق رشدی اراس مصطفیٰ کمال کی حکومت میں وزیر خارجہ بھی ہو گئے تھے۔ ۱۹۵۴ء میں ڈاکٹر ریاض الحسن نے ان سے انقرہ میں ملاقات بھی کی تھی۔

کرنا پڑا۔ اسپتال پہنچ کر ان سب کو غسل دلوا کر اسپتال کے کپڑے پہنائے گئے اور ان کی دیکھ بھال کے لئے پہلی رات میں خود جاگا اور ڈاکٹر فواد نے میری خاطر یہ قبول کیا کہ وہ بھی میرا ساتھ دیں گے۔

اس رات مجھے معلوم ہوا کہ ایک عرب سپاہی بہت زیادہ علیل ہے اور شاید اس کی علالت مہلک ثابت ہو۔ دوسرے دن کسی دوا سے اس کو افاقہ نہ ہوا۔ جب ایک دن اور اسی طرح گزر گیا تو ڈاکٹر انصاری نے مجھ سے کہا کہ چونکہ وہ خود بخار میں مبتلا ہیں لہٰذا اس دن تو نہیں اگلے روز وہ اس کے پاؤں کا آپریشن کر کے سڑا ہوا حصہ کاٹ دیں گے۔ مجھے یہ بھی ہدایت کی کہ اس کو علیحدہ خیمے میں منتقل کرا دوں اور رات بھر میں اس کو برابر برانڈی پلاتا رہوں۔ چنانچہ ان کی ہدایات پر عمل کیا گیا اور چار بجے صبح تک میں نے اس کو برانڈی پلائی اس کے بعد اس نے پینے سے انکار کر دیا اور سورج نکلنے سے قبل اس نے کلمہ پڑھ کر انتقال کیا۔ میں نے اپنے ترکی ملازم جلال کو بلا کر اسے روپیہ دیا کہ وہ کفن دفن کا انتظام کرائے۔ اس نے کہا۔ خلیق بے اس کے لئے کفن کی ضرورت نہیں۔ یہ شہید ہے۔ اس لئے میت ان ہی کپڑوں میں دفن کی گئی۔

ہمارے اسپتال میں دو تین مہینے میں چار پانچ سو مریض آئے مگر سوائے اس ایک واقعے کی اور کوئی موت نہیں ہوئی ......

چناق قلعہ ایک چھوٹا سا شہر ہے جو ایشیا میں درہ دانیال کی دائیں جانب واقع ہے۔ اس کے پہاڑی قلعے سب سے زیادہ مضبوط سمجھے جاتے

ہیں۔ یہاں ہمارے گھومنے پھرنے کے لئے ان قلعوں کے علاوہ اور کوئی مشغلہ نہ تھا۔

میدان میں یہاں ہم شام کو اکثر آجاتے تھے اور فوجی سپاہیوں کے ساتھ فٹ بال کھیلتے تھے۔ یہاں کی آبادی میں کثرت سے ارمنی اور یونانی تھے جو ہم کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔

اس وقت تک اطالیہ کا قبضہ طرابلس الغرب پر ہو چکا تھا۔ جنگ کی آگ ٹھنڈی پڑنی شروع ہو گئی تھی۔ عملی ہمارے اسپتال میں مریضوں کا آنا بند ہو گیا اور ہم کو وہاں کا اسپتال بند کرنا پڑا۔ اس طرح چناق قلعہ میں بھی اپریل کے آخر میں ہم کو اسپتال بند کر کے استنبول واپس جانا پڑا۔"

جیسا کہ اوپر کی تفصیلات سے معلوم ہوا کہ ترکی پہنچنے کے بعد رفتہ رفتہ وفد تین حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ وفد کے چند افراد استنبول میں مقیم تھے اس کے سیکرٹری عبدالرحمن صدیقی تھے۔ باقی ارکان شتنلجہ کے محاذ پر بھیج دیئے گئے تھے ان کے انچارج چودھری خلیق الزماں تھے۔ جب ایک مشن کو گیلی پولی کے محاذ پر بھیجنے کی ضرورت پیش آئی تو شتلجہ کے محاذ پر اسپتال کا انچارج شعیب قریشی کو کیا گیا اور چودھری خلیق الزماں کو ڈاکٹر انصاری اپنے ساتھ لے کر استنبول واپس آئے اور وہاں سے گیلی پولی کے محاذ پر روانہ ہو گئے۔ اس کے سیکرٹری چودھری خلیق الزماں تھے۔ عبدالرحمن صدیقی استنبول میں رہ کر دونوں محاذوں پر وفد کی ضروریات کی فراہمی کا انتظام کرتے تھے۔ جہاں تک محاذِ جنگ پر وفد کے ارکان کی ذمہ داریوں کا تعلق تھا صرف ڈاکٹروں کی نگرانی میں زخمیوں کی مرہم پٹی اور دیکھ بھال تھی۔ لیکن عبدالرحمن پشاوری کا جذبۂ خدمت صرف دائرے کا پابند نہیں ہو سکتا تھا انھیں

جب موقع ملتا وہ اپنی جان سے بے پرواہ ہو کر، میدانِ جنگ میں نکل جاتے اور توپ کے گولوں کی ہلاکت خیزی اور گولیوں کی بارش میں زخمیوں کو تلاش کرتے پھرتے اور جہاں انھیں کوئی ترک زخمی نظر آجاتا اسے اپنی پیٹھ پر لاد کر میدان جنگ سے نکال لاتے اور ہسپتال پہنچا دیتے اور پھر اس کی مرہم پٹی اور خدمت میں مصروف ہو جاتے۔ عبدالرحمن کی یہ ایسی خصوصیات تھیں جو کسی نظر سے چھپی نہ رہ سکتی تھیں۔ ترک سپاہی اور آفیسران کی بے مثالی جرأت اور بہادری دیکھتے اور شاباش اور آفرین پکار اٹھتے۔ ان کے جذبہ خدمت کو دیکھتے، اور عش عش کر اٹھتے لیکن عبدالرحمن لوگوں کی تعریف و تحسین سے بے نیاز صرف ایک فریضۂ اسلامی سمجھ کر زخمیوں کی خدمت میں مصروف رہتے۔

دسواں باب

طبّی وفد کی خدمات اور واپسی

طبی وفد نے جس دلسوزی اور جانکاہی کے ساتھ زخمیوں کی تیمار داری کی۔ ترکوں کے دل پر اس کا بڑا گہرا اثر ہوا۔ وفد کی خدمات کا اعتراف عام سپاہی اور زخمی سے لے کر اعلیٰ فوجی وغیر فوجی حکام اور خلیفہ تک نے کیا۔ عبدالرحمٰن نے ایک خط میں جو انھوں نے شتبلجہ کے طبی مرکز سے ۳ر جون ۱۹۱۳ء میں اپنے بھائی کے لکھا تھا اسی میں وفد کی مقبولیت اور ہردلعزیزی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ہمارے مشن کا کام سب مشن والوں سے خواہ وہ انگریزی ہوں، جرمنی ہوں یا فرانسیسی بہت ہی بہتر ثابت ہوا۔ اب تک ہمارے مشن سے تقریباً چار سو زخمی افراد صحت مند اور توانا ہو کر گئے ہیں۔ اس تعداد میں صرف ایک آدمی جاں بحق ہوا۔ یہ چار سو افراد ہمارے مشن کے صرف ایک حصے سے صحتیاب ہوئے ہیں جو شتبلجہ میں مقیم ہیں۔ مشن کے باقی حصے نے بھی ایسے ہی بے مثل کارنامے انجام دیئے ہیں۔ ایک ماہ قبل موسم کی سختی اور تندی حد کو پہنچ گئی تھی۔ سردی اور برف کا یہ عالم تھا کہ تندرست و توانا آدمی کھڑے کھڑے ٹھنڈا ہو جاتا تھا۔ ان تکالیف اور طوفان باد و برف کے باوجود اللہ تعالیٰ نے

ہمیں محفوظ رکھا اور اس عالم ناممکنات و محالات میں بھی خدمت گزاری کا موقع دیا۔ اس کے مقابلے میں اگر دوسرے یورپین طبی مشنوں میں ۵۰ پچاس زخمی آتے تو ان میں سے چار سردی میں اور دو تیمارداروں کی عدم توجہی کی بنا پر زخموں کی تاب نہ لاکر انتقال کر جاتے۔ یہ مہذب عیسائیوں کی تیمارداری تھی۔

"عساکر عثمانی میں ہمارے خستہ خانہ (ہسپتال) کی شہرت درمان مسیحائی کی طرح پھیل گئی۔ زخمی شدتِ درد میں پکارتے کہ ہمیں خستہ خانہ ہندی میں لے چلو۔

"جب ترکی افراد میں سے کوئی ان زخمیوں کی مزاج پرسی کے لئے آتا اور احوال دریافت کرتا تو تمام زخمی یک زبان ہوکر یہ کہتے کہ یہاں ہمیں اپنے گھروں سے زیادہ آرام ہے اور ہمارے یہ تیماردار ماں باپ سے زیادہ توجہ کے ساتھ ہماری دیکھ بھال اور تیمارداری کرتے ہیں۔

"آج کل تمام ترکی کی زبان پر یہی کلمہ ہے کہ "آفندم ہندی خستہ خانہ چوق ای" (ہندی اسپتال بہت اچھا ہے)۔ جب ترکی کے رہنما اور سربرآوردہ افراد قوم خستہ خانہ ہندی (ہندوستانی اسپتال) کی زیارت کے لئے آتے تو نہایت خلوص و شفقت اور احسان مندانہ نظروں سے دیکھتے اور اعلیٰ فوجی حکام اور غیور ترک بڑی محبت سے ملتے اور نہایت گرمجوشی سے مصافحہ کرتے اور آفرین کہتے۔ بے شمار واقعات ہیں اور ایک طویل داستان ہے، اتنی فرصت نہیں کہ تفصیل سے لکھ سکوں۔"

ترکی میں ہندوستانی مسلمانوں کے اس طبی مشن کی خدمات کا عام طور پر اور ہر حلقے میں اعتراف کیا گیا۔ مشن کے افراد نے جس طرح زخمیوں کی خدمت کی اور اس پر ہر حلقے سے آفرین وتحسین کی صدائیں بلند ہوئیں اس کے بارے میں چودھری خلیق الزمان لکھتے ہیں :

"انجمن ہلال احمر کے تمام ڈاکٹر اور اسٹاف ہمارے بڑے ثنا خواں تھے اور ہر طرح سے ہمارے آرام و آسائش کے لئے کوشاں رہتے تھے۔ بسیم عمر پاشا اور اُن کے بھائی کمال عمر بے یہاں اکثر آتے جاتے رہتے تھے اور تمام مسائل پر اُن سے گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ خالدہ ادیب خانم ترکی کی معروف خاتون تھیں، وہ بہت اچھی ادیب اور روشن خیال تھیں جن سے ہم لوگ اکثر ملا کرتے تھے۔ ترکی عوام میں بھی ہمارے وفد کی کافی شہرت تھی جن کے لئے یہ ایک حیرت انگیز واقعہ تھا کہ ترکوں کی خدمت کے لئے ایک دور دراز ملک سے کوئی وفد آیا ہے اور وہ بھی ایسے زمانے میں جب عرب اور ترک اصلاحات ملک کی اندرونی سیاست پر اثر انداز ہو رہے تھے۔"

چودھری صاحب ایک اور جگہ لکھتے ہیں :

"ہمارے اسپتال کا معائنہ کرنے ترکی افسر اکثر آیا کرتے تھے اور ہمارے یہاں کی صفائی مریضوں کی دیکھ بھال، ان کے کھانے پینے کا سامان اور ان کے ساتھ ہماری خوش اسلوبی اور محبت سے بہت خوش جاتے تھے اس کے علاوہ امریکی اور انگریز ڈاکٹر بھی برابر آتے رہتے تھے اور اپنے تعریفی نوٹ لکھ کر واپس جاتے تھے۔

"یہ سب اس وجہ سے ممکن تھا کہ ہم میں سے ہر ایک میں جذبہ تھا کہ ان کی یہ

خدمات ان کی آخرت کا توشہ ہیں اگر وہ ترکی فوج میں شریک ہو کر لڑ نہیں
سکتے تھے تو کم از کم جو خدمت وہ بجا لا سکتے ہیں اس کو فریضہ کی حیثیت سے
ادا کریں۔ صبح سے رات گئے تک ہم اپنے فرائض منصبی میں مشغول رہتے
تھے اور مریضوں کو کھانا کھلا کر اپنے گھر واپس جاتے تھے۔''

اگرچہ ادرنہ ترکوں کے ہاتھوں سے نکل چکا تھا اور یہ ان کی ملی غیرت کی پیشانی پر ایک بدنما داغ تھا جسے وہ جلد از جلد دھو ڈالنا چاہتے تھے اور اس وجہ سے حالات میں ایک ارتعاش موجود تھا لیکن ۱۹۱۳ء کے آخر میں طبی مشن کی خدمات کی بظاہر کوئی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ عمرلی اور چناق قلعہ دونوں مراکز سے وفد کے تمام ممبران استنبول واپس آ چکے تھے اور وفد کی واپسی کی تاریخ مقرر کر دی گئی تھی۔ اس وقت سلطان محمد خامس خلیفہ ترکی نے وفد کو شرفِ باریابی بخشا۔ ڈاکٹر انصاری کی معیت میں وفد نے دولما باغچہ محل میں سلطان سے ملاقات کی۔ سلطان نے چند الفاظ میں وفد کی خدمات کا اعتراف کیا اور وفد کے ہر ممبر سے ہاتھ ملا کر خدا حافظ کہا۔

چند دن کے بعد طبی وفد ڈاکٹر انصاری کی معیت میں عازم ہندوستان ہو لیکن عبدالرحمن پشاوری اور منظور محمود نے وطن واپس آنے سے انکار کر دیا۔ البتہ عبدالرحمن صدیقی، شعیب قریشی، غلام احمد اور چودھری خلیق الزماں ترکی کی سیر و سیاحت کی غرض سے کچھ مدت کے لیے رک گئے۔

ڈاکٹر انصاری ہندوستان واپس پہنچے تو ان کا پورے ملک میں زبردست خیر مقدم کیا گیا۔ ان کے اعزاز میں جلسے منعقد کئے گئے۔ دعوتوں کا اہتمام ہوا، ان کی خدمت میں سپاسنامے پیش کئے گئے۔ وہ جہاں گئے اور جدھر سے گزرے لوگوں نے عقیدت و احترام سے دیدہ و دل فرش راہ کئے۔

ڈاکٹر انصاری ۴ جولائی کو بمبئی پہنچے۔ مولانا شبلی نعمانی اس وقت بمبئی میں تھے اور ان کے استقبال کے لئے جو ہزارہا افراد بندرگاہ میں موجود تھے ان میں شبلی بھی تھے۔ ڈاکٹر انصاری جوں ہی جہاز کے عرشے پر نظر آئے مسلمانوں کے نعرہ ہائے تکبیر سے گنبد گردوں گونج اٹھا۔ جب وہ جہاز سے اُترے تو مولانا شبلی نے ان کے پاؤں چومنے چاہے جیسے کہ روانگی کے وقت لکھنؤ کے اسٹیشن پر اچانک انہوں نے جھک کر ڈاکٹر انصاری کے قدموں کا بوسہ لے لیا تھا۔ ڈاکٹر انصاری نے معذرت چاہی تو فرمایا۔ "یہ تمہارے پاؤں نہیں اسلام کے مجسمۂ غیرت کے پاؤں ہیں۔"

پھر جب ان کے استقبال اور خیر مقدم کے سلسلے میں بمبئی میں جلسہ ہوا تو اس میں نہایت پُر زور اور سوز و گداز سے ڈوبی ہوئی ایک نظم پیش کی جس میں ڈاکٹر انصاری کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا۔ چونکہ اس نظم کا تعلق اس موضوع ہے اس لئے اس نظم کے بعض اشعار یہاں نقل کرنا بے محل نہ ہوگا۔

خیر مقدم ڈاکٹر انصاری

ادا کرتے ہیں ہم شکر جناب حضرت باری
کہ آئے خیریت سے ممبرانِ وفد انصاری
ہزاروں کوس سے جا کر بھائیوں کی تم نے خدمت کی
یہی تھا درد اسلامی یہی تھی رسمِ غمخواری
فراقِ ملک و ترک خانماں و دوریٔ منزل
خدا کے فضل سے تم نے یہ کڑیاں جھیل لیں ساری

تمہارے روکنے کے واسطے ہنگامہ آرا تھے
صدائے نالہائے درد و جوشِ گریہ زاری
مگر اک جذبہ اسلام نے سب کو شکستیں دیں
کہ سب کو چھوڑ کر پہنچے وہاں بااین گراں باری
جو سچ پوچھو تو تم انصار بھی ہو اور مہاجر بھی!
کہ سب اہلِ وطن کو چھوڑ کر پہنچے پئے یاری
کسی کو خواب میں بھی یہ سعادت مل نہیں سکتی
مریضوں کے لئے وہ آپ کی شب ہائے بیداری
جو سچ پوچھو تو زیبا ہے تمہیں دعوائے آفاقی
کہ تم نے کی ہے ترکانِ مجاہد کی پرستاری
تمہارا ناز اٹھائیں اہلِ ملت جس قدر کم ہے
کہ تم نے غازیانِ دین کی کی ہے ناز برداری
تمہارے سامنے موتی کی لڑیوں کی حقیقت کیا
کہ تم دیکھ آئے ہو ترکی یتیموں کی گہرباری
تمہیں کچھ جاں نوازی ہائے اسلامی کو سمجھو گے
کہ تم دیکھ آئے ہو نصرانیوں کا طرزِ خونخواری
نہیں ہے سوزِ اسلامی کا گو نام و نشاں باقی
تمہارے دل میں ہیں کچھ درد کی چنگاریاں باقی

ابھی یہ نظم ختم نہیں ہوئی قافیہ کی تبدیلی کے ساتھ اس نظم کا دوسرا حصہ یہ ہے۔

مسلمانوں کے تم نے طالع واژوں بھی دیکھے ہیں
نئے سب انقلابِ گردشِ گردوں بھی دیکھے ہیں

تمہارا دردِ دل سمجھیں گے کیا ہندوستان والے
کہ تم نے وہ مظالم ہائے روز افزوں بھی دیکھے ہیں

یتیموں کے سنے ہیں نالے ہائے جاں گزا تم نے
زبانِ بے نوا کے چہرۂ محزوں بھی دیکھے ہیں

گھروں کو لوٹنے کے بعد زندوں کو جلا دینا
بلادِ مغربی کے یہ نئے قانون بھی دیکھے ہیں

مسلمانوں کا قتلِ عام اور ترکوں کی بربادی
نتائج ہائے امید گلیڈسٹون بھی دیکھے ہیں

تمہیں نے غازیوں کے جسم پر ٹانکے لگائے ہیں
شہیدانِ وطن کے جامۂ پرخوں بھی دیکھے ہیں

لہو کی چادریں دیکھی ہیں رخسارِ شہیداں پر
زمیں پر پارہ ہائے سینۂ پرخوں بھی دیکھے ہیں

تمہیں سے کچھ پتا ملتا ہے شیدایانِ ملت کا
کہ تم نے شاہدِ اسلام کے مفتوں بھی دیکھے ہیں

جنونِ جوشِ اسلامی کوئی سمجھا تو تم سمجھے
کہ تم نے لیلیٰ اسلام کے مجنوں بھی دیکھے ہیں

سہارا ہے اگر امید کا اب بھی کوئی باقی
تو تم نے وہ رموزِ قوت مکنون بھی دیکھے ہیں
عجب کیا ہے یہ بیڑا غرق ہو کر پھر اچھل آئے
کہ ہم نے انقلاب چرخ گردوں یوں بھی دیکھے ہیں
دعائے کہنہ سالاں ہے اگر مقبول یزدانی
تو اب دستِ دعا ہے اور یہ شبلی نعمانی

ملک کے اخبارات نے بھی ان کی واپسی پر اداریئے لکھے جن میں ان کے اسلامی جذبات کی تعریف کی۔ ترکوں کی خدمت پر تحسین و آفرین کے پھول برسائے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے الہلال میں ایک شذرہ تحریر فرمایا۔ اس میں لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر انصاری ۴؍ جولائی کو بمبئی پہنچ گئے۔ اپنے خطوط میں انہوں نے لکھا تھا کہ وہ ہندوستان پہنچ کر کوشش کریں گے کہ ملک کا دورہ کریں اور اپنی معلومات سے مسلمانوں کو ترکوں کے متعلق صحیح حالات معلوم کرنے کا موقع دیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ایسا ہوا اور ضروری اور صحیح حالات لوگوں کو معلوم ہو سکے تو یہ اس مشن کا سب سے زیادہ قیمتی نتیجہ ہوگا۔ امید ہے کہ ڈاکٹر انصاری کا لوگ پرجوش استقبال کریں گے اور ان کا یہ سفر ترکوں کے متعلق اشاعت معلومات و حالات کا وسیلہ ثابت ہوگا۔"

گیارھواں باب

تسخیر ادرنہ

ڈاکٹر انصاری کی ہندوستان واپسی کے بعد ادرنہ پر ترکوں کے دوبارہ قبضے کی خبر آئی۔ اس سے ہندوستان کے مسلمانوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ عبدالرحمٰن چونکہ اس وقت ترکی میں تھے اور اس لئے کہ تسخیر ادرنہ کے نظارے کو انہوں نے بہت قریب سے دیکھا تھا۔ انہیں ترکوں کی اس فتح سے جو خوشی ہوئی ہوگی اس کا اندازہ لگالینا کچھ مشکل نہیں۔ اپنی بہن کے نام خط میں قدرے تفصیل کے ساتھ ادرنہ پہ دوبارہ قبضے اور اس کے پس و پیش منظر کا ذکر آ گیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"عزیزی! اس سے قبل کہ کچھ اور حال لکھوں، بہتر ہے کہ آپ کو ادرنہ یعنی ایڈریانوپل کے فتح ہونے کے حالات لکھوں۔ بہن! یاد رکھنا کہ اللہ تعالیٰ کو ظلم و ستم کا شیوہ ہرگز پسند نہیں۔ چنانچہ وہ مظالم اور سفاکی جو درندے بھی نہ کریں وہ ان خونی اور ملعون بلقانیوں نے مقدونیہ کی عورتوں اور بچوں پر کیے۔ ان ناقابلِ بیان مظالم پر آخرکار اللہ تبارک و تعالیٰ کی رحمت جوش میں آگئی۔ اور ابھی کہ رومی لشکر مدِمقابل سے پسپا نہ ہونے پائے تھے کہ ہزاروں لاکھوں خواتین اور معصوم بچوں کی دلدوز آہ و فریاد نے اپنا اثر دکھایا

یعنی یک لخت اُن میں پھوٹ اور اختلاف پیدا کر کے شعلہ غضب اور انتقام پیدا کر دیا اور سر دیا، یونان اور رومانیہ والوں نے اس بلغاری درندے کو گھیر لیا اور اس کو اپنی گرفت میں پکڑ کر کہا۔ ٹھہرو! کہاں جاتے ہو۔ اس پھوٹ کی وجہ یہ تھی کہ بلغاریہ ملعون یہ چاہتا تھا کہ کثیر مال غنیمت جو عثمانیوں کی شکست پر اس کے قبضے میں آگیا تھا اس پر تنہا قبضہ کرلے دوسرے بلقانی باشندے اور لشکر اسے اپنے قبضے میں کرنا چاہتے تھے۔ لہٰذا اس انتقام اور آتش غضب میں آکر وہ لڑنے مرنے پر آمادہ ہوگئے اور آنِ واحد میں بلغاریہ کو پیچھے ڈھکیل دیا۔

اب کیا دیر تھی، ادھر اسلامی لشکر نے جو دلی بورغاس کے میدان میں شکست کھا چکا تھا، اس موقع کو غنیمت جان کر اچانک ماہ جولائی کی ۱۵ ار تاریخ کو ادرنہ پر حملہ کر دیا اور ۲۲ ر جولائی کو حضرت احمد عزت پاشا نے اپنی عاقلانہ تدبیر کی وجہ سے اپنے تمام فوجی دستوں کو انور بے کی ماتحتی میں دے کر روانہ کر دیا۔ اس مرد مجاہد نے اسی تاریخ کو ایڈریانوپل (ادرنہ) میں داخل ہو کر جتنے بلغاری وہاں باقی رہ گئے تھے، سب کو قید کر لیا اور اسی شام عزت پاشا بھی بقایا فوج لے کر ادرنہ پہنچ گئے اور ایک ہی دن میں فوج کے دستے نے ۵۰ میل کی حیرت انگیز مارچ کر کے قرق کلیسا فتح کر لیا۔

پیاری بہن! جانتی ہو کہ اس ملعون کی شکست کا باعث کیا تھا یہ بلغاریہ جس کا نام فرڈننڈ ہے۔ اس شیطان نے فتح کے گھمنڈ میں آکر تمام اسلامی

پرچم جو کہ اسلامی لشکر کی شکست سے ان کے ہاتھ آئے تھے اور ان پرچموں پر آیات کلامِ پاک لکھی ہوئی تھیں، ان پرچموں کو پائے انداز کے طور پر بچھا کر اس پر سے گزر کر فرق کلیسا میں داخل ہوئے تھے۔

ان آیات ربانی کی بے حرمتی اور بہیمانہ ظلم و ستم کی وجہ سے اس کو شکست پر شکست ہو رہی ہے۔ اور اب یہ کم بخت عورتوں کی طرح بیٹھ کر رو رہا ہے۔ کہ کیا تھا اور کیا ہو گیا ہے۔ تیس سال قبل جب بلغارستان سلطنت ترکیہ کا ایک صوبہ تھا اس وقت اسی فرڈننڈ نے ایک صوبے دار کی حیثیت سے قسطنطنیہ میں آکر ترکی رسم کے مطابق سلطانِ وقت کے ہاتھوں کو بوسہ دیا تھا لیکن آج یہی کم بخت فتح کے نشے میں اس قدر مغرور اور بدمست ہو گیا تھا اور سمجھنے لگا تھا کہ میری خدائی ہے۔ نعوذ باللہ من ذلک۔

یارب مباد آں کہ گدا معتبر شود

"آج کے اخبار میں چھپا ہے کہ ایڈریانوپل (ادرنہ) میں جو ۵۰ توپیں، ۵۰ ہزار بندوقیں خود غازی شکری پاشا سے چھین کر لے گیا تھا، وہ سب انور بے کے ہاتھ آئیں یہ سب اس کے ہاتھ آیا ہے جس کی تصویر کے پہلو میں مجھے دیکھتی ہو۔

جس وقت سلاطین عثمانیہ نے یورپ کی فتوحات کا آغاز کیا تھا، سب سے پہلا دار الخلافہ ایڈریانوپل تھا اور بعد میں استنبول کو فتح کیا تھا لیکن افسوس کہ ترکی جرنیلوں کی لاپرواہی اور غفلت سے یہ مقام ان کے ہاتھ سے نکل چکا تھا اور اب اللہ تعالیٰ نے دوبارہ ہمیں یہ مقام عطا کیا کہ آج یہاں تین لاکھ جری فوج میدانِ جنگ میں آراستہ و پیراستہ ہے۔

دیکھتی ہو میری جان کہ اللہ تعالیٰ کے کام کیسے نرالے ہیں۔ کس کو دم مارنے کی مجال ہے۔ تمام دنیا آج حیران ہے کہ کیا تھا اور اتنی جلد کیا ہو گیا۔ یورپ کے عیسائی حیران و ششدر ہیں کہ ترکی، جس کی نمازِ جنازہ وہ تو لی بور غاس کے میدان میں پڑھ چکے تھے دوبارہ کیسے قبر سے نکل آیا لیکن انھیں کیا معلوم کہ ابھی تک سینۂ مسلم میں ذوقِ رزم آرائی باقی ہے اگرچہ دشمن کے دِل میں آتشِ انتقام ابھی سرد نہیں ہوئی ہے لیکن ہمیں اس کی کوئی پروا نہیں اور ذاتِ پاک پر توکل ہے۔ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔

”۲۳ جولائی کو ایڈریانوپل اور دیگر مقامات ہمارے ہاتھ آئے تھے اور اس کے دوسرے روز ۲۴ جولائی کو ترکی کے جشنِ آزادی کا سالانہ دن تھا یعنی نیازی بے اور انور بے نے سلطان عبدالحمید کو تختِ سلطنت سے اُتار کر ملک و قوم کو شہنشاہیت کے ظلم سے نجات دلائی تھی۔ چنانچہ ۲۴ جولائی کو قسطنطنیہ میں عام طور پر چراغاں کا انتظام کیا گیا۔ رات بھر جشن اور خوشیاں منائی گئیں لیکن افسوس! میں کسی خاص کام کی وجہ سے اس جشن میں شرکت نہ کر سکا۔“

ادرنہ پر دوبارہ قبضے اور ادرنہ کے سفر کے بارے میں چودھری خلیق الزماں لکھتے ہیں:

”ہم قسطنطنیہ ہی میں تھے جب معلوم ہوا کہ انور بے اپنی فوج لے کر ادرنہ کی طرف سرعت سے بڑھ رہے ہیں اور بلغاری اسی رفتار سے پیچھے بھاگ رہے ہیں جس رفتار سے ترکی فوج آگے بڑھی تھی وہ اس کا کارنامہ سمجھا گیا اور اس کا ذکر انگریزی اخباروں میں بڑی تعریف سے کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا

کہ بلغاری تقریباً ڈیڑھ دو سو چھوٹی توپیں اور بہت سا سامان جنگ چھوڑ کر ادرنہ سے فرار ہو گئے۔

"استنبول سے جو پہلی گاڑی روانہ ہوئی اس میں عادل بے ادرنہ کے لیئے گورنر بھیجے گئے اور دوسری گاڑی سے ہم چار آدمی یعنی رحمٰن، شعیب، غلام احمد اور میں روانہ ہوئے۔ انور بے، وزیر جنگ بھی اسی گاڑی میں ادرنہ گئے۔ تقریباً نو مہینے بعد ترکوں نے ادرنہ واپس لے لیا۔ وہاں کے ترکوں کی خوشی کا اس وقت اندازہ لگانا دشوار ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچے ترکی فوجیوں کے گھوڑوں کو پانی پلا رہے تھے اور ان کو مل دل رہے تھے۔ گھر گھر چھوٹی چھوٹی لڑکیاں یہ فرائض انجام دے رہی تھیں۔ ہر ایک کے چہرے پر بشاشت اور خوشی کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔

"ہم لوگوں کو ایک اور موقع انور بے سے ملاقات کا مل گیا جب ہم ان کی جائے قیام پر پہنچے۔ اس وقت وہ کچھ بلغاریوں کا کورٹ مارشل کر رہے تھے۔ ہم لوگ ایک چھوٹے سے کمرے میں بٹھائے گئے جہاں ان کا سفری پلنگ بچھا ہوا تھا اور دو تین ٹوٹی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ انور بے آ کر ہم سب سے بغل گیر ہوتے۔ ہم نے ان کو ان کی حیرت انگیز کامیابی پر مبارک باد دی انہوں نے ایک فوجی افسر کو ہدایت کی کہ وہ ہم کو وہ تمام مقامات دکھائیں جہاں ترکوں نے ادرنہ کی مدافعت میں ایک ایک کر کے اپنی جانیں نذر کیں۔ اس کے بعد ہم ان سے بغل گیر ہو کر رخصت ہوئے ادرنہ میں اور ایک دن ٹھہر کر گذشتہ جنگِ ادرنہ کے مختلف محاذوں کا معائنہ کیا۔ مسجد سلیمانیہ جو ترکی فنِ تعمیر

کا ایک بہت بڑا شاہکار ہے، دیکھا۔ بلغاریوں نے کوشش یہ کی تھی کہ شہر سے انخلا سے پہلے وہ اس مسجد کو آگ لگاتے جائیں مگر اس میں ان کو کامیابی نہ ہو سکی۔''

انھیں دنوں مولانا ابوالکلام آزاد نے جنگ کی خبروں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

''موجودہ ترکی وزارت نے نہایت دانش مندی کی تھی کہ ریاست ہائے بلقان میں خانہ جنگی کے آثار دیکھ کر فوج کا متفرق کرنا ملتوی کر دیا تھا۔ ۸ جنوری کو باب عالی نے ڈاکٹر ڈنیف سے فرمائش کی کہ خطِ اینوس ومیڈیا (Enos - media) کے مابین جس قدر زمین ہے فوراً خالی کر دی جائے دوسرے ہی دن فوج کو تیاری کا حکم ملا اور اس نے پیش قدمی بھی شروع کر دی۔ اس فرمائش کے جواب میں ایک بلغاری وکیل صلح کی گفتگو کرنے کے لئے قسطنطنیہ آیا مگر اپنے مشن میں ناکام رہا۔ ۱۲ جولائی کو عثمانی فوج نے حرکت شروع کی۔ ۱۱ جولائی کا تار ہے کہ عثمانی فوج شتلجہ اور بلبیر سے بڑھتی ہوئی بغیر کسی مقابلے کے چارتک پہنچ گئی ہے۔ قسطنطنیہ میں بڑی مستعدی سے جنگی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ فوج توپ خانے اور سامان رسد وغیرہ ایشیائے کوچک سے مسلسل آ رہا ہے۔''

دولت عثمانیہ اور سرویا میں ایک معاہدہ ہے۔ عثمانی بیان کے موجب اس معاہدے کی رو سے عثمانیوں کو تھریس کا ایک بڑا حصہ پھر واپس مل سکے گا اور پھر جب ادرنہ پر ترکوں کے دوبارہ قبضے کی خبر آئی تو مولانا آزاد نے ''تسخیر ادرنہ'' کے عنوان سے ایک مختصر لیکن نہایت پرنور مقالہ افتتاحیہ تحریر فرمایا۔ جس کے شروع کی چند سطریں یہ ہیں:

"ادرنہ مسخر ہوگیا۔ فاتحانِ عثمانی شہر میں داخل ہوگئے۔ دنیا نا امید ہوچکی تھی یورپ سمجھ چکا تھا کہ ترک جاں بلب ہیں اب وہ آرام کے قابل ہی نہیں رہے لیکن قدرتِ کاملہ کے دستِ اعجاز نے اس بیمار نے تندرستوں کو شکست دی۔ ترکوں کا اجتماع ہوتے ہی بلغاری مرعوب ہو کر بھاگ نکلے۔ اپنے استحکامات جو بڑی کوششوں سے استوار کیے تھے اور ان کو ناقابلِ تسخیر سمجھے ہوئے تھے آپ ڈھا دیئے اور خدا کا وعدہ پورا ہوگیا کہ قانون الٰہی کے حدود توڑنے اور تعلیم رسالت کی بے حرمتی کرنے والے انجامِ کار تباہ و برباد و خستہ خراب ہو کر رہیں گے۔"

مولانا ابوالکلام آزاد کے ان جملوں پر غور فرمایئے اور ادھر عبدالرحمٰن کے خط سے جو عبارت نقل کی ہے۔ اس پر دوبارہ نظر ڈالیے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک خیال ہی، ایک ہی اندازِ فکر اور حالات و واقعات پر غور کرنے کے بعد دونوں ایک ہی نتیجہ پر پہنچے ہیں اور ایک ہی سے الفاظ میں دونوں نے اپنے نتائج فکر کا اظہار کر دیا ہے۔

بارھواں باب

ترکی فوج میں شرکت

ڈاکٹر انصاری کا طبی وفد جنگِ بلقان کے خاتمے پر ہندوستان واپس آگیا۔ البتہ سقوطِ ادرنہ کا معرکہ ان کی واپسی کے بعد پیش آیا تھا۔ اس وقت چودھری خلیق الزماں اور ان کے چند ساتھی ترکی ہی میں تھے لیکن سیر و تفریح میں مصروف، چند دن کے بعد وہ بھی ہندوستان واپس ہوگئے البتہ عبدالرحمٰن نے ہندوستان واپس آنے سے انکار کر دیا۔ اس فیصلے میں ان کے ساتھ منظور محمود[۱] بھی تھے۔ یہ دونوں حضرات ترکی میں ٹھہر گئے۔ ان کا جذبۂ خدمتِ ترکی اب کسی نئے میدان کی تلاش میں تھا۔ عبدالرحمٰن نے طبی خدمات کے سلسلہ میں ترکوں سے محبت اور ان کے لئے اپنی فداکاری اور جاں نثاری کا جو نقش ترکی فوج کے افسروں اور دیگر زعما کے دلوں پر فوجی کیا تھا وہ اس سے بالکل مختلف تھا جو ایک کمپونڈر یا تیمار دار کا ہوتا ہے۔ ترکی فوجی افسر اور سپاہی دیکھتے تھے کہ ایک غیر ملکی نوجوان جو اُن کی زبان بھی اچھی طرح نہیں سمجھتا، گولیوں کی بارش میں پیٹ اور سینے کے بل رینگتا ہوا زخمیوں تک پہنچتا ہے اور انھیں پیٹھ پر لاد کر

۱؎ مشہور موسیقار طلعت محمود کے والد۔ رام پور کے رہنے والے تھے۔ ان کی آواز میں پہلے پہل گراموفون کمپنی نے اقبال کا ترانہ مولانا محمد علی کی فرمائش پر تیار کیا تھا۔

احتیاط کے ساتھ میدان کارزار سے نکال لاتا ہے۔ اور پھر نہایت توجہ کے ساتھ ان کی مرہم پٹی میں مصروف ہو جاتا۔ نہ اسے بھوک پیاس کا خیال آتا ہے اور نہ گولیوں کی بوچھاڑ اور توپ کے گولوں کے خوفناک دھماکے اسے دہشت زدہ کرتے ہیں۔ وہ زخمیوں کی زبان کو بھی نہیں سمجھتا لیکن ان کے زخموں کی زبان سے وہ آشنا ہے۔ اسے زخم اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں اور وہ ان کے مداوے کے لئے دل وجان سے مصروف ہو جاتا ہے۔ فوجی افسر اور سپاہی اس پر تحسین وآفرین کے پھول برساتے ہیں اور رشک ومحبت کی نظروں سے دیکھتے ہیں لیکن وہ ان تمام باتوں سے بے نیاز اپنے فرائض کی ادائیگی میں مصروف رہتا ہے۔

اس دوران میں بہت سے فوجیوں سے عبدالرحمٰن کا تعارف ہو چکا تھا۔ وہ ان سے محبت کرتے تھے۔ انھیں اپنے دل میں جگہ دیتے تھے۔ ان کے لئے اپنی آنکھیں فرشِ راہ کرتے تھے۔ جن ترکی فوجیوں اور زعما سے ان کا تعارف ہوا تھا ان میں حسین رؤف بے بھی شامل تھے۔ ان سے تعلقات کیا ہوئے زندگی بھر کا رشتہ قائم ہو گیا۔ غازی انور پاشا سے بھی اسی زمانے میں تعلقات قائم ہو گئے تھے۔

اب سوال یہ تھا کہ عبدالرحمٰن زندگی کے کس گوشے کو اپنائیں اور اپنی عملی صلاحیتوں سے ترکی اور ترک قوم کو فائدہ پہنچائیں۔ عبدالرحمٰن سیاسی مزاج رکھتے تھے۔ انگریزوں کے خلاف ہندوستان ہی سے ان کے دل میں نفرت اور بغاوت کے جذبات موجود تھے جنگِ بلقان میں انگریزوں کی ابلیسانہ روش نے انھیں اور بھی برافروختہ کر دیا تھا عبدالرحمٰن کی تربیت اور تعلیم جس گردوپیش میں ہوئی تھی اس میں اسلامی قومیت کا تصور ان کے ذہن ودماغ میں جاگزیں ہو گیا تھا۔ ترکی میں اچھا خاصا طبقہ خالص ترک قومیت کے نقطۂ نظر سے سوچنے والا اور سرگرمِ عمل تھا۔ عبدالرحمٰن ترکی قومیت کے محدود تصور سے بہت بلند تھا۔

وہ اس تصور کو مسلمانانِ عالم کے وسیع تر مفاد کے پیشِ نظر پسند نہیں کرتے تھے۔ اس لیے سب سے پہلا میدان تو ان کے لیے عملی سیاست کا تھا۔ عبدالرحمٰن ایک وسیع تر اسلامی قومیت کے تصور کے مطابق ترکی کی سیاست میں حصّہ لے سکتے تھے۔ اس نقطۂ نظر کے مطابق ملک میں کام کرنے والی جماعتیں اور افراد بھی موجود تھے۔ ان کے ساتھ مل کر وہ ترکی کی بہترین اسلامی و قومی خدمت انجام دے سکتے تھے لیکن ترکی اس وقت جن حالات سے گزر رہا تھا اور جن خطرات میں گھرا ہوا تھا اور مصائب و آلام کے جو بادل اس کے سر پر منڈلا رہے تھے ان کا تقاضا تھا کہ اس قسم کے ہر اقدام اور سعی سے باز رہا جائے جس سے ترکی قوم میں اتحاد و اتفاق کو نقصان پہنچے۔ اگرچہ جنگِ بلقان ختم ہو چکی تھی اور ۱۹۱۳ء کے اواخر میں مختلف معاہدات کے بعد حالات بظاہر پرسکون نظر آنے لگے تھے لیکن عالمی سیاست کی جو ہوائیں چل رہی تھیں ان میں جنگ کی بو سونگھی جا سکتی تھی اور پیشین گوئی کی جا سکتی تھی کہ یورپ میں جلد ہی ایک طوفانِ جنگ آنے والا ہے اور اس سے ترکی الگ تھلگ نہیں رہ سکتا۔ ترکی ان حالات کا مقابلہ اس صورت میں کر سکتا ہے جب وہ سیاسی اور فوجی طور پر مستحکم ہو۔

جہاں تک ترکی کے سیاسی استحکام کا تعلق ہے، محمود شوکت پاشا، جو ناظم پاشا کے قتل کے بعد ۱۹۱۳ء کے شروع میں وزیرِ اعظم بنائے گئے تھے، انور بے، طلعت پاشا اور جمال پاشا سے مل کر ملک کی کشتی کو سیاسی منجدھار سے صحیح سلامت نکال کر کنارے تک پہنچانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ فوجی طور پر ملک کو مستحکم کرنے اور فوج کی جدید تنظیم کے لئے ترکی نے جرمنی سے ایک معاہدہ کیا تھا جس کے تحت لیمان فان سانڈرس نامی جرمن فوجی ماہر کو قسطنطنیہ میں ترکی افواج نمبر ا کا سپہ سالار بنا دیا گیا تھا اور فوج کی تنظیم جدید کے سلسلے میں اسے وسیع اختیارات دیئے گئے تھے۔ روس ان کوششوں پر سخت چراغ پا ہوا۔ فرانس نے

روس کی ہمنوائی کی اور پھر برطانیہ نے بھی ترکی میں جرمنوں کو وسیع اختیارات دینے پر ترکی حکومت کو تنبیہہ کی۔ ترکی نے جرمن حکومت کے مشورہ سے اس کا حل یہ نکالا کہ لیمان کو فوج کی سپہ سالاری کے عہدے سے ہٹا کر انسپکٹر جنرل کے عہدے پر مقرر کیا۔ اب بظاہر اس کے احکام نے مشوروں کی صورت اختیار کر لی لیکن فی الحقیقت اس کے مشوروں کی حیثیت فوج کے اعلیٰ کمان کے فیصلوں اور حکموں کی تھی۔ دوسری طرف بحریہ کا مشیر ایک انگریز کو مقرر کیا گیا۔

ان حالات میں غور و فکر اور دوستوں کے مشورے کے بعد عبد الرحمٰن نے فوج میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ اس فیصلے کے بعد منظور محمود نے ترک بحریہ کے کالج میں اور عبد الرحمٰن نے بری فوجی کالج میں داخلہ لے لیا۔ منظور محمود نے کچھ عرصہ گزارا تھا کہ ان کی صحت خراب رہنے لگی اور بالآخر انھیں مجبوراً وطن واپس آنا پڑا۔ عبد الرحمٰن پہلے قسطنطنیہ میں، پھر بیروت میں فوجی تعلیم و تربیت حاصل کرتے رہے تا آنکہ ۴ اگست ۱۹۱۴ء کو جنگ عظیم چھڑ گئی۔ ترکی کی خارجی سیاست کا دار و مدار روس کی خارجی سیاست پر تھا۔ چونکہ روس صدیوں سے استنبول اور آبنائے باسفورس پر قبضے کا خواب دیکھتا تھا اس لئے وہ ترکی کا دشمن چلا آتا تھا۔ اس لئے جب روس برطانیہ اور فرانس کی طرف سے جنگ میں شریک ہو گیا تھا تو بقول انور بے ترکی کے لئے جرمنی کا ساتھ دینے کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس طرح ۲۹ اکتوبر کو ترکی نے روس، برطانیہ اور فرانس کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا اور تمام فوجی تربیت یافتہ اور زیر تربیت محاذ پر بھیج دیئے گئے۔

عبد الرحمٰن ابھی بیروت میں فوجی کالج میں تھے اور فوجی تعلیم و تربیت ختم بھی نہ ہوئی تھی لیکن وقت کا تقاضا تھا کہ عبد الرحمٰن کی فوجی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھایا جائے۔ چنانچہ انھیں لفٹنٹ کا عہدہ دے کر ترکی کے خطرناک ترین محاذِ جنگ درہ دانیال پر بھیج دیا گیا۔

عبدالرحمٰن کے لئے لفٹننٹ کا عہدہ فی الحقیقت ترکی سے ان کی محبت اور ان کی فوجی صلاحیتوں کا اعتراف تھا۔ اس لئے بقول حسین رؤف بے، ترکی میں کسی فوجی عہدے پر فائز ہونا کوئی آسان بات نہیں۔ مصطفیٰ کمال پاشا کی مثال سامنے ہے۔ بے شمار کارہائے نمایاں انجام دینے کے باوجود جب وہ درۂ دانیال کے محاذ پر فوج کی کمان کر رہے تھے تو میرالائی یعنی کرنل کے عہدہ پر فائز تھے۔ عبدالرحمٰن ایک غیر ملکی تھے۔ وہ ترک نہ تھے۔ ان کی فوجی تربیت بھی مکمل نہ ہوئی تھی لیکن ترکوں سے ان کی وفاداری شک وشبہ سے بالا اور فوجی صلاحیتوں کے لحاظ سے وہ غیر معمولی شخصیت کے حامل تھے اس لئے اگر انھیں کالج سے نکلنے اور میدانِ جنگ میں کارہائے نمایاں انجام دینے سے قبل ہی لفٹننٹ کے عہدہ سے سرفراز کر دیا گیا تو اس پر تعجب نہ کرنا چاہیے۔ بعد میں عبدالرحمٰن نے اپنی بے مثل بہادری اور فوجی صلاحیتوں سے ثابت کر دیا کہ وہ واقعی اس عہدے کے اہل تھے۔

عبدالرحمٰن نے جنگِ عظیم اول کے دوران ترکی میں جو خدمات انجام دی تھیں وہ نہایت عظیم الشان تھیں یہ خدمات میدان سے لے کر سفارتی مشن تک پھیلی ہوئی تھیں۔ جنگی محاذ پر اپنی بہادری اور فوجی سوجھ بوجھ کی بنا پر انھوں نے اپنے آفیسروں اور ساتھیوں کے دل مٹھی میں لے لئے تھے اور جب سفارتی مشن پر وہ جرمنی اور بغداد بھیجے گئے تو انھوں نے اپنی سیاسی سوجھ بوجھ، معاملہ فہمی اور ترکی کے لئے اپنے جذبہ بہی خواہی کے ایسے انمٹ نقوش ترکی زعما کے دلوں پر ثبت کئے کہ ان میں سے ہر کوئی عبدالرحمٰن کی صلاحیتوں کا قائل ہو گیا۔

تیرھواں باب

اوّل جنگِ عظیم

اول جنگِ عظیم کے دوران عبدالرحمن نے ترکی کی عظیم الشان خدمات انجام دیں۔ کالج سے نکلتے ہی انھیں درہ دانیال کے محاذ پر بھیج دیا گیا۔ درہ دانیال کی حیثیت ترکی کے دروازے کی تھی۔ اگر دشمن درہ دانیال میں داخل ہو جاتا تو پھر قسطنطنیہ پر اسے قبضہ کرنے سے روکنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ اگرچہ مارچ ۱۹۱۵ء سے پہلے اس محاذ پر امن رہا لیکن اس کی فوجی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس وقت تک جنگ کا زور دوسرے محاذوں پر تھا اور درہ دانیال پر سکون تھا۔ لیکن یہ سکون زیادہ دنوں تک قائم نہ رہا۔ برطانیہ نے قسطنطنیہ پر قبضہ کر لینے کا منصوبہ بنایا تاکہ ترکی فوج کی شہ رگ کو کاٹ دیا جائے اور روس سے براہ راست سلسلہ قائم ہو جائے۔ اس منصوبہ کے تحت ۱۸ / مارچ ۱۹۱۵ء کو انگریزوں اور فرانسیسیوں نے اپنے جنگی جہازوں کے بل پر درہ دانیال میں داخل ہونے کی کوشش کی۔ ترکی فوج چونکہ اس حملے کی پہلے سے متوقع تھی، اس لئے پوری طرح مستعد تھی۔ درہ دانیال میں پہلے ہی سے بحری سرنگیں پھیلا دی گئی تھیں۔ برطانوی جنگی جہاز جوں ہی ان سرنگوں سے ٹکرائے تباہی مچ گئی۔ ٹھیک اسی وقت ساحل سے نہایت شدت کے ساتھ گولہ باری شروع کر دی گئی۔ برطانوی اور فرانسیسی بیڑے کے لئے بحری سرنگوں

کی ہلاکت خیزی اور ترکی فوج کی گولہ باری نے قیامت برپا کر دی۔ آگے بڑھنے میں ایک طرف بحری سرنگوں کا خوف تھا دوسری طرف بچ نکلنے کے امکان کی بنا پر خطرہ مول لیتے ہوئے ترکی فوج کی گولہ باری کی زد میں ان سے بچ کر نکل جانا محال تھا۔ فرانسیسی اور برطانوی جنگی بیڑے نے آگے بڑھنے کی بہت کوشش کی لیکن اسے ناکام و نامراد واپس ہونا پڑا اور درۂ دانیال کے راستے سے قسطنطنیہ پر قبضہ کے ارمان کو دل سے نکال دینا پڑا اس معرکہ میں انگریزوں کے سات جہاز سمندر میں غرق ہو گئے لیکن ترکوں کا کوئی بڑا فوجی نقصان نہیں ہوا۔ عبدالرحمٰن درۂ دانیال کے اس معرکے میں شریک تھے۔

درۂ دانیال کے راستے قسطنطنیہ پر قبضہ سے مایوس ہو کر انگریزوں نے جزیرہ نمائے گیلی پولی کے شمال و جنوب میں مختلف مقامات پر اپنی فوجیں اتارنی شروع کر دیں۔ ۲۵ر اپریل کو گیلی پولی کے بالمقابل یورپ کے ساحل پر فرانسیسی فوج اتری۔ گیلی پولی کے جنوبی سرے پر برطانوی فوج آتاری گئی۔ یہ فوج ابھی مورچے بنانے ہی میں مصروف تھی کہ ترکی فوج کی دو کمپنیوں نے جو یہاں تعینات تھیں، انھیں آلیا دست بدست جنگ ہوئی اور ترکی فوج نے ان کا صفایا کر دیا۔ گاباتپہ کے مقام پر کافی تعداد میں برطانوی فوجیں اترنے میں کامیاب ہو گئیں۔ یہاں چونکہ ترکوں کی کوئی فوج تعینات نہیں تھی صرف دیکھ بھال کی فوجی چوکیاں تھیں اس لئے فوری طور پر انھیں وہاں سے بھگانے میں مشکلات پیش آئیں۔ بالآخر انھیں مار بھگانے میں ترک فوجیں کامیاب ہو گئیں۔ ۱۸ر دسمبر کو برطانوی فوجیں گیلی پولی کے شمال مقامات سے اور ۸ر جنوری ۱۹۱۶ء کو جنوبی نقاط سے باصد حسرت و یاس واپس لوٹنے پر مجبور ہو گئیں۔

مرتضیٰ احمد خاں مصنف تاریخ اقوام عالم کا بیان ہے کہ "گیلی پولی کے معرکہ میں

برطانوی افواج کو جس تباہی کا سامنا ہوا اس کی نظیر برطانیہ کی ساری تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔"
ایک انگریز مصنف نے اس شکست کو "شاندار پسپائی" کے نام سے تعبیر کیا ہے۔

درۂ دانیال کے معرکے کے بعد گیلی پولی کے ان معرکوں میں بھی عبدالرحمٰن شریک رہے تھے اور انہوں نے اپنی بہادری اور ترکوں سے محبت اور جذبۂ جاں نثاری سے اپنے افسروں کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔ وہ کئی محاذوں میں جنگ میں شریک تھے۔ ان معرکوں میں ان کی بے مثال بہادری کا حال حسین رؤف بے بیان کرتے تھے کہ میدان جنگ میں عبدالرحمٰن تین دفعہ زخمی ہوئے۔ وہ فرماتے تھے۔

"جنگِ عظیم کے دوران ایک دفعہ ہم علاقہ کردمیں پھنس گئے۔ رات کا وقت تھا، اور عبدالرحمٰن پیچش میں مبتلا تھے۔ ہمارے پاس آدمی کم ہونے کی وجہ سے پہرہ بڑی احتیاط سے لگایا گیا تھا۔ ایک طرف سے خاص طور پر خطرہ تھا اور بہت چوکنا اور مستعد رہنے کی ضرورت تھی۔ عبدالرحمٰن نے کہا کہ اس سمت میں وہ خود پہرہ دیں گے۔ ہر چند انھیں سمجھایا کہ وہ بیمار ہیں۔ انھیں آرام کی ضرورت ہے وہ ایک آدھ دن قدرے آرام کریں اور اپنے آپ کو خطرہ میں نہ ڈالیں۔ لیکن عبدالرحمٰن نے کسی کی نہ سنی اور اپنی صحت اور جنگ کے خطرات کی پرواکئے بغیر دو تین فوجیوں کو لے کر اس سمت میں روانہ ہو گئے۔ ہم ان کی طرف سے سخت پریشان تھے۔ لیکن عبدالرحمٰن کو کسی قسم کی پریشانی نہ تھی اور نہ کسی بات کی پروا۔ ان کے جانے کے بعد اس سمت سے فائرنگ کی آواز آئی اور پھر خاموشی طاری ہو گئی۔ اس سے ہماری تشویش میں بھی اضافہ ہو گیا۔ صبح تک ہمیں انتظار رہا کہ کوئی خبر آئے لیکن جب کسی قسم

کی کوئی اطلاع نہ پہنچی تو ہم نے سمجھ لیا کہ عبدالرحمٰن اور ان کے ساتھی شہید ہو گئے لیکن دوپہر کے قریب ایک آدمی آیا اور اس نے بتایا کہ تمہارا ایک آدمی ہسپتال میں زخمی پڑا ہے۔ مجھے عبدالرحمٰن کا خیال آیا اور میں فوراً ہسپتال کی طرف روانہ ہو گیا دیکھا کہ واقعی عبدالرحمٰن ہیں اور زخمی پڑے ہیں۔ مجھے دیکھ کر ہنس دیئے اور کہا، رؤف! پریشان نہ ہونا۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بس معمولی سی چوٹ آئی ہے۔ لیکن ڈاکٹر نے بتایا کہ پیٹ میں دائیں جانب گولی لگی ہے اور اگرچہ حالت خطرے سے باہر ہے لیکن زخم کافی ہے۔"

جنگ کے زمانہ میں جو کئی سال پر پھیلا ہوا ہے، عبدالرحمٰن نے کس قسم کی زندگی گذاری تھی اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ دو برس تک انہوں نے صرف ایک قمیص میں گزر کی تھی اس پر کھانے کی حالت کا قیاس کیا جا سکتا تھا کہ کس قسم کا اور کیسا کھانا ملتا ہو گا۔ دو سال تک دودھ کی شکل دیکھنے کو ترس گئے۔ خود بیان کرتے تھے کہ جنگ کے دوران میں انھیں جرمنی جانے کا اتفاق ہوا۔ بازار سے گزرتے ہوئے ایک دکان پر نظر پڑی، بڑی بڑی بوتلیں دودھ سے بھری ہوئی لٹک رہی تھیں فوراً خریدنے کے لئے دوڑ پڑے لیکن جب انھیں معلوم ہوا کہ پانی کو سفید رنگ دے کر بوتلوں میں بھرا ہے تو سخت مایوسی ہوئی۔ عبدالرحمٰن کہا کرتے تھے کہ اس وقت دل کو جو صدمہ ہوا تھا، وہ کبھی فراموش نہ ہو گا۔"

عبدالرحمٰن کے بیان سے یہ اندازہ تو ہو گیا کہ جرمنی کا سفر انھیں ۱۹۱۶ء کے آخر میں پیش آیا تھا لیکن مقصد سفر کو انہوں نے ہمیشہ راز ہی رکھا، اسے کبھی ظاہر نہ ہونے دیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جنگ کے دوران میں انھیں جان جوکھوں میں ڈال کر کسی اہم سیاسی یا فوجی مشن پر بھیجا گیا ہو گا۔ بہر حال مقصد سفر کچھ بھی ہو، دو باتیں بالکل صاف ہیں :

اولاً : ان کی سیرت پر حکومت اور فوج کے اعلیٰ حکام کا کلی اعتماد۔

ثانیاً : ان کے تدبر پر ترکی کے اعلیٰ حکام اور فوجی آفیسروں کا کامل یقین۔

فی الحقیقت کسی شخص کی سیرت اور تدبر کو کسی ملک اور قوم کا یہ بہت بڑا خراجِ تحسین تھا جو ترکی کے ملک اور ترک قوم نے عبدالرحمٰن کو پیش کیا۔

سب سے پہلے ۱۹۱۵ء میں جنگِ عظیم کے دوران میں وہ رؤف بے کی سربراہی میں ایک مشن میں شریک ہوئے جو افغانستان بھیجا گیا تھا اگرچہ یہ مشن اپنی منزل تک نہ پہنچ سکا اور اپنے مقصد میں ناکام رہا لیکن عبدالرحمٰن کی بدولت یہ مشن گرفتار ہوکر انگریزوں کے ہاتھ پڑ جانے سے بچ گیا۔ ظفر حسن ایبک ان معلومات کی بناء پر جو انھوں عبدالرحمٰن سے ۲۲-۱۹۲۱ء میں حاصل ہوئی تھیں۔ لکھتے ہیں :

"پہلی جنگِ عظیم کے دوران ۱۹۱۵ء میں ترکی کا ایک فوجی وفد ترکی کے مشہور سورما اور بحری افسر رؤف بے کی سرکردگی میں ایران کے راستے افغانستان بھیجا گیا تھا۔ رؤف بے نے جنگِ بلقان میں حمیدیہ کروزر (Cruiser) کے کمانڈر کی حیثیت سے یونانی جنگی اور تجارتی بیڑے پر چھاپے مار کر یونان کے دانت کھٹے کر دیئے تھے۔ متارکہ جنگ کے بعد انگریزوں نے انھیں قید کر کے مالٹا بھیج دیا تھا۔ وارسائی کے صلح نامے پر دستخط ہونے کے بعد وہ ۱۹۲۰ء میں چھوٹ کر ترکی واپس گئے۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں وہ انگلستان میں ترکی سفیر تھے۔ وہ ۱۹۲۲ء میں ترکی کی جنگِ آزادی ختم ہونے پر پہلی حکومت کے وزیر اعظم بھی بنے تھے۔ رؤف بے نے عبدالرحمٰن کو بھی ان کے افغانی اور فارسی زبان جاننے کی وجہ سے اس وفد میں شریک کر لیا تھا۔

ایران کے مغربی علاقے میں اس وفد کا ایک انگریزی فوجی دستے سے سامنا ہوا۔ عبدالرحمٰن نے خشکی کے راستے حج کو جانے والے کچھ افغانوں کو جو اتفاقاً اس وقت وہاں موجود تھے۔ جمع کر کے بہت دلاوری سے اس دستے کا مقابلہ کیا اور وفد کے ممبروں کو انگریزوں کے ہاتھ پڑ جانے سے بچا لیا۔ عبدالرحمٰن اس جھڑپ میں بھی زخمی ہو گئے تھے لیکن انگریزوں کے اس فوجی دستے کے ناکام رہنے کے باوجود رؤف بے کا یہ وفد ایران میں قدم جما کر افغانستان کی طرف نہ بڑھ سکا اور ترکی لوٹنے پر مجبور ہوا۔"

۱۹۱۶ء کے وسط میں انہیں ایک سفارتی مشن پر بغداد بھیجا گیا۔ اس مشن کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے جنگِ عظیم میں عراق کے حالات اور ترکی خلافت کے خلاف برطانوی ریشہ دوانیوں کی تاریخ پر ایک نظر ڈال لینی چاہیئے۔

نومبر ۱۹۱۴ء میں برطانوی اعلان کے مطابق مسلمانوں کو یقین دلایا گیا تھا کہ حجاز، شام وغیرہ کے علاوہ دیگر مقاماتِ مقدسہ کا احترام کیا جائے گا اور برطانوی حکومت عراق پر ہرگز قبضہ نہیں کرے گی لیکن اس اعلان کی دھجیاں اس طرح بکھیری گئیں کہ:

۱۔ ۲۲ر نومبر ۱۹۱۴ء کو بصرہ پر قبضہ کر لیا گیا جو عراق کی بندرگاہ ہے اور ایک زیارت گاہ بھی۔

۲۔ مارچ ۱۹۱۵ء میں انگریزوں نے عراق کو سر کرنے کی مہم اختیار کی۔ جنرل ٹاونشنڈ کی کمان میں برطانوی فوجیں قط العمارہ تک آگے بڑھ گئیں۔ جہاں ترکوں نے ان کی ساری فوج کو جو ڈیڑھ دو لاکھ کے قریب تھی گھیرے میں لے لیا۔ ۸ر دسمبر ۱۹۱۵ء کو یہ محاصرہ شروع ہوا تھا اور ۱۹ر اپریل ۱۹۱۶ء کو جنرل ٹاونشنڈ ۱۰۰۰۰ ہزار لشکر

جرار کے ساتھ ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گیا۔

۳۔ ۲۲ نومبر ۱۹۱۵ء کو عراق کی مشہور زیارت گاہ سلمان پاک پر حملہ کیا گیا جہاں حضرت سلمان فارسیؓ کا مزار ہے۔

۴۔ جنرل ٹاونشنڈ کا ہتھیار ڈالنا انگریزوں کی ایسی شکست تھی کہ وہ عراق پر فوجی کاروائی کرنے میں پس و پیش کرنے لگا۔ فوجی محاذ پر ترکوں نے انھیں ایسا سبق دیا تھا کہ وہ اسے بھول نہ سکتے تھے لیکن جو کام ٹاونشنڈ کا ڈیڑھ دو لاکھ کا لشکر جرار نہ کر سکا تھا اسے برطانوی سیاست گری نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ انجام دے دیا۔ فوجی محاذ پر شکست کھاتے ہی برطانیہ نے عراق میں عربی قومیت کے پردے میں ریشہ دوانیوں کا بہت وسیع پیمانے پر جال بچھانا شروع کر دیا۔ ترک اس سے بے خبر نہ تھے لیکن برطانیہ کی شاطرانہ چالوں نے ترکوں کو ایک حد تک بے بس اور عراق کے امراء و حکام کی عاقبت نااندیشیوں نے ترکوں کے لئے بہاں مشکلات پیدا کر دی تھیں۔ انگریزوں کے کام کو نہایت آسان اور اُن کے لئے عراق کو تر نوالہ بنا دیا تھا۔

اس نازک موقع پر عراق کے امراء و رؤساء کو ان کی عاقبت نااندیشیوں پر متنبہ کرنے اور برطانوی سیاست گری سے انھیں ہوشیار کرنے اور ان ریشہ دوانیوں کا توڑ کرنے کے لئے ترکی زعماء کی نظر انتخاب عبدالرحمٰن پر پڑی۔ ان حالات میں ان کے نزدیک عبدالرحمٰن ہی ایک ایسا شخص تھا جو ان کے اعتماد پر پورا اترتا تھا اور ان اہم اور نازک ذمہ داریوں کے ساتھ بحسن و خوبی عہدہ برآ ہونے کی اہلیت بھی رکھتا تھا۔ چنانچہ عبدالرحمٰن بغداد گئے۔ وہاں کے با اثر لوگوں سے ملاقاتیں کیں اور ان نازک حالات میں اسلام اور ملتِ اسلامیہ کی بقا اور بہبود کے سلسلے میں ان کی ذمہ داریوں کی طرف ان کی توجہ دلائی۔ اس موقع پر ایک دفعہ

آپ نے بغداد کے سیدوں سے ملاقات کی اور انھیں حالات سے باخبر کیا اور انھیں اسلامی ذمہ داریوں کا احساس دلایا۔ چونکہ عبدالرحمٰن ان سے ترکی زبان میں بات چیت کر رہے تھے اور جس لہجے میں اور جس روانی کے ساتھ ترکی بول رہے تھے اس لئے انہیں یہی خیال ہوا کہ عبدالرحمٰن ترک ہیں۔ ان کی شکل و شباہت نے ان کے ترکی ہونے کا سیدوں کو اور بھی یقین دلایا۔ سیدوں کی گفتگو سے انھیں پوری طرح اندازہ ہو گیا کہ برطانوی سیاست گری کس حد تک اپنا کام کر چکی ہے۔ عبدالرحمٰن نے ترکی زعما کے سامنے اپنے اس مشن کی رپورٹ پیش کی۔ انھیں جو ذمہ داری سونپی گئی تھی اسے انھوں نے بحسن و خوبی پورا کر دیا۔ لیکن حالات اتنے نازک ہو چکے تھے کہ اب ان کا کوئی علاج نہ تھا۔ بقول مرتضیٰ احمد خاں :

"اس وقت تک برطانوی ڈپلومیسی کی ریشہ دوانیاں عراق کے عربوں کو اپنا حلیف اور ترکوں کا دشمن بنانے میں کامیاب ہو چکی تھیں۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ۱۲ دسمبر ۱۹۱۶ء کو سر اسٹینلے ماڈ (Sir Stanely Maud) کی کمان میں جب دوبارہ برطانوی فوجوں نے عراق کی طرف پیش قدمی شروع کی تو اس کا یہ اقدام کامیاب رہا اور عربوں کی مدد سے برطانوی سپاہ نے ۱۰ مارچ ۱۹۱۷ء کو بغداد پر قبضہ کر لیا۔"

چودھواں باب

اوّل جنگ عظیم کے بعد

اگست ۱۹۱۸ء میں جرمنی نے فرانس کے محاذ پر شکست کھائی۔ جرمنی کی اس شکست نے اتحادیوں کے حق میں جنگ کا فیصلہ کر دیا۔ ۲۹ ستمبر کو بلغاریہ نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اسی مہینے برطانیہ اور فرانس نے دمشق اور حلب پر قبضہ کر لیا۔ ترکی کو اس میدان میں شکستِ فاش اٹھانی پڑی چونکہ بلغاریہ کی شکست کے بعد مقدونیا کی راہ سے اتحادی فوجوں کے لئے قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے کی راہ صاف ہو گئی تھی۔ ترکوں کی بہترین فوجی قوت ضائع ہو چکی تھی یا وہ منتشر تھی اس لئے جنگ کے ذریعہ قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہی تھی۔ مجبوراً ۳۰ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو ترکی نے بھی ہتھیار ڈال دیئے اس کے بعد ۳۰ اکتوبر کو آسٹریا نے بھی شکست تسلیم کر لی۔

ترکی پر اس جنگ کے جو اثرات پڑے اُن کی مختصر کیفیت یہ ہے۔

۱۔ ۳۰ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو قسطنطنیہ کا نظم ونسق اتحادی فوجوں نے سنبھال لیا۔

۲۔ تاوان جنگ کی وصولی کے لئے ذرائع آمدنی کو ترکی حکومت سے چھین کر اتحادیوں نے اپنے قبضہ میں کر لیا۔

۳۔ ترکی اپنے عظیم فرزندوں اور جاں نثاروں سے محروم ہو گیا۔ جمال پاشا، طلعت پاشا،

انور پاشا، نیازی بے، بدری بے وغیرہم کو ترکی چھوڑنا پڑا اور ایشیا دیورپ کے مختلف اطراف میں چلے گئے بعد کو ان میں سے طلعت پاشا کو برلن میں اور جمال پاشا کو طفلس میں دو ارمنیوں نے شہید کر دیا جبکہ انور پاشا ۱۹۲۲ء میں روسی ترکستان میں ایک معرکے میں شہید ہو گئے۔

۴۔ اب جو ترکی کو حکومت ملی تھی وہ اتحادیوں کے پٹھو داماد فرید پاشا کی تھی۔

۵۔ یکم نومبر کو ترکی خلیفہ سلطان محمد سادس کو تختِ خلافت سے اتار دیا گیا اور ان کی جگہ ۱۸ نومبر کو وحید الدین کو جو سلطان محمد سادس کے چچیرے بھائی تھے، سلطان بنایا گیا۔

۶۔ ترکی کی اسلامی سلطنت کو یوں تقسیم کیا گیا کہ عراق، فلسطین اور شرق اردن پر برطانیہ کی عملداری قائم کر دی گئی اور شام ولبنان فرانس کی عملداری میں دیئے گئے۔ شریف مکہ حسین کو جس نے انگریزوں کے اشارے پر ترکوں سے بغاوت کی تھی، یہ انعام دیا گیا کہ اسے حجاز کا بادشاہ تسلیم کر لیا گیا اور اس کے بیٹے فیصل کو عراق کا حکمران بنا دیا گیا اور ترکی کے دار الخلافہ قسطنطنیہ پر اتحادیوں نے تاوان جنگ وصول کرنے کے بہانے قبضہ کر لیا اور یورپی ترکی کے صوبہ تھریس کا کچھ حصہ یونان کے قبضے میں دے دیا۔

ترکوں کے لئے یہ انتہائی نازک دور تھا۔ جنگِ عظیم میں انھیں عبرت ناک شکست ہو چکی تھی۔ تمام اعضائے سلطنت کو ایک ایک کر کے اس سے جدا کر دیا گیا تھا۔ دار الخلافہ پر اتحادی فوجوں کا قبضہ تھا اور ملک کے تمام ذرائع آمدنی دشمنوں کے دستِ تصرف میں تھے۔ داماد فرید پاشا کی حکومت گویا کہ اتحادیوں کی اپنی حکومت تھی۔ سلطان پست ہمت بھی تھا اور دشمنوں کے نرغے میں بھی گھرا ہوا تھا۔ شکایت صرف یہی نہیں تھی کہ

ان حالات میں وہ جو کچھ کر سکتا تھا وہ نہیں کر رہا تھا بلکہ وہ ملت کے غداروں اور اتحادیوں کے ہاتھوں میں کھلونا بنا ہوا تھا اور ہر روز نئے نئے احکام اس کے ہاتھوں سے جاری کرائے جا رہے تھے۔ بہی خواہان ملت گرفتار ہو رہے تھے، انھیں جلاوطن کیا جا رہا تھا۔ سینکڑوں فوجی اور سول افسروں کو جزیرہ مالٹا میں نظر بند کیا گیا تھا۔ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی نے "سفر نامہ شیخ الہند" میں جن چند ترکی زعما اور فوجی حکام کا تذکرہ کیا ہے ان میں شیخ الاسلام خیری آفندی (خیر الدین آفندی)، انور پاشا کے والد احمد پاشا، ترکی کے سابق وزیر اعظم سعید حلیم پاشا اور ان کے بھائی عباس حلیم پاشا اور مفتی حسن فہمی آفندی کے علاوہ جنرل فخری پاشا، رؤف بے، جنرل محمود پاشا، جنرل علی احسان پاشا، کرنل جلال بے، کرنل اشرف پاشا، کرنل جواد بے، قائم مقام لفٹننٹ کرنل محمد توفیق بے، کپتان سید حسن آفندی، میجر احمد حیدر بے اور حبیب بے دفائق بے کا تذکرہ کیا ہے۔ کرنل اشرف بے کے حالات نہایت دلچسپ ہیں اور حضرت مدنی رحمتہ اللہ علیہ نے نہایت تفصیل سے لکھے ہیں۔ انور بے اپنے ساتھیوں کے ساتھ جرمنی چلے گئے تھے۔

ان حالات میں عبدالرحمن کے لئے بھی کچھ کم خطرات نہ تھے۔ ان کے بہت سے ساتھی وطن چھوڑ کر دوسرے ملکوں میں چلے گئے تھے بہت سے گرفتار ہو چکے تھے اور ملک میں اور بیرونِ ملک مالٹا میں قید کئے جا چکے تھے۔ عبدالرحمن کے لئے بھی بعض دوستوں کا مشورہ یہی تھا کہ ترکی سے باہر چلے جائیں اور حالات درست ہوتے اور امن قائم ہو جانے کے بعد واپس آنے کا ارادہ کریں لیکن عبدالرحمن اس پر آمادہ نہ ہوئے۔ اگر وہ خطرات کی پروا کرتے تو جنگِ بلقان کے بعد ہی وطن واپس چلے جاتے اور اپنے خاندان میں اور عزیزوں کے درمیان مقیم اور پرسکون زندگی کی راحتوں اور آسائشوں سے لطف اندوز ہوتے۔ اگر ان



خالدہ ادیب خانم ۔ ترکی کی نامور مجاہد اور دانشور ۔ جنہوں نے ترکی کی جنگ آزادی کی
بے مثال تصویرکشی اپنی تصنیفوں میں کی ۔

کے نزدیک جنگ کے خطرات ایسے ہی ہولناک ہوتے تو فوجی زندگی اختیار کرنے کا کبھی ارادہ نہ کرتے۔ وہ میدان چھوڑنے اور فرار کی زندگی اختیار کرنے پر آمادہ نہ ہوئے لیکن کچھ مدت کے لئے روپوش ہو جانے کے بارے میں دوستوں اور ہمدردوں کے اصرار کو رد نہ کر سکے چنانچہ ایک مدت کے لئے وہ روپوش ہو گئے۔ پھر موقع پا کر انقرہ چلے گئے اور مصطفیٰ کمال کی فوج میں شامل ہو گئے۔ ظفر احسن ایبک لکھتے ہیں:

> "جنگِ عظیم کے متارکہ کے بعد جب انگریزوں نے استنبول پر قبضہ کر لیا تو وہ شہر میں روپوش ہو گئے تاکہ انگریزوں کے ہاتھ نہ پڑیں۔ جب رؤف بے کو خفیہ خبر ملی کہ انگریز ترکی پارلیمنٹ کو توڑنا اور ترکی مبعوثین (ممبران پارلیمنٹ) کو قید کر کے مالٹا بھیجنا چاہتے ہیں تو انہوں نے عبدالرحمٰن کو خفیہ طور پر انقرہ بھیج دیا کہ وہ وہاں جا کر ترکی فوج میں جو غازی مصطفیٰ کمال پاشا کے زیر کمان منتظم ہو رہی تھی داخل ہو جائیں۔"

ترک اس وقت اپنی تاریخ کے ایک اندوہناک دور سے گزر رہے تھے۔ ان کے پاس کچھ کرنے کی ہمت تو تھی مگر وسائل نہ تھے۔ لیکن مجلس اتحاد و ترقی کے ممبران ان پُرآشوب زمانے میں بھی ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ انہوں نے ان ہمت شکن حالات میں بھی کچھ نہ کچھ کرنے کا عزم کر لیا تھا۔ چنانچہ اس وقت کے حالات کے مطابق لائحہ عمل تجویز کرنے اور اقدام وسعی کے لئے مصطفیٰ کمال پاشا نے ۲۳ جولائی تا ۷ اگست ۱۹۱۹ء قوم پروروں کا ایک اجتماع سیواس میں بلایا اور ۹ ستمبر کو مطالبات کا اعلان کر دیا جن کا مقصد یہ تھا کہ ترک علاقے متحد رکھے جائیں۔ ترکوں کی مرضی کے خلاف اتحادیوں کو ان میں تصرف اور ان کے ٹکڑے کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اور آرمینیا کی الگ ریاست منظور نہ کی جائے۔ ۱۲ ستمبر کو میثاقِ ملی کا اعلان کیا گیا جس

کے خاص خاص اصول یہ تھے۔ ترکی کی خود مختاری، قسطنطنیہ کی حفاظت، آبناؤں پر اقتدار اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ اور غیر ملکیوں کے لیے خاص مراعات کی تنسیخ۔ یہ گویا مجلس اتحاد و ترقی کا منشور تھا۔ اکتوبر میں ترکی پارلیمنٹ کے انتخابات ہوئے۔ مجلس اتحاد و ترقی نے اس میں حصّہ لیا اور اس کے ارکان کامیاب ہو گئے۔ علی رضا نے وزارت بنائی اور مجلس اتحاد و ترقی کے ممبران اور قوم پروروں سے مصالحت و تعاون کی پالیسی اختیار کی لیکن پارلیمنٹ کی یہ روش اتحادیوں کو پسند نہ آئی اور انہوں نے سلطان سے پارلیمنٹ کو برطرف کروا دیا۔ علی رضا کی جگہ پھر داماد فرید پاشا نے وزارت بنائی۔

اپریل ۱۹۲۰ء میں انگورہ (انقرہ) میں مصطفیٰ کمال پاشا نے عارضی حکومت بنالی۔ مصطفیٰ کمال اس کے صدر منتخب ہوئے اور سوویت یونین سے ایک معاہدہ کر لیا جس کے تحت ضروری سامان کی بہم رسانی یقینی ہو گئی۔ ۱۰ اگست ۱۹۲۰ء کو اتحادیوں نے ترکی حکومت سے سیورے (فرانس) میں ایک معاہدے پر دستخط کروائے جو "معاہدہ سیورے" کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کی شرطیں نہایت سخت اور ترکوں کے لیے شرمناک تھیں۔ اس معاہدے کی اشاعت سے ترکوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ مصطفیٰ کمال پاشا نے اس معاہدے کے خلاف عوام میں تحریک شروع کر دی۔

۱۹۲۰-۲۱ء میں مصطفیٰ کمال پاشا نے متعدد سیاسی اور فوجی کامیابیاں حاصل کیں اور روس، فرانس، اٹلی وغیرہ سے معاہدات کر کے حالات کو ترکی کے عظیم مفاد میں ہموار کر لیا۔ ان حالات و واقعات پر جو مصطفیٰ کمال پاشا کے ساتھیوں اور مجلس اتحاد و ترقی کے ممبروں کو پیش آئے۔ ان کا جس طرح انھوں نے مقابلہ کیا اور جو کامیابیاں حاصل کیں ان میں بلاواسطہ عبدالرحمٰن کا بھی حصّہ تھا۔ اس لیے کہ عبدالرحمٰن بھی مجلس اتحاد و ترقی کے سرگرم ممبر تھے اور ان



یہ تصویر اناطولیہ میں ترکی کی جنگ آزادی کے زمانے میں لی گئی۔
بائیں سے دائیں۔ رفعت پاشا۔ عبدالرحمٰن پشاوری ۔ رؤف پاشا۔ ایک ترکی افسر۔ غازی مصطفیٰ کمال پاشا۔ ایک ترکی افسر۔ بکیر سامی بے ترکی وزیر خارجہ

تمام فوجی اور سیاسی کاموں میں آتاترک کے قابلِ اعتماد ساتھیوں میں ایک نمایاں شخصیت تھے اس لیے جہاں مصطفیٰ کمال کی کامیابیوں اور ترکی کی تعمیر و ترقی کے لئے مجلسِ اتحاد و ترقی کے کارناموں کا تذکرہ آئے گا وہاں عبدالرحمٰن کی شخصیت ضرور موجود ہوگی۔ خواہ ان کا نام کتاب کی سطروں اور حروف و سواد میں ہمیں نظر نہ آئے۔ عبدالرحمٰن اس سے بہت پہلے غازی انور پاشا کی تحریک و سفارش پر مجلسِ اتحاد و ترقی کے رُکن منتخب کر لئے گئے تھے۔ اس کے بعد ان کی تمام کوششیں ترکی کے وسیع تر مفاد کے لئے اس مجلس کے پلیٹ فارم سے جاری تھیں۔
عبدالرحمٰن خلافت کے دل سے خواہاں تھے۔ اکتوبر ۱۹۱۸ء کے بعد سلطان وحید الدین جس طرح اتحادیوں کے اشارے پر ناچ رہا تھا۔ یہ صورتِ حال ان کے لئے سخت تکلیف دِہ تھی۔ وُہ دِل میں ایک شدید بے چینی محسوس کر رہے تھے۔ ترکوں کی فلاح و بہبود اور ترکی سلطنت کے استحکام اور حفظ و دفاع کے لئے ان کی رائے وہی تھی جو اس باب میں آتاترک اور مجلس کی رائے تھی۔

پندرھواں باب

سفیر کی حیثیت سے

جنگ عظیم تاریخ عالم کا بلا شبہ ایک ہولناک واقعہ تھا لیکن اس کے مابعد اثرات اور پیدا شدہ حالات بھی اس سے کم سنگین نہ تھے۔ قسطنطنیہ پر اتحادی فوجوں کے قبضے کے بعد ترکوں کے مفاد کو جس طرح نظر انداز کیا جا رہا تھا اس کی داستان بڑی المناک ہے۔ دارالخلافہ سے مایوس ہو کر مصطفیٰ کمال نے انگورہ (انقرہ) میں عارضی حکومت قائم کر لی تھی اب ان کا مقابلہ دشمنوں اور بیگانوں سے نہ تھا بلکہ قوم کے غداروں، خائنوں، ترکی کے دوست نما دشمنوں اور شکست خوردہ اپنوں سے بھی تھا۔ جنگ عظیم کے دوران میں صرف ایک محاذ تھا لیکن اب انھیں بہ یک وقت کئی محاذوں پر لڑنا پڑ رہا تھا ایک طرف میدان جنگ تھا جہاں فوجوں کی رہنمائی کرنی تھی دوسری طرف ملک کی سرحدوں کی حفاظت کرنی تھی اور اس کے شہروں اور اس کی سرزمین کو دشمنوں کے قبضہ و تسلط سے آزاد کرانا تھا۔ تیسری طرف ملک کی اقتصادی اور معاشی حالت درست کرنی تھی، چوتھی طرف ملک اور بیرون ملک میں ان غلط فہمیوں کو دور کرنا تھا جو انگورہ حکومت کے متعلق اپنے اور بیگانے پھیلا رہے تھے۔ ان ہمت شکن حالات میں کامیابی کے ساتھ گزرنا اور ملک کی کشتی کو صحیح سلامت طوفان حوادث سے نکال کر ساحل مراد تک پہنچا دینا مصطفیٰ کمال پاشا کی عظمت کے اعتراف کے لئے کفالت کرتا ہے۔

عبدالرحمٰن اتاترک کے قابلِ اعتماد ساتھیوں میں سے تھے اور ان کے ساتھ ہی ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کر رہے تھے۔ انہی حالات میں اتاترک کے سامنے دوسرے ممالک میں سفارتیں بھیجنے کا سوال پیدا ہوا۔ چونکہ افغانستان نے انگورہ حکومت کو سب سے پہلے تسلیم کیا تھا اور انگورہ میں اپنا سفیر بھیج دیا تھا اس لیے انگورہ حکومت نے بھی سب سے پہلے افغانستان میں اپنا سفیر بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ افغانستان میں انگورہ حکومت کی ترجمانی اور اس کے مفاد کی نگرانی کے لئے عبدالرحمٰن سے بہتر کوئی شخص نہیں ہو سکتا تھا چنانچہ افغانستان میں سفیر بنا کر بھیجنے کے لئے اتاترک کی نظرِ انتخاب اس جوہرِ قابل پر پڑی اور مارچ ۱۹۲۱ء میں انھیں ترکی سفیر کی حیثیت سے افغانستان روانہ کر دیا۔ یہ اتاترک کا عبدالرحمٰن پر بہت بڑا اعتماد تھا اور ان کے لئے بہت بڑا اعزاز بھی۔

انگورہ[1] سے کابل کا سفر عبدالرحمٰن نے جس حالت میں کیا وہ ایک دلدوز داستان ہے۔ انھوں نے یہ سفر ساڑھے چار ماہ کی مدت میں پورا کیا تھا اور اس کا بہت سا حصّہ پیدل طے کیا تھا۔ ان کے ساتھ دو خدمت گزار تھے جو سفر کی صعوبتیں نہ برداشت کر سکے اور راستے ہی میں غائب ہو گئے۔ سامان و زادِ راہ کچھ خدمت گزار لے کر فرار ہو گئے تھے۔ جو بچا تھا اس سے عبدالرحمٰن نے بسکد و شی حاصل کر لی۔ سواری نہ ہونے کی وجہ سے سامان لے کر سفر کرنا ممکن نہ تھا۔ راستے مخدوش تھے۔ کسی حفاظت کا انتظام نہ تھا۔ قدم قدم پر لوٹ لئے جانے کا خطرہ تھا۔ عبدالرحمٰن بہ ہزار مصائب و مشکلات انگورہ سے بخارا، وہاں سے ہرات، ہرات سے غزنی پہنچے۔ راستے کے شدائد نے ان کی حالت نہایت خستہ و خراب کر دی

---

[1] ۔ آج کل اس کا تلفظ اور املا انقرہ کیا جاتا ہے۔

تھی۔ غزنی کے حاکم کو جوں ہی معلوم ہوا۔ عبدالرحمٰن ترکی کے سفیر کی حیثیت سے کابل جا رہے ہیں اس نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور عزت و تواضع سے پیش آیا۔ کابل فون کر کے امان اللہ خاں کو ان کی آمد کی اطلاع دی، چونکہ عبدالرحمٰن کے والد غلام صمدانی کی ایک شادی کابل کے شاہی خاندان میں ہوئی تھی اس لئے امان اللہ خاں اس خاندان سے بخوبی واقف تھے اور ترکی میں عبدالرحمٰن کی معرکہ آرائیوں اور ملتِ اسلامیہ سے ان کی جانفروشیوں کی داستانیں بھی سن چکے تھے اس لئے ان کے آنے کی انھیں بھی خوشی ہوئی لیکن جب انھیں معلوم ہوا کہ وہ تن تنہا آئے ہیں۔ ان کے ساتھ کوئی خدمت گار نہیں ہے اور انہوں نے اپنے سفر کا بیشتر حصّہ پیدل طے کیا ہے تو تعجب ہوا۔ امان اللہ خاں نے غزنی کے حاکم کو حکم دیا کہ عبدالرحمٰن کو عزت سے رکھا جائے ان کی عزت و تواضع میں کوتاہی نہ کی جائے اور جب سفر کی تکان پوری طرح دور ہو جائے تو ان کے لئے سواری کا معقول انتظام کر کے نہایت عزت و تکریم کے ساتھ انھیں روانہ کیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے کچھ دن غزنی میں قیام کیا۔ اور پھر نہایت تزک و اہتمام کے ساتھ کابل روانہ ہوئے۔ کابل پہنچنے پر آپ کا سرکاری طور پر اعزاز و اکرام کے ساتھ استقبال کیا گیا۔

کابل میں ان کا ورود وسط ۱۹۲۱ئہ میں ہوا تھا اور اسی سال کے آخر سے انہوں نے سفارتی ذمہ داریوں کو پورا کرنا شروع کر دیا۔ انتنے میں انھیں اس محل میں ٹھیرایا گیا جو پہلے نائب السلطنت سردار نصر اللہ خاں کی اقامت گاہ ہے۔ اسی محل میں سفارت خانہ قائم ہوا۔ کچھ مدت کے بعد امان اللہ خاں نے ترکی سفارت خانہ کو اس عالی شان عمارت میں منتقل کر دیا جو بہ زمانہ شہزادگی ان کے لئے مخصوص تھی۔ امان اللہ خاں نے جب اس عمارت میں ترکی سفارت خانہ کی منتقلی کا حکم دیا تو عبدالرحمٰن سے فرمایا کہ مجھے اس عمارت



عبدالرحمن پشاوری کابل میں ترک سفیر کی حیثیت سے۔

سے ایک خاص انس اور محبت ہے اس لیئے میں چاہتا ہوں کہ یہی عمارت ترکی سفارت خانہ اور آپ کی جائے قیام بنے۔ کابل میں ظفر احسن ایبک ان کے ملاقاتیوں میں سے تھے وہ اس سفر کے پس منظر اور حالات کے بارے میں اپنی آپ بیتی '' حصہ اوّل میں لکھتے ہیں:

'' ترکی قومی حکومت ایک طرف تو یونانی حملہ آوروں کا جو انگریزوں اور فرانسیسیوں کے سہارے اور ان کے شوق دلانے کی وجہ سے ترکوں کے سات سو سالہ آبائی وطن ایشیائے کوچک یعنی اناطولیہ کو اپنے قبضہ میں لانا چاہتے تھے، مقابلہ کر رہی تھی اور دوسری طرف ان خارجی ملکوں کو جنھوں نے اس نئی ترکی حکومت کو تسلیم کر لیا تھا، سفیر بھیج کر ان کے ساتھ سیاسی تعلق پیدا کرتی جا رہی تھی۔ افغانستان قومی ترکی حکومت کے ساتھ سیاسی تعلقات پیدا کرنے والے ملکوں میں سے ایک پہلا ملک تھا اس لیئے ترکوں کی قومی حکومت نے فیصلہ کیا کہ افغانستان کو اپنا سفیر بھیجے۔ غازی مصطفیٰ کمال پاشا نے اس کام کے لیئے عبدالرحمٰن کو چنا۔ وہ ایران کے راستے افغانستان آئے۔ سفر کے آخری حصے میں زادِ راہ کی کمی کی وجہ سے ان کو پیدل بھی چلنا پڑا۔ ان کے ملازم نے راستے ہی میں ان کا ساتھ چھوڑ دیا اور وہ اکیلے غزنی پہنچے۔ یہاں سے غزنی کے کمشنر نے ٹیلیفون سے افغانی وزیر خارجہ کو ان کی آمد کی اطلاع دی اس پر افغانی حکومت نے بہت عزت کے ساتھ ۱۹۲۱ء کی گرمیوں میں کابل پہنچنے کا انتظام کیا مگر کابل میں افغانی حکومت نے ان کے اعتماد نامہ کو ذرا شبہ کی نظر سے دیکھا اور جب تک افغانی سفیر متعینہ انقرہ سے ان کے متعلق کوئی خبر نہ آئی اس وقت تک ان کو سفیر کی حیثیت تسلیم کرنے میں ذرا جھجھک دکھلائی

لیکن ان کو قصر عین العمارہ میں جہاں اس سے پہلے جمال پاشا ٹھہر چکے تھے، جگہ دی۔ یہ قصر اب ترکی سفارت خانے کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔"

عبدالرحمٰن اعلیٰ سیرت، حسن اخلاق اور اسلامی افکار کے حامی تھے اس وجہ سے وہ بہت جلد افغانستان کے تمام حلقوں میں گھل مل گئے اور سیاسی، علمی، تعلیمی تمام حلقوں میں عزت کی نظر سے دیکھے جانے لگے۔ اس میں شاہی خاندان سے ان کی قرابت کا بھی کچھ حصّہ تھا۔ انہوں نے سفیر ہونے کے زعم میں نہ صرف اپنے امراء وحکام کا حلقہ بنایا، نہ عوام سے دور ہوئے اور نہ اپنی زندگی کو عیش وعشرت سے ملوث کیا۔ وہ ترکی کے سفیر تھے اور اس کی بہترین ترجمانی کے فرائض سے کبھی غفلت نہ برتتے تھے لیکن افغانستان بھی ایک مسلمان ملک تھا جو ترقی اور عزت ووقار کے حصول کی جد وجہد میں مصروف تھا۔ پھر عبدالرحمٰن کا رشتہ افغانستان سے قدیم بھی تھا اور گہرا بھی۔ اس لئے وہ افغانستان کی اقتصادی ومعاشی ترقی، سیاسی اصلاح اور تعلیم کے فروغ کے لئے اتنے ہی کوشاں رہتے تھے جتنا کہ کسی شخص کو اپنے ملک کے لئے کوشاں ہونا چاہیے تھا۔ ان کے کردار کی اس خوبی نے انھیں خواص سے لے کر عوام تک مقبول اور ہر دلعزیز شخصیت بنا دیا تھا۔

کابل میں ان کے احباب کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ ان میں آقا محمد حسین خان (علیگ) "رئیس تدریسات"، سید علی عباس بخاری، قاضی محمد ولی خاں، مولانا برکت اللہ بھوپالی، مولانا عبید اللہ سندھی، ڈاکٹر نور محمد، ظفر احسن ایبک وغیرہم سے ان کے تعلقات بہت قریبی تھے۔ چند حضرات کا یہاں تعارف یہاں نامناسب نہ ہوگا۔

قاضی محمد ولی خاں

قاضی ولی محمد خاں کا اصل نام عبدالولی خاں تھا۔ ہندوستان چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور افغانستان گئے تو اپنا نام محمد ولی خاں

رکھ لیا۔ قاضی صاحب علم و فضل میں یکتا اور اعلیٰ دماغ کے مالک تھے۔ آفیسر منشی کی حیثیت سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ پھر اسٹاف کالج کوئٹہ میں اردو اور پشتو کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ان کی قابلیت کی شہرت ہوئی تو بیگم صاحبہ بھوپال نے انھیں ریاست بھوپال بلا لیا۔ چند سال تک اعلیٰ فوجی عہدوں پر تعینات رہے۔ جنگِ طرابلس کے زمانے میں ترکی چلے گئے۔ جنگِ بلقان میں شرکت کی اور ترکی کے دفاع کا فریضہ انجام دیا۔ جنگ کے خاتمے کے بعد ہندوستان تشریف لائے اور سرگرمی سے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا اور نتیجے میں گرفتار ہو گئے۔ کچھ دنوں کے بعد رہائی ملی۔ رولٹ ایکٹ کے زمانے میں پھر گرفتاری کا خطرہ پیدا ہو گیا تو دوستوں کے مشورہ سے افغانستان ہجرت کر گئے اور افغانستان میں ہندوستان کی جدوجہد آزادی کے لئے جدوجہد شروع کی۔ وہاں حالات کو ناسازگار پایا تو جرمنی چلے گئے۔ جرمنی سے ایک وفد کے ساتھ ترکی گئے۔ جنگِ عظیم کے خاتمے کے بعد پھر جرمنی چلے گئے اور کریسنٹ اور اورینٹ کے نام سے یکے بعد دیگرے دو اخبار نکالے۔ جن میں انگریزوں کے خلاف اور ہندوستان کی آزادی کے لئے مضامین شائع ہوتے تھے۔ ان اخبارات کا داخلہ ہندوستان میں بند کر دیا گیا تھا۔ تھوڑی تھوڑی مدت کے بعد یہ اخبارات بھی بند کر دیئے گئے۔ جرمنی سے سوئٹزرلینڈ چلے گئے۔ وہاں سے مسلم اسٹینڈرڈ کے نام سے ایک اخبار نکالا۔ کچھ عرصہ بعد وہ بھی بند ہو گیا۔ پھر آپ امریکہ چلے گئے اور ایک مدت تک وہیں قیام رہا۔ دسمبر ۱۹۲۷ء میں اللہ بخش یوسفی مرحوم نے احرار افاغنہ کے نام سے ایک رسالہ شائع کیا تھا اس وقت قاضی صاحب سے عبدالرحمٰن کے قریبی تعلقات بہت قریبی رہے اور پشاور ہی سے قائم تھے۔ افغانستان میں عبدالرحمٰن اور قاضی صاحب کے تعلقات بہت زیادہ قریبی ہو گئے تھے۔

سیّد علی عباس بخاری پشاور کے رہنے والے تھے اور جون ۱۹۱۷ء میں ہجرت کر کے کابل گئے تھے۔ وہ اپنے قوم پرستانہ جذبات اور انگریز دشمنی کے لئے بہت مشہور تھے اور ہندوستان کے حریت پسندوں اور مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی، ڈاکٹر مختار احمد انصاری وغیرہم احرارِ اسلام سے ان کے بہت قریبی روابط تھے۔ مولانا عبیداللہ سندھی سے وہ دہلی ہی میں مل چکے تھے۔ کابل پہنچنے پر امیر حبیب اللہ خاں نے انگریزوں کے اشارے پر انھیں نظر بند کر دیا تھا۔ کسی کو ان سے ملنے کی اجازت نہ تھی۔ مگر ظفر حسن اور ایک دو بار مولانا سندھی ان سے خفیہ طور پر مل چکے تھے۔ بخاری صاحب اس زمانے میں تنگی کے دن گزار رہے تھے۔ مولانا سندھی نے متعدد بار ان کی امداد بھی کی تھی۔ ظفر حسن کے بقول وہ بہت ایماندار، اسلام کے شیدا، مسلمانوں کے سچے ہمدرد اور بہت ہی حساس شخص تھے۔ عالم اسلام کی حالت اور جنگ کی رفتار سے انھیں بہت صدمہ ہوتا تھا۔ مسلمانوں کی خدمت کے جذبہ اور ملی بہی خواہی نے انھیں گھر بار چھوڑنے پر مجبور کیا تھا لیکن ایک مسلمان ملک کا ان کے ساتھ یہ رویہ شرمناک تھا۔ اس چیز نے ان کے ذہن پر بھی بڑا اثر ڈالا تھا۔ بعد میں ان پر سے پابندی اٹھالی گئی تھی اور نقل و حرکت کی آزادی مل گئی تھی۔ سید علی بخاری سرحد میں حاجی صاحب ترنگ زئی کی انقلابی و سیاسی پارٹی سے تعلق رکھتے تھے۔ افغانستان میں یہ عبدالرحمٰن کے خاص دوستوں میں سے تھے اور اپنے اسلامی خیالات کی بنا پر دونوں گویا خواجہ تاش تھے۔ ۵ محرم ۱۳۴۵ھ کو کابل میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

مولانا برکت اللہ بھوپالی مشہور انقلابی اور غدر پارٹی کے رہنما تھے۔ اصل وطن بھوپال تھا۔ ایک مدت تک جاپان میں اشاعت اسلام کے کام میں مصروف رہے۔ غدر پارٹی سے تعارف کے بعد اس میں شامل ہو گئے

اور انگریزوں کے خلاف اور ہندوستان کی آزادی کے لئے کام کرنے لگے ۔ پہلی جنگ عظیم کے وقت انگریزوں کے خلاف جرمنوں سے مل گئے ۔ ۱۹۱۵ء کے اواخر میں جرمنی سے جو ہندوستانی ترکی اور جرمنی ممبروں پر مشتمل وفد کابل آیا تھا اس کے ایک رکن مولانا برکت اللہ بھی تھے ۔ کابل میں جب ہندوستان کی عارضی حکومت کا قیام عمل میں آیا تو اس میں وزیر اعظم بنائے گئے ۔ مولانا برکت اللہ کو عبدالرحمٰن کے اسلامی سیاسی خیالات، انقلابی کردار اور خالص علمی شخصیت کی بنا پر بڑی عقیدت تھی اور ہر دو جانب سے اخلاص و محبت کا گہرا تعلق قائم ہو گیا تھا ۔ مسئلہ خلافت پر ان کی ایک اہم تصنیف ہے جو امریکہ سے شائع ہوئی ۔

مولانا عبیداللہ سندھی

مولانا عبیداللہ سندھی سے عبدالرحمٰن اپنے زمانہ طالب علمی سے واقف تھے ۔ مولانا مرحوم اس زمانے میں دہلی میں نظارۃ المعارف القرآنیہ قائم کر کے علی گڑھ اور دیوبند کے فارغ التحصیل طلبہ کو قرآن حکیم کی انقلابی فکر سے روشناس کرانے میں مصروف تھے ۔ مولانا سندھی کا قیام مسجد فتح پوری میں تھا ۔ وہیں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسین مدنی کی جماعت کے ایک رکن اور دیوبند کے ایک پشاوری شاگرد مولانا سیف الرحمٰن مدرسہ فتح پوری میں مدرس اول تھے ۔ سیف الرحمٰن کا تعلق حاجی صاحب ترنگ زئی سے بھی تھا ۔ وہ ان کے آزاد قبائل کے معرکوں میں بھی شریک رہے تھے ۔ جن چیزوں نے ان کے سیاسی ذہن کی تربیت کی تھی ۔ ان میں حضرت شیخ الہند کی انقلابی جماعت کے افراد خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جو علیگڑھ اور دہلی سے لے کر سرحد اور آزاد قبائل تک پھیلے ہوئے تھے ۔ اس سلسلے میں سید علی عباس بخاری، مولانا سندھی، مولانا سیف الرحمٰن، حاجی صاحب ترنگ زئی، مولانا فضلِ ربی، ڈاکٹر انصاری وغیرہم کے نام آتے ہیں جن سے عبدالرحمٰن کے تعلقات کا پتہ چلتا ہے ۔

مولانا سیف الرحمٰن کے بارے میں شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی اپنی خود نوشت "نقش حیات" میں لکھتے ہیں۔

"مولانا سیف الرحمٰن صاحب اصل میں قندھاری افغان ہیں۔ ان کے آباء و اجداد پشاور کے پاس رہنے لگے تھے۔ انھوں نے حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ سے علم حدیث شریف حاصل کیا تھا۔ عرصہ دراز تک ریاست ٹونک میں تعلیم و تدریس کی خدمات انجام دیتے رہے۔ آخر میں مدرسہ فتح پوری دہلی میں مدرس اول ہو گئے اور اس عہدے کے فرائض کئی سال تک انجام دیتے رہے۔ حضرت شیخ الہند رحمتہ اللہ علیہ نے ان کو ہم خیال بنایا اور اپنے مشن کا ممبر بنا کر مرکز یاغستان کی طرف ہجرت کرنے کا مطالبہ کیا چنانچہ موصوف ہجرت کر کے یاغستان پہنچے اور لوگوں میں وعظ و تبلیغ عرصہ تک کرتے اور ان کو جہاد آزادی پر آمادہ کرتے رہے۔ مقرر بہت اعلیٰ درجے کے اور نہایت صاحب علم و عمل تھے۔ ان کے وعظ و تلقین سے بہت زیادہ لوگوں میں تاثر اور جوش پیدا ہوا .... موصوف حاجی ترنگ زئی صاحب کی معیت میں جہاد میں شریک ہونے کے بعد کابل چلے گئے۔"

مولانا سیف الرحمٰن سے عبد الرحمٰن کی واقفیت اسی زمانے سے تھی جب مولانا مدرسہ فتح پوری میں پڑھاتے تھے۔

مولانا فضل ربی کے بارے میں شیخ الاسلام مولانا حسین مدنی تحریر فرماتے ہیں:

"مولانا فضل ربی صاحب دار العلوم دیوبند کے فارغ التحصیل اور حضرت شیخ الہند رحمتہ اللہ علیہ کے شاگرد رشید اور ضلع پشاور کے باشندے ہیں۔

نہایت جوشیلے اور مستقل مزاج جانباز ہیں۔ اپنے وطن میں علمی مشاغل میں مشغول تھے۔ مولانا شیخ الہند نے حکم فرمایا کہ آپ یاغستان (آزاد علاقہ) میں چلے جائیں اور وہاں لوگوں کو جہاد آزادی کے لئے آمادہ کریں اور اس کی تبلیغ میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیں چونکہ ان کو تقریر کی مشق دارالعلوم میں رہتے ہوئے بہت اچھی ہو گئی تھی اس لئے ان کی جوشیلی تقریروں کا وہاں بہت اچھا اثر ہوا۔ اور بڑی تعداد میں لوگ جانبازی کے لئے تیار ہو گئے۔ جب حاجی ترنگ زئی مرحوم نے علم جہاد بلند کیا تو مولانا فضل ربی شریک جہاد رہے پھر شکست کے بعد کابل چلے گئے۔

فضل ربی سے عبدالرحمٰن کے خاص تعلقات کابل میں قیام کے دوران میں ہوئے اگرچہ خیال یہ ہے کہ واقفیت پہلے سے ہوگی۔ ان حضرات کے علاوہ مولانا محمد اکبر، مولانا فضل محمود وغیرہ دارالعلوم دیوبند کے فارغ اور حضرت شیخ الہند کے شاگردوں میں سے تھے جن کی انقلابی و دینی سرگرمیوں کا خاص میدان پشاور کا علاقہ تھا اور تقریباً وہی زمانہ تھا اس لئے ناممکن ہے کہ عبدالرحمٰن پشاوری ان کی سرگرمیوں سے ناواقف رہے ہوں اور ان کی انقلابی شخصیت نے ان حضرات کے مجاہدانہ کارناموں سے اثر نہ قبول کیا ہو۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی علیہ الرحمتہ نے آخر الذکر دونوں حضرات کا تذکرہ بھی نقش حیات میں کیا ہے۔

مولانا سیف الرحمٰن، فضل ربی، فضل محمود وغیرہ وہ حضرات تھے جو انگریزوں کی نظروں میں انتہائی خطرناک تھے۔ ریشمی رومال سازش میں ان حضرات کا بھی زبردست حصہ تھا۔ ریشمی رومال سازش کی دستاویزات شائع ہو چکی ہیں۔ ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ جندربانیہ میں یہ تینوں حضرات بالترتیب میجر جنرل، کرنل اور لفٹننٹ کرنل تھے۔

ڈاکٹر انصاری مرحوم کے ساتھ عبدالرحمٰن بھی مشن میں شریک ہو کر ترکی گئے تھے۔ اب مولانا سندھی سے عبدالرحمٰن کی کابل میں ملاقات ہوئی تو گویا بچھڑے ہوئے راہی راہ نما مل گئے۔ ظفر حسن کا بیان ہے کہ مولانا سندھی سے عبدالرحمٰن کی بہت راہ و رسم ہو گئی تھی اور وہ ان سے بہت بے تکلف ملتے جلنے لگے۔ اس کے بعد جب مولانا ۱۹۲۳ء میں ترکی تشریف لے گئے تو وہاں بھی ان کی ملاقاتیں رہیں۔ ترکی کی سیاست اور افراد اور جماعتوں کے آپس کے تعلقات کے بارے میں مولانا کو عبدالرحمٰن سے بہت اہم باتیں معلوم ہوتیں۔ عبدالرحمٰن ترکی کی اندرونی سیاست سے بخوبی واقف تھے۔ انہوں نے ان حالات سے مولانا سندھی کو روشناس کرایا۔ عبدالرحمٰن نے مولانا سندھی کی بہت سی مشکلات کو دور کیا۔ ترکی کے بعض اکابر سے ان کی ملاقات کا اہتمام کیا۔ مولانا کو مالی مشکلات پیش آئیں تو ان کے لئے امداد کا بندوبست کیا۔ بہر حال کابل میں عبدالرحمٰن کے جن اکابر سے بہت قریبی تعلقات تھے ان میں مولانا سندھی مرحوم کا نام بہت نمایاں ہے۔

کابل میں ان کے دوستوں میں ڈاکٹر نور محمد اور ظفر حسن ایبک سے بہت قریبی تعلقات تھے۔ نور محمد سے ان کے تعلقات کا ذکر تو ظفر حسن نے مولانا سندھی مرحوم کے ساتھ کیا ہے گویا کہ عبدالرحمٰن کی ڈاکٹر نور محمد سے بہت راہ و رسم اور بے تکلفی تھی۔ ظفر حسن نے ان کی خدمت میں کبھی کبھار اپنے جانے کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ ڈاکٹر نور محمد کو مولانا سندھی سے بڑی عقیدت تھی۔ کابل میں وہ مولانا کے ہمراز و دم ساز تھے۔ وہ بچپن میں والدہ کے ساتھ مسلمان ہو گئے تھے انھوں نے بمبئی یونیورسٹی سے ڈاکٹری کی سند حاصل کی تھی۔ حیدرآباد سندھ کے رہنے والے تھے۔ اعلیٰ دماغ پایا تھا۔ سرگرم سیاسی کارکن تھے افغانستان ہجرت کر گئے تھے کابل میں پریکٹس کرتے تھے اور اس بنا پر اکابر سے قریبی روابط پیدا ہو گئے تھے۔ اکتوبر ۱۹۲۲ء

ہیں مولانا سندھی نے کابل چھوڑا تو اس قافلے میں ڈاکٹر نور محمد بھی تھے۔ بعد میں ہندوستان آگئے تھے۔ حیدر آباد سندھ میں انتقال ہوا۔

ظفر حسن ایبک ظفر حسن ایبک سیالکوٹ کے رہنے والے تھے۔ ایف سی کالج لاہور میں زیر تعلیم تھے۔ ۵ر فروری ۱۹۱۵ر کو رات کو گاڑی میں اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ خفیہ طور پر نکلے۔

۸ر فروری کو ہری پور ہزارہ پہنچے۔ رات کو وہاں سے بھیس بدل کر نکلے اور امب اور مجاہدین کے مرکز اسمس ہوتے ہوئے کابل ہجرت کر گئے۔ مولانا سندھی کے ارادت مند ہیں۔ مولانا کے ساتھ ماسکو کے سفر میں شریک تھے۔ بعد میں ترکی چلے گئے۔ وہیں کی شہریت اختیار کر لی۔ فوج میں ملازم ہو گئے۔ ان کی "آپ بیتی" نہایت اہم کتاب ہے اور افغانستان، روس اور روس میں ہندوستان کی آزادی کی تحریک کے نہایت قیمتی حالات پر مشتمل ہے۔ اب بھی ترکی میں مقیم ہیں۔

بہر حال عبد الرحمٰن پشاوری کے ان دوستوں اور ممدوحوں کے حلقے پر ایک نظر ڈال لینے ہی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ عبد الرحمٰن کی انقلابی شخصیت کا خمیر کس آب و گل سے تیار ہوا تھا اور ان کی فکر و سیرت اور تربیت میں کس افکار و اصحاب سیرت نے حصہ لیا تھا۔ عبد الرحمٰن نے اپنے سفارتی فرائض کو نہایت احتیاط اور حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیا۔ اس کے باوجود اس زمانے کے بہت سے واقعات اور لطائف سے ان کی ذہانت اسلامی و ملی غیرت، ان کی سیرت اور اخلاق کی بلندی اور ان کی عالی حوصلگی پر روشنی پڑتی ہے۔ یہاں مشتے نمونہ از خروارے چند واقعات پیش کیے جاتے ہیں۔

ایک دفعہ قصر عین العمارہ میں جمال پاشا اور چند دیگر ترکوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ ان میں بحریہ کا ایک اعلیٰ افسر بھی تھا جو حال ہی میں انگلستان سے بحریہ کی تعلیم مکمل کر کے

آیا تھا اور خیال کیا جاتا ہے کہ وہ انگریزی میں خاصی مہارت رکھتا تھا۔ عبدالرحمٰن بیک وقت ان سے انگریزی میں اور جمال پاشا سے ترکی میں باتیں کر رہے تھے اور جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ جب وہ ایک زبان کو چھوڑ کر فوراً دوسری زبان بولتے تو ان کے تلفظ اور لہجے سے اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ یہ شخص ابھی ترکی کی زبان خالص ترکوں کے لہجہ میں اور انگریزی بالکل انگریزوں کے لہجہ میں بول رہا ہے۔ دوران گفتگو میں عبدالرحمٰن نے انگریزی داں مخاطب سے دریافت فرمایا کہ آپ کے علم میں انگریزی کا مشہور جملہ "ہپ ہپ ہرا" کس لفظ سے مشتق ہے لیکن وہ صاحب اس کا کوئی جواب نہ دے سکے۔ جمال پاشا کے دریافت کرنے پر آپ نے بتایا کہ ہپ کا ماخذ ترکی زبان ہے۔ ترکی میں بہت سے معنوں میں بولا جاتا ہے اور ہرّا خوشی کو کہتے ہیں۔ جمال پاشا اس بات سے بہت مسرور ہوئے۔[1]

اعلیٰحضرت امان اللہ خاں عبدالرحمٰن پر بہت التفات فرماتے تھے۔ اس میں کچھ خاندانی تعلقات کا اثر تھا اور کچھ عبدالرحمٰن کی ذاتی و شخصی خوبیوں اور ان کی پاکیزہ سیرت کا اثر تھا۔ اعلیٰحضرت کے التفات کی وجہ سے لوگ یہ گمان کرنے لگے تھے کہ وہ عبدالرحمٰن کو ترکی سفارت سے لے کر اپنی حکومت میں کوئی اعلیٰ منصب عنایت فرما دیں گے۔ اس گمان کے بارے میں جب ایک روز رئیس تدریسات نے عبدالرحمٰن سے دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا: "میں دل سے چاہتا ہوں کہ ملت افاغنہ کی خدمت کروں لیکن نفس بہت طامع ہے افغانستان ترکی کی بہ نسبت بہت چھوٹا ہے اور میرا جذبہ خدمت اس پر مطمئن نہیں اور نفس قناعت نہیں کرتا اس لئے میرا جی تو یہ چاہتا ہے کہ اپنے لئے خدمت کا کوئی اور وسیع میدان تلاش کروں۔"

---

[1] اس کی لسانی توجیہہ درست نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ محض لطیفے کے طور پر اس کو بیان کر دیا گیا۔

ایک مرتبہ عید کی تقریب میں "باغ بابر" میں افغانی اتن یعنی فوجی ناچ ہو رہا تھا اور ساتھ ساتھ افغان نوجوان گیت گا رہے تھے اس موقع پر اعلیٰحضرت امان اللہ خاں عمائدین حکومت، امرار قوم اور بیرونی ممالک کے سفرا مقیم کابل بھی موجود تھے۔ ایک گیت میں ایک مقام پر حاضرین نے بہت جوش و مسرت کا اظہار کیا۔ انگریزی سفیر نے اعلیٰحضرت سے اس شعر کے ترجمے کی وضاحت کی درخواست کی۔ اعلیٰحضرت نے عبدالرحمٰن کی طرف اشارہ کیا کہ وہ اس کا مطلب بتائیں۔ عبدالرحمٰن نے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ "دشمن ہمارے ملک میں آکر کئی مرتبہ قوت آزمائی کر چکا ہے اس سے کہہ دو کہ اب اسے مزید تجربہ کی ضرورت نہیں۔ کچھ دیر بعد ایک عاشقانہ شعر پر بھی اسی طرح جوش و خروش کا اظہار کیا گیا۔ اس دفعہ روسی سفیر نے اس کے ترجمے کی درخواست کی۔ اعلیٰحضرت نے پھر عبدالرحمٰن سے اس کے ترجمے کی فرمائش کی لیکن ساتھ ہی کہا کہ اسی قسم کا مطلب بتائیں۔ لیکن عبدالرحمٰن نے اس مرتبہ کوئی جواب نہ دیا اور نہایت متانت اور سنجیدگی کے ساتھ خاموش بیٹھے رہے۔

سولہواں باب

سفارت سے سُبکدوشی

عبدالرحمٰن افغانستان میں ۱۹۲۳ء کے وسط تک ترکی سفارت کے منصب جلیلہ پر فائز رہے۔ چند ماہ سفارت سے سبک دوشی کے بعد مزید قیام کیا افغانستان میں قیام کے دوران میں بہت سے واقعات پیش آئے جن سے ان کے افکار وسیرت پر روشنی پڑتی ہے۔ ان میں سے چند واقعات کا پچھلے باب میں تذکرہ کیا جا چکا ہے یہاں سب سے پہلے ان حالات اور واقعات پر نظر ڈالنا چاہتے ہیں جو ترکی سفارت سے ان کی سبک دوشی کا سبب بنے۔

۱۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا سبب تو یہ ہے کہ وہ اپنی ذات سے ایک انقلابی شخصیت تھے اور اتحادِ عالم اسلامی کے داعی تھے۔ انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کے لئے اپنے وطن مالوف اور عزیز واقارب کو چھوڑا تھا لیکن اب سفیر کی حیثیت سے جو زندگی انہیں گزارنی چاہیئے تھی حقیقت یہ ہے کہ یہ جامہ ان کے قامت موزوں کے لئے زیب دہ نہ تھا۔ سفارت کے آداب و رسوم ان کی طبیعت اور مزاج سے بالکل مختلف تھے۔ سفارت کی محدود اور آداب وقیود کی پابند زندگی ان کے بس کا روگ نہ تھی۔ شاہی خاندان سے ان کی قرابت داری نے سفارتی تکلفات کو شروع ہی سے نہ پیدا ہونے دیا تھا اس کے علاوہ متعدد ایسے

مواقع پیش آ چکے تھے جن سے سفارت کے رسمی آداب کے لحاظ کی بجائے عبدالرحمٰن کی آزادانہ روش کا اظہار ہوتا تھا۔

۲۔ ایک اور اہم بات یہ تھی کہ عبدالرحمٰن کے تعلقات ہندوستان کے انقلابیوں سے تھے۔ ان میں وہ حضرات بھی تھے جو ریشمی رومال سازش کے بانی اور سرگرم رکن اور جنودِ ربانیہ میں بڑے بڑے عہدوں پر تھے۔ مثلاً، مولانا عبیداللہ سندھی، سازش کے اصل بانی اور جنود ربانیہ کے قائم مقام سالار۔ مولانا سیف الرحمٰن، سازش میں شریک۔ مولانا سندھی کے معتمد علیہ اور جنود ربانیہ میں میجر جنرل فضلِ ربی، سازش میں شریک، جنودِ ربانیہ میں کرنل کے عہدے پر فائز تھے۔ فضل محمود کو بھی سازش میں شریک بنایا گیا۔ جنود ربانیہ میں ان کا عہدہ لفٹننٹ کرنل کا تھا۔ ظفر حسن ایبک کو بھی سازش میں شمار کیا گیا۔ جنودِ ربانیہ میں وہ لفٹننٹ کرنل کے عہدے پر فائز تھے۔ خوشی محمد، لاہور سے فروری ۱۹۱۵ء میں ہجرت کرنے والے طلباء میں شامل تھے اور جنودِ ربانیہ کے عہدیداروں کی فہرست میں انھیں گورنر جنرل بنایا گیا۔

یہ تمام حضرات کم وبیش عبدالرحمٰن سے تعلقات رکھتے تھے۔ یہ تمام حضرات انگریزوں کے خطرناک دشمن تھے۔ انگریز انھیں ہندوستان اور اپنے کسی دوست ملک میں دیکھنے کے روادار نہ تھے اور اب افغانستان کی آزادی اور انگریزوں سے معاہدے کے بعد افغانستان میں بھی ناپسند کئے جانے لگے بلکہ اب افغانستان کی حکومت اس امر کی بھی روادار نہ تھی کہ انھیں اپنے ملک میں ہندوستان کی آزادی کے لیے کام کرنے کی اجازت دی جائے۔ انھی حالات کی بناء پر متعدد شخص نے خاموشی کی زندگی اختیار کر لی تھی اور بہت سے لوگ افغانستان سے دوسرے ملکوں کو ہجرت کر گئے تھے۔

چنانچہ خود عبدالرحمٰن کے دوستوں میں سے قاضی عبدالولی خاں، ڈاکٹر نور محمد، ظفر حسن ایبک مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کے متعدد ساتھی جرمنی اور روس چلے گئے تھے۔ ایسے حالات تھے ان میں ہندوستان کے انقلاب پسندوں کی بجائے انگریزوں کے سفیر کی بات چلتی تھی۔ انگریزوں کے لئے یہ بات ہرگز قابل برداشت نہ تھی کہ افغانستان میں عبدالرحمٰن جیسا انگریزوں کا دشمن سفارت کے بلند منصب پر فائز رہے۔

یہ حالات واسباب تھے جن میں عبدالرحمٰن کو سفارت کے عہدے سے سبکدوش ہونا پڑا۔ میرے خیال میں عبدالرحمٰن کی اس روش کا تعلق صرف انگورہ حکومت کی پالیسی یا مصطفیٰ کمال پاشا کی حکومت کے عام فیصلوں سے نہیں تھا۔ اس رائے کو فخری پاشا کے رویے سے بھی تقویت پہونچتی ہے کہ عبدالرحمٰن کی سبک دوشی معمول کا واقعہ نہ تھا۔

وسط ۱۹۲۲ء میں انگورہ حکومت نے جنرل فخرالدین پاشا کو جو فخری پاشا کے لقب سے مشہور تھے، افغانستان میں ترکی کا سفیر بنا کر بھیج دیا۔ جنگِ عظیم میں فخری پاشا حجاز کے گورنر تھے اور مدینہ منورہ کی حفاظت کے لئے انھوں نے نہایت سعی کی تھی اور اپنی خدمات کی بنا پر "منشیر ترکی" کا لقب پایا تھا۔ حجاز میں شریف مکہ کی بغاوت کے بعد فخری پاشا گرفتار ہو گئے تھے اور جزیرہ مالٹا میں انھیں قید کر دیا گیا تھا۔ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی نے سفرنامہ مالٹا میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔

فخری پاشا جس شان کے ساتھ افغانستان پہنچے اور جو رویہ انھوں نے اختیار کیا وہ ایک محتاط شخص کو متنبہ کر دینے کے لئے کافی تھا۔ فخری پاشا پینتالیس افراد کے ایک قافلے کے ساتھ وارد کابل ہوئے تھے۔ جس میں ترجمان، ڈاکٹر، سپاہی وغیرہ شامل تھے۔ عبدالرحمٰن نے سفارت خانے کے افسروں اور عملہ کے دیگر افراد کو ان کے

استقبال کے لئے کابل کی سرحد پر بھیج دیا اور خود سفارت خانے کے دروازے پر ان کا استقبال کیا۔ یہ بات فخری پاشا کو ناگوار گذری اور رسمی مزاج پرسی کے بعد عبدالرحمٰن سے اس کی شکایت کی کہ وہ کابل سے باہر ان کے استقبال کے لیے موجود نہیں تھے۔ عبدالرحمٰن نے اس کا مختصر سا جواب دیا کہ وہ سفارتی قاعدے کے مطابق سفارت خانے ہی میں ان کے منتظر تھے۔ فخری پاشا نے انھیں حکومت ترکی کے حکم سے مطلع کیا کہ اب ان کی جگہ فخری پاشا سفارت کے فرائض انجام دیں گے۔ عبدالرحمٰن نے خندہ پیشانی سے اس حکم کو قبول کیا اور سفارت کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو گئے۔ ترکی حکومت کا دوسرا حکم ان کے فوجی اعزاز میں ترقی کے بارے میں تھا جس میں انھیں اطلاع دی گئی تھی کہ اگرچہ وہ اس وقت فوجی خدمت انجام نہیں دے رہے ہیں لیکن فوجی عہدہ رکھنے کی بناء پر سیاسی خدمات کے صلے میں انھیں لفٹننٹ کے عہدے سے ترقی دے کر کپتان بنا دیا گیا ہے۔ فخری پاشا نے انھیں اس ترقی کی مبارکباد پیش کی اور کابل سے مراجعت کے بارے میں ترکی حکومت کے ایماء سے انھیں مطلع کیا۔ عبدالرحمٰن نے نہایت خوشی کے ساتھ سفارت خانے کی عمارت کو الوداع کہا اور امان اللہ خاں کے چچا سردار امین الدولہ کی کوٹھی میں منتقل ہو گئے۔ یہ کوٹھی دریائے کابل کے کنارے ایک نہایت پر فضا مقام پر واقع تھی۔ عبدالرحمٰن نے اپنے قیام افغانستان کے آخری چند ماہ اسی کوٹھی میں گذارے۔

سفارت سے سبکدوشی کے بعد جو مدت کابل میں بسر ہوئی اس مدت میں وہ بہت کم لوگوں سے ملتے تھے۔ یہ وقت انہوں نے فراغت و کتاب و گوشہ نشینی پر عمل کر کے گزارا۔ ان کے احباب ان سے ملنے کے لئے کبھی کبھی وہیں آجایا کرتے تھے۔ محمد حسین خاں

رئیس تدریسات سے انھیں غایت درجہ تعلق خاطر تھا۔ اس لیئے ان کے پاس کبھی کبھی چلے جاتے تھے۔ ایک دفعہ ان کے اصرار پر ان کے ایک دوست مرزا مجتبیٰ خاں کے ہاں بھی گئے اس کے سوا اس مدت میں وہ نہ کسی کے ہاں گئے نہ کسی کی دعوت قبول کی۔ اس زمانے میں انہوں نے اپنی سیاسی سرگرمیوں کو بھی ترک کر دیا تھا کیونکہ ان کا ارادہ واپس ترکی جانے کا تھا اس لیئے ان کا یہ رویہ نہایت صحیح اور دور اندیشی پر مبنی تھا۔ ان کی ترکی واپسی اور پھر ترکی تعمیر و ترقی کے کاموں میں سرگرمی سے حصہ لینے کی وجہ سے ترک قوم اور ان کے ترک احباب کے دلوں ان کی قدر و منزلت بہت بڑھ گئی۔

قیام افغانستان کے دنوں میں جو واقعات پیش آئے ان میں ایک اہم واقعہ عبدالرحمٰن کے والد حاجی غلام صمدانی اور ان کے بھائیوں کی ملاقات ہے۔ عبدالرحمٰن کو کامل دس سال گھر سے نکلے ہوئے ہو گئے تھے۔ اس دوران میں دنیا میں بڑے بڑے انقلابات آچکے تھے۔ پہلی عالمگیر جنگ نے یورپ اور ایشیا میں ایک انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ روسی انقلاب نے زار کے تخت کو اور جرمنی کی شکست نے قیصر کے تخت کو الٹ دیا تھا۔ سلطنت عثمانیہ کا خاتمہ ہو گیا تھا عبدالرحمٰن نے اس مدت میں زندگی کے بہت سے نشیب و فراز دیکھے تھے۔ ان کی زندگی کے شب و روز حوادث و آلام سے ہنستے کھیلتے گزری تھی۔ خاندان اور ان کے مابین صرف خط و کتابت ہی معلومات کا ذریعہ تھا۔ بعض اوقات اس میں تاخیر ہو جاتی تو گھر والے بہت پریشان ہو جاتے۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں جب انھیں خبر ملی کہ عبدالرحمٰن ترکی سفیر کے منصب پر فائز ہو کر افغانستان پہنچ چکے ہیں تو والد اور اعزہ کی محبت نے جوش مارا۔ سفر کی تیاری کی اور جون سنہ ۱۹۲۲ء میں حاجی غلام صمدانی اپنے دو بیٹوں، محمد حسین (جامعی) اور محمد یحییٰ خاں (علیگ)

کو ساتھ لے کر افغانستان تشریف لے گئے۔ عبدالرحمٰن اس وقت تک ترکی سفارت کے عہدے پر فائز تھے اس لئے عبدالرحمٰن اور ان کے والد غلام صمدانی کی ملاقات یوسف ویعقوب (علیہم السلام) کی ملاقات تھی۔ بیٹے نے باپ کی قدم بوسی کی سعادت حاصل کی۔ باپ نے بیٹے کے روئے روشن کی دید سے اپنی آنکھوں کو ٹھنڈا کیا اور جبین تاباں کے بوسوں سے دِل کو سکون بخشا بھائیوں کے سینے خوشی اور فخر سے پھولے ہوئے تھے۔ عبدالرحمٰن ان کا یوسف گم گشتہ تھا جو انھیں مل گیا تھا۔ باپ ان کی عظمت اور منزلت پر شاداں و فرحاں تھے۔ بھائی ان کی شان و شوکت اور ترقی پر نازاں تھے۔

عبدالرحمٰن کی عمر اس وقت تقریباً ۲۵ سال کی تھی۔ اس عمر میں ماں باپ بھی اولاد کا لحاظ کرتے ہیں اور ان سے وہ خدمت نہیں لیتے جو گھر کے چھوٹے بچوں سے لیتے ہیں لیکن عبدالرحمٰن کی سعادت مندی نے تو اس دن کے لئے کتنی راتیں جاگ کر بسر کی تھیں۔ اس موقع پر باپ کی خدمت کی سعادت سے محرومی کیوں کر گوارا کر سکتے تھے چنانچہ وہ باپ کی خدمت پر اس طرح کمر بستہ ہو گئے جس طرح وہ بچپن میں باپ کی خدمت کیا کرتے تھے۔ صبح و شام کے معمولات میں ان کی خدمت کرنا۔ طہارت و وضو کے لئے پانی رکھنا۔ کپڑے درست کرنا، ان کے پیر دابنا، عبدالرحمٰن نے اپنا معمول بنا لیا۔ والد ہر چند انھیں منع کرتے لیکن وہ کہتے تھے۔ مجھے آپ کی خدمت کرنے کا بہت کم موقع ملا ہے۔ میں آپ کی یہ سب خدمت خود کروں گا اور وہ برابر اس خدمت میں اپنی سعادت مندی اور نیک طبعی کا ثبوت دیتے رہے اور والد کے قلب مومن سے نکلی ہوئی دعاؤں سے اپنے دامن مراد کو بھرتے رہے۔

حاجی غلام صمدانی اپنے ساتھ تقریباً پچاس ہزار روپے کی ایک رقم عبدالرحمٰن کے

لیئے لے کر گئے تھے۔ ایک روز انھوں نے عبدالرحمٰن سے کہا" میں نے اپنے دوسرے فرزندوں کو بہت سی جائیداد اور نقد وجنس کا مالک بنا کر انھیں ان کا حق دے دیا ہے لیکن تم چونکہ ملک سے باہر تھے اس لئے تم اس میں حصہ نہیں پا سکے تمہارے لئے میں یہ نقد روپیہ اپنے ساتھ لایا ہوں۔ یہ تم لے لو۔ عبدالرحمٰن نے کہا" آپ نے مجھے تعلیم دلائی، میری اچھی تربیت کی۔ اس تعلیم و تربیت کی بدولت مجھے اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کی توفیق ملی پھر ہمیشہ آپ کی دعاؤں نے میری دستگیری کی میری مشکلات کو آسان کیا اس کے بعد مجھے نہ کسی چیز کی ضرورت پیدا ہوئی اور نہ میرا آپ پر کوئی حق رہا۔ میں تو اس پر نادم ہوں کہ آپ کی جو خدمت مجھے کرنی چاہیئے تھی، وہ نہیں کر سکا۔ اس کے لئے آپ سے معافی کا خواستگار ہوں۔ آپ مجھے معاف کر دیجیے۔ یہی میری سب سے بڑی خوشی اور تمنا ہے۔ مجھے روپے پیسے کی بالکل ضرورت نہیں۔" جب والد نے بہت اصرار کیا تو اس شرط پر یہ رقم قبول کی کہ اسے رفاہ عام اور مسلمانوں کے فلاح کے کاموں پر صرف کیا جائے گا۔ چنانچہ عبدالرحمٰن نے یہ رقم ترکی اور ہندی درسگاہوں میں تقسیم کر دی۔ بعض حضرات کو خیال پیدا ہوا کہ عبدالرحمٰن نے افغان طلبہ اور درسگاہوں کو اپنے فیضان سے محروم رکھا آپ نے فرمایا کہ مجھے اس کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ اس لئے کہ افغان طلبہ کی تعلیمی ضروریات تو حکومت پورا کر دیتی ہے اور ان سے کوئی فیس بھی نہیں لی جاتی۔ آپ کے دوست محمد حسین خاں رئیس تدریسات نے بتایا کہ اس کے باوجود ایسے نادار، مفلس اور یتیم طلبہ بھی ہیں جو نہایت تنگدستی میں زندگی بسر کرتے ہیں اور بعض اوقات درس کے بعد محنت مزدوری کرتے ہیں۔ عبدالرحمٰن نے کہا، میرے علم میں یہ صورتِ حال نہیں تھی

اگر مجھے یہ معلوم ہوتا تو میں افغان طلبہ کی بھی ضرور مدد کرتا۔ اب صرف ایک ہزار روپیہ کابلی باقی ہے اسے قبول کیجئے لیکن میرا نام ظاہر نہ کیجیے۔ چنانچہ عبدالرحمٰن کی یہ پیش کش قبول کرلی گئی لیکن جب مکاتب کے رسالے میں اس رقم کا اعلان کیا گیا تو سردار محمد عثمان خاں وزیر معارف نے فرمایا کہ یہ معطی جو اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتا عبدالرحمٰن کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ عبدالرحمٰن کے والد اور بھائیوں نے ۱۵ر جولائی ۲۲ء تک کابل میں قیام کیا اور پھر پشاور لوٹ آئے۔ اکتوبر ۱۹۲۲ء میں عبدالرحمٰن کے بڑے بھائی حاجی محمد امین نے برما سے جہاں وہ کاروبار کے سلسلے میں مقیم تھے، کابل کا سفر کیا اور عبدالرحمٰن سے ملاقات کی۔ ان کے واپس جانے کے بعد عبدالرحمٰن نے ترکی کے سفر کی تیاری شروع کی اور ۳۰ر نومبر ۱۹۲۲ء کو کابل چھوڑ دیا۔

ستر ھواں باب

ترکی کو مراجعت

عبدالرحمن افغانستان سے برلن گئے اور کچھ عرصہ وہاں قیام کرنے کے بعد ترکی پہنچے۔ اس وقت تک قسطنطنیہ پر مصطفیٰ کمال پاشا کا قبضہ ہو چکا تھا۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ عبدالرحمن ترکی ۶ اکتوبر ۱۹۲۳ء کے بعد پہنچے ہوں گے۔ عبدالرحمن کی عدم موجودگی میں ترکی میں بڑے انقلابات آچکے تھے۔ فاتح قوموں کی شہ پر یونان نے سمرنا پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا[1] تھا۔ اب ان کی فوجیں ایشیائے کوچک میں پیش قدمی کر کے انقرہ کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ مصطفیٰ کمال پاشا نے نہ صرف ان کی پیش قدمی کو روک دیا بلکہ انقرہ سے بچپن

---

[1] سمرنا پر یونان کے قبضے کی خبر برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں پر بجلی بن کر گری، اس موقع پر مسلم اخبارات نے مضامین نظم و نثر شائع کئے۔ مولانا ظفر علی خاں بھی اس حادثہ پر خون کے آنسو روئے ان کی ایک نظم سمرنا کے عنوان سے روزنامہ زمیندار میں شائع ہوئی۔ ان کی یہ نظم ان کے مجموعہ کلام "حبسیات" میں شامل ہے۔

اے سمرنا کی زمین تجھ پہ خدا کی رحمت

خونِ اسلام کے چھینٹوں سے سیراب ہے تو

میل کے فاصلے پر ان کو شکست فاش دی اور انھیں پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا اور چند ماہ کی تیاری کے بعد سمرنا کو بھی آزاد کرا لیا اور یونانی فوجوں کو اپنی سرحدوں سے پیچھے ڈھکیل دیا۔ رؤف بے عبدالرحمٰن کی عدم موجودگی میں گرفتار ہو گئے تھے پھر انھیں رہائی مل اور اب وہ جدید ترکی کے وزیر اعظم تھے۔ جب وہ افغانستان روانہ ہوئے تھے تو قسطنطنیہ پر اتحادیوں کا قبضہ تھا اور سلطان وحید الدین ان کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنا ہوا تھا لیکن اس دوران میں اس کی قسمت کا ستارہ بھی غروب ہو چکا تھا اور وہ ۷ نومبر ۱۹۲۲ء کو قسطنطنیہ سے بھاگ کر ایک برطانوی جنگی جہاز پر پناہ گزیں ہوا اور پھر ہمیشہ کے لئے ترکی کے ساحل سے دور ہوتا چلا گیا۔ سلطان وحید الدین کی جگہ عبدالمجید خاں خلیفۃ المسلمین مقرر ہوئے۔ اس کے علاوہ بہت سے اندرونی واقعات رونما ہو چکے تھے۔

جب عبدالرحمٰن دوبارہ ترکی واپس پہنچے تو ان کے دوستوں نے گرم جوشی کے ساتھ

ارغواں پاش ترے فیض سے ہے دیدۂ تر
ریزشِ اشک کو سرمایۂ عناب ہے تو
عرش تھرائے نہ کیوں فرش لرز جائے نہ کیوں
آہ تیرا ہے تو نالۂ پنجاب ہے تو
آلِ عثمان کی عزت کی حفاظت کی طرف
کسی تیمور کی غیرت کی عناں تاب ہے تو
تختۂ یونان کا الٹ کفر کے بیڑے کو ڈبو
جیسے خود خون کے سیلاب میں غرقاب ہے تو

ان کا استقبال کیا۔ ترکی ان کے لئے کوئی نیا ملک نہ تھا یہ گویا اب ان کا وطنِ ثانی بن چکا تھا۔ زندگی کے ہر گوشے میں ان کے احباب اور قدرداں موجود تھے۔ رؤف بے کی وزارتِ عظمیٰ کے زمانے میں اس قسم کے مواقع تھے کہ عبدالرحمٰن حکومت میں کوئی بڑا عہدہ حاصل کر لیتے لیکن وہ عہدہ ومنصب اور زرومال کے حصول کے لئے ترکی نہیں گئے تھے۔ وہ صرف ترکوں کی خدمت کرنا چاہتے تھے۔ وہ اپنی خدمات ملی کا دائرہ وسیع سے وسیع تر رکھنا چاہتے تھے۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ حکومت میں کوئی عہدہ یا منصب قبول نہ کریں اور آزاد رہ کر ترکوں کی خدمت میں مصروف رہیں۔ اگر حکومت کے عہدہ اور وسائل سے کام لینے کی ضرورت ہو تو رؤف بے کی وزارتِ عظمیٰ میں عبدالرحمٰن کو تمام وسائل یوں بھی حاصل تھے اور وہ ان سے ملک کی تعمیر و ترقی میں کام لے رہے تھے۔

عبدالرحمٰن اس طرح ترکی کی خدمت میں مصروف رہے۔ انھوں نے نہ تو حکومت میں کوئی عہدہ قبول کیا نہ کسی خاص جماعت کی جھولی میں اپنی وفاداریوں کو ڈال دیا۔ ان کے پیشِ نظر ترکی کا عظیم مفاد تھا اور وہ مفاد جس طرح بھی حاصل ہو، حاصل کرنے کے قائل تھے۔ عبدالرحمٰن ایک ایسی شخصیت تھے، ان کی ملی بہی خواہی اتنی مسلّم اور ان کے ظرف کا پیمانہ اتنا وسیع تھا کہ اگر کسی مسئلہ میں ضرورت ہوتی تو ہر جماعت کے رہنما سے مل کر اس کے اثرات سے کام نکال لیتے تھے اور حکومت کے وسائل سے کام لینے کی ضرورت ہوتی تو رؤف بے کی وجہ سے اس میں بھی کوئی رکاوٹ پیش نہ آتی تھی۔

۱۹۲۴ء میں حالات نے پھر ایک بار پلٹا کھایا اور مصطفیٰ کمال پاشا سے بعض امور میں اختلاف کی وجہ سے رؤف بے کو وزارتِ عظمیٰ چھوڑ دینی پڑی۔ مصطفیٰ کمال پاشا ترکی

جدید جمہوریت کی راہوں پر چلانا چاہتے تھے۔ دوسری طرف ملک میں منصب خلافت بھی قائم تھا۔ ان دونوں مسلکوں میں درمیان کی راہ کسی کے سامنے نہ تھی۔ بعض تلخ تجربات نے مصطفیٰ کمال کے ذہن و فکر کو متاثر کیا تھا اور اب وہ ملک میں مزید کوئی تجربہ کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ رفتہ رفتہ ان کا یہ خیال پختہ ہوتا گیا کہ جدید دور کے تقاضوں سے خلافت کا منصب ہم آہنگ نہیں ہو سکتا۔ ظفر حسن ایبک نے بعض حالات کی طرف اشارہ کیا ہے جن سے ان حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے جو مصطفیٰ کمال سے رؤف بے کے اختلاف کا باعث بنے۔ ظفر حسن لکھتے ہیں :

> " دنیا کے دوسرے اسلامی ملکوں کا خلیفۃ المسلمین سلطان محمد رشاد خاں مرحوم کے ۱۹۱۵ء میں شائع کردہ فتوئ جہاد پر کان نہ دھرنا اور ہندوستانی مسلمان فوجوں کا عراق اور فلسطین کے محاذوں پر ترکوں کے خلاف لڑنا ایسے واقعات تھے کہ جن کی وجہ سے غازی مصطفیٰ کمال پاشا اتاترک جنھوں نے سلطنت عثمانیہ کی پہلی جنگِ عظیم میں شکست کھانے کے بعد اس کے بعد اس کے کھنڈروں پر نئی اور آزاد ترکی کی جمہوری حکومت کی بنیادیں رکھی تھیں، مسلمانانِ عالم کی اس بے وفائی اور لاپروائی سے دل برداشتہ ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ وہ اپنی نئی حکومت کو اتنا طاقت ور نہ سمجھتے تھے کہ غلام مسلمان ملکوں کی حمایت کر کے اپنے ملک کو استعماری ملکوں کے غیظ و غضب کا پھر نشانہ بنائیں۔ اس لئے انھوں نے ترکی سے خلافتِ اسلامیہ کو اٹھا دیا اور خلیفہ عبدالمجید خاں کو ۳ر مارچ ۱۹۲۴ء کو ترکی سے دیس بدر کر دیا۔ "

ملک میں جمہوریت اور خلافت کے دوہرے نظام کی وجہ سے جو مشکلات پیش آرہی تھیں۔ ان سے رؤف بے بھی واقف تھے اور وہ بھی بعض اصلاحات کرنے میں مصطفیٰ کمال کے ہم خیال تھے لیکن وہ اس حد تک جانے کے لئے تیار نہیں تھے کہ منصبِ خلافت کو ختم کر دیا جائے۔ وہ اس باب میں مصطفیٰ کمال کے ہم خیال نہیں تھے کہ ملکی ترقی کے لئے یورپی معاشرت لازمی ہے یا ترکی رسم الخط ترقی کی راہ میں مانع ہے یا جب تک عورتیں بے پردہ نہ ہو جائیں گی قوم کی ترقی رُکی رہے گی۔ یا اس وقت تک دنیا کی قوموں میں ہمارا سر افتخار سے بلند نہ ہوگا جب تک علمائے دین کا مخصوص وضع کا لباس قانوناً ممنوع قرار نہ دے دیا جائے گا۔

عبدالرحمٰن اس سلسلے میں رؤف بے کے ہم خیال تھے اگرچہ وہ ایک فعال سیاسی لیڈر کی حیثیت سے ترکی کی سیاست میں حصہ نہیں لے رہے تھے۔ لیکن ان کے خیالات، رؤف بے کے تعلقات اور فوج اور زندگی کے دوسرے حلقوں میں اپنے اثرات کی بنا پر وہ ایک معروف شخصیت تھے۔ اس لئے عبدالرحمٰن کی شخصی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مصطفیٰ کمال پاشا اور رؤف بے کے اختلافات کے بارے میں ظفر حسن لکھتے ہیں:

"۱۹۲۴ء میں ترکی میں داخلی سیاست کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ رؤف بے کی بجائے عصمت پاشا وزیر اعظم بنے اور ملک میں غازی مصطفیٰ کمال پاشا اتاترک کی بنائی ہوئی جمہوریت خلق پارٹی کے مقابلہ میں جمہوریت ترقی پرور پارٹی بنی جس کے لیڈر رؤف بے اور جنرل کاظم قرہ بکیر پاشا تھے۔ یہ پارٹی پرانی ترکی روایات کو قائم رکھنے کی طرف دار تھی اگرچہ بظاہر

اس نے خلافت اسلامیہ کے ترکیہ سے اُٹھا دیئے جانے کو منظور کر لیا تھا لیکن ان تمام اصلاحات کے برخلاف تھی جو جمہوریت خلق پارٹی ملک میں ہر روز جاری کر رہی تھی۔ اس لیۓ جمہوریت ترقی پسند پارٹی پر قدامت پسندی کا الزام لگایا جاتا تھا۔"

حکومت سے رؤف بے کی علیحدگی کے بعد عبدالرحمن اور رؤف بے دونوں قسطنطنیہ چلے گئے۔ اس دوران میں قسطنطنیہ کا زمانۂ قیام سیاست کی ہنگامہ آرائیوں سے الگ تھلگ دوستوں سے ملنے جلنے میں گزارا۔ اس زمانے میں مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم اور ان کے بھتیجے مولوی عزیز احمد بھی قسطنطنیہ میں تھے۔ مولانا سندھی جولائی ۱۹۲۲ئہ میں ماسکو سے ترکی روانہ ہوتے تھے۔ ترکی میں چند دن ان کا قیام انقرہ میں رہا۔ جب اکتوبر ۱۹۲۳ئہ میں قسطنطنیہ میں ترکوں کی فوج کا قبضہ ہو گیا تو اس کے تقریباً دو ہفتے کے بعد مولانا قسطنطنیہ گئے اور ہندوستانی خانقاہ میں قیام کیا۔ اس زمانے میں عبدالرحمن بھی قسطنطنیہ آگئے تھے۔ اور مولانا سندھی سے ملتے رہتے تھے۔ مولانا کو ان کی وجہ سے ترکی سیاست کو سمجھنے میں بڑی مدد ملی۔ عبدالرحمن نے انھیں ترکی سیاست کی ان اندرونی اور پس پردہ باتوں سے آگاہ کیا جن سے اخبارات کے ذریعہ واقف ہونا قطعاً ناممکن تھا۔ ظفر احسن ایبک لکھتے ہیں۔

"قبلہ مولانا صاحب (مولانا عبیداللہ سندھی) کی استانبول کی سیاسی کارروائیوں کے ذیل میں ان کی اور عبدالرحمن پشاوری کی باہمی گفتگو اور ملاقاتوں کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔ عبدالرحمن پشاوری کابل کی ترکی سفارت سے واپس آکر رؤف بے کے پاس رہا کرتے تھے۔ رؤف بے

کی والدہ نے انھیں اپنا بیٹا بنالیا تھا۔۔۔۔۔۔عبدالرحمٰن پشاوری قبلہ مولانا صاحب کو ترکی داخلی سیاست اور دونوں پارٹیوں کی باہمی رقابتوں اور جھگڑوں کا حال سنانے اکثر ہندوستانی خانقاہ میں آیا کرتے تھے۔"

مولانا سندھی کابل میں قیام کے زمانے میں ایک بین المسلمین مسلم یونیورسٹی کے قیام کے لئے کوشاں تھے۔ افغان حکومت نے انھیں یونیورسٹی کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تھا۔ مولانا سندھی کو ترکی پہنچ کر پھر خیال آیا کہ اگر اس سرزمین پر انھیں یونیورسٹی قائم کرنے کی اجازت مل جائے تو وہ اس کے ذریعہ نہ صرف ہندوستان کی آزادی بلکہ مسلمانانِ عالم کی بہترین خدمات انجام دے سکیں گے۔ اس سلسلے میں رؤف بے سے ملاقات کے انتظام کے لئے مولانا سندھی نے عبدالرحمٰن سے کہا تھا اور انہوں نے اس تاریخی ملاقات کا انتظام کروا دیا اگرچہ مولانا سندھی رؤف بے کو اپنا ہم خیال بنانے اور ان کا تعاون حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ ظفر حسن لکھتے ہیں :

"قبلہ مولانا صاحب ترکی سے خلافت اسلامیہ کے مٹ جانے کے بعد اس کوشش میں تھے کہ کم از کم ترکی میں ایک بین المسلمین یونیورسٹی کی بنیاد ڈالنے کے لئے موجودہ ترکی جمہوری حکومت ان کو اجازت دیدے تاکہ وہ اس طرز پر اسلامی شیرازے کو ایک حد تک پھر قائم کر دیں۔ اس لئے انہوں نے رؤف بے سے ملنا چاہا اور عبدالرحمٰن پشاوری سے اس ملاقات کا انتظام کرنے کو کہا :

"اس ملاقات میں ترجمانی کے لئے قبلہ مولانا صاحب کے ساتھ میں رؤف بے مرحوم کے گھر گیا۔ رؤف بے مرحوم بہت شستہ انگریزی بولتے تھے۔ اس

ملاقات کے دوران میں جنرل کاظم قرہ بکیر پاشا مرحوم بھی موجود تھے۔ گفتگو کے ذیل میں قبلہ مولانا صاحب نے رؤف بے کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ وہ اپنی پارٹی کے پروگرام میں استانبول میں ایک انٹرنیشنل مسلم یونیورسٹی کے قیام کو بھی داخل کر لیں۔ رؤف بے نے اس تجویز کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ ایسی تجویز انھوں نے اپنی پارٹی کے پروگرام میں داخل کی تو جمہوریت خلق پارٹی، جو ان کی پارٹی پر پہلے ہی قدامت پسندی کا الزام لگا رہی ہے،
ان پر اتحاد عالمِ اسلامی اور پرانی روایتوں کو پھر زندہ کرنے کی تہمت لگائے گی۔"
اور اس طرح ان کی پارٹی کو ترکی کے تعلیم یافتہ طبقے کی نگاہ سے گرا دے گی،"

"قبلہ مولانا صاحب نے یہ جواب سُن کر اس ملاقات کو اور طول دینا مناسب نہیں سمجھا اور رؤف بے سے رخصت لے کر ہندوستانی خانقاہ کو واپس آ گئے۔ ان کو رؤف بے کے اس جواب سے اتنی مایوسی ہوئی کہ میں نے عمر بھر کبھی ان کو اتنا نا امید نہیں دیکھا تھا۔ ان کی مسلمانوں کو پھر ایک سلسلہ میں منسلک کرنے کی اُمیدوں پر پانی پھر گیا۔ اس لئے ان کی بے چینی کی انتہا نہ رہی تھی۔

"رؤف بے سے مولانا سندھی کی مایوسی کے بعد بھی عبدالرحمٰن سے ان کے تعلقات میں فرق نہ آیا۔ وہ اسی طرح مولانا سے خلوص و محبت سے ملتے رہے اور مولانا محلہ اق سرائے میں ہندوستانی خانقاہ سے استانبول کے مضافات میں قصبہ کو ملیجہ میں جا کر مقیم ہوئے تو عبدالرحمٰن وہاں بھی مولانا سے ملنے جاتے رہے۔ انہوں نے اسعد فواد بے سے بھی مولانا سندھی کی ملاقات کا انتظام کرایا تھا۔

اسعد فواد بے سے عبدالرحمٰن کے تعلقات ۱۹۱۲ء سے تھے۔ اسعد فواد بے نے جنگِ بلقان کے زمانے میں بہت خدمات انجام دی تھیں۔ ہندوستانی طبی وفد کی ایک جماعت کے ساتھ جس کے انتظام کے ذمہ دار چودھری خلیق الزماں تھے۔ گیلی پولی کے محاذ پر چناق قلعہ کے طبی مرکز میں وہ بھی ڈاکٹر تھے۔ عبدالرحمٰن سے وہ بڑی محبت کرتے تھے بعد میں تو دونوں میں بہت گہرے تعلقات ہو گئے تھے۔ اسعد فواد نے اپنے ایک خط میں انہیں عزیز دوست کے نام سے یاد کیا ہے اس کے علاوہ عبدالرحمٰن پشاوری پر ان کے اعتماد کا یہ کتنا بڑا ثبوت ہے کہ ان کے کہنے پر انہوں نے مولانا سندھی کی مہینوں تک مالی مدد کی۔

اسعد فواد سے مولانا سندھی کی ملاقات کے بارے میں ظفر حسن لکھتے ہیں :

"عبدالرحمٰن بے پشاوری کو طیجہ میں بھی مولانا صاحب سے ملنے آیا کرتے تھے انہوں نے قبلہ مولانا صاحب کے اسعد فواد بے کے نام کے ایک محترم ترک سے ملنے کا انتظام کیا۔ میں اس ملاقات میں قبلہ مولانا صاحب کے ساتھ ترجمان ہو کر گیا۔ اسعد فواد بے مشہور ترکی مارشل فواد پاشا مرحوم کے فرزند ہیں۔ مارشل مرحوم سلطان عبدالحمید خاں ثانی کے زمانے میں مختلف جنگوں میں دلاوری دکھانے کی وجہ سے بہت مشہور ہوئے تھے۔ جتنی لڑائیوں میں وہ شریک ہوئے ان میں ہمیشہ اپنی فوج کے آگے شمشیر بکف دشمن پر حملہ کیا کرتے تھے۔ اس لئے لوگ اُن کو " دیلی فواد" یعنی من چلا فواد کہنے لگے تھے۔ اسعد فواد بے ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی جوہر، عبدالرحمٰن صدیقی کے گہرے دوست تھے اور ڈاکٹر انصاری اور عبدالرحمٰن صدیقی سے جنگِ بلقان میں ہندوستانی طبی وفد ہلال احمر کے سلسلہ میں مل چکے تھے۔ وہ بہت اچھی انگریزی بولتے

تھے۔ ایک زمانے میں تو استانبول کے امریکن رابرٹ کالج میں تاریخ اسلام پر اعزازی طور پر لکچر دیا کرتے تھے۔ انہوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر فرانسیسی میں ایک بڑی کتاب بھی لکھی تھی۔ ان کی بیوی پرنسس زیبا ایک مصری شہزادی ہیں جن کی مصر میں بہت بڑی جائیداد تھی۔ وہ ایک پڑھی لکھی خاتون تھیں۔ مولانا محمد علی جوہر کے اخبار کامریڈ کا مصر میں سب سے پہلے تعارف شاہزادی زیبا ہی نے کرایا تھا اسعد فواد بے خود بھی عالم و فاضل ہیں اور علم دوست بھی ہیں اور ممکن طور پر عالموں کی سرپرستی کرتے رہتے ہیں خلافت کے وفد کے ساتھ مولانا محمد علی جوہر جب سوئٹزرلینڈ گئے تھے تو جمعیت اقوام کے سربرآوردہ لیڈروں سے ان کی ملاقات اسعد فواد بے ہی نے کرائی تھی۔ قبلہ مولانا صاحب کی اسعد فواد بے سے اس موقع پر زیادہ تر تاریخ اسلام پر باتیں ہوئیں۔ کوئی سیاسی مسئلہ زیر بحث نہیں آیا۔ اسعد فواد بے اس ملاقات سے بہت خوش ہوتے۔ بعد میں ہمیں عبدالرحمٰن بے پشاوری سے معلوم ہوا کہ اسعد فواد بے قبلہ مولانا صاحب کی علمی قابلیت اور تاریخی معلومات کے بڑے قائل ہو گئے ہیں۔"

عبدالرحمٰن نے صرف اتنا ہی نہیں کیا کہ اسعد فواد بے سے مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم کی ملاقات کروائی بلکہ مولانا سندھی کی مالی حالت کا اندازہ کر کے اسعد فواد بے نے انھیں مالی امداد بھی دلوائی۔ مولانا سندھی جب ہندوستانی خانقاہ میں مقیم تھے تو ایک خطیر رقم ان کے بکس سے چوری ہو جانے کی وجہ سے وہ بہت پریشان اور تنگدست تھے۔ قصبہ کوپلیجہ میں جا کر رہنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہاں مکان بھی کم کرائے پر مل گیا تھا اور شہر کے مقابلے میں کھانے

پینے کے اخراجات بھی وہاں کم تھے۔ اس زمانے میں ترکی میں غیر ملکیوں کے لئے ملازمت حاصل کرنا بھی آسان نہ تھا۔ اس لئے ظفر حسن یا مولوی عزیز احمد کا ملازمت کر کے اس تنگدستی کو دور کرنے کا سوال بھی ٹیڑھا تھا۔ مولانا کی اس مشکل کو عبدالرحمٰن نے اسعد فواد بے سے کہہ کر دور کرا دیا۔ پہلے مولانا کو ایک معقول رقم قرض دلوا دی لیکن بعد میں ایک خاص فنڈ سے ان کی مستقل اعانت کا انتظام کروا دیا۔ ظفر حسن لکھتے ہیں :

"قبلہ مولانا صاحب مجبور ہوتے کہ عبدالرحمٰن بے پشاوری کے ذریعہ اسعد فواد بے سے ۳۰۰ لیرے تقریباً ۵۴ پونڈ قرض لیں لیکن ہماری کوئی باقاعدہ آمدنی نہ ہونے کی وجہ سے اس طرح آئے دن قرض لے کر گذارہ کرنا ناممکن تھا۔ ہمارا گمان ہے کہ عبدالرحمٰن بے پشاوری نے قبلہ مولانا صاحب کی مالی اعانت کا اسعد فواد بے سے ذکر کیا ہوگا اور انہوں نے اس وجہ سے اپنی بیوی کی مصری جائیداد کی آمدنی کے ایک حصہ میں سے جو علمی خدمات اور عالموں کی مدد کے لئے رکھا ہوا تھا، قبلہ مولانا صاحب کو ماہوار ۵۰ لیرے (سو روپے) دینا شروع کر دیئے .... ان کی یہ مالی معاونت ہمارے لئے اس وقت درگاہِ الٰہی سے آئی ہوئی ایک غیبی مدد ثابت ہوئی ورنہ ہم شاید فاقہ کشی کرتے۔ ان کی یہ حمیتِ اسلامی بہت قابلِ داد ہے۔ میں جب تک زندہ ہوں ان کا مرہونِ احسان رہوں گا۔"

غرض کہ عبدالرحمٰن جب تک زندہ رہے، مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کے ساتھیوں کی ہر طرح مدد کرتے رہے۔ انہوں نے مولانا سندھی کو ترکی سیاست سے واقف کیا۔ ترکی کے اہلِ قلم سے تعارف کرایا اور جب مولانا کو مالی مشکلات پیش آئیں تو اس

کا بھی مناسب انتظام کر دیا لیکن افسوس کہ مولانا سندھی ابھی ترکی میں تھے کہ عبدالرحمن ایک ظالم کی گولی کا نشانہ بن گئے۔ ظفر حسن ان کی شہادت پر لکھتے ہیں:

"ان کی موت کی وجہ سے ہم ایک وفادار دوست کی ہستی سے محروم ہو گئے۔"

اٹھارواں باب

شہادت

۲۴ مئی ۱۹۲۵ء کو بمبئی کرانیکل میں ایک خبر شائع ہوئی کہ :

"۲۰ اور ۲۱ مئی ۱۹۲۵ء کی درمیانی رات کو قسطنطنیہ میں ایک ہندوستانی مسمی عبدالرحمٰن پشاوری کو جو ڈاکٹر انصاری کے طبی وفد کے ساتھ ۱۹۱۲ء میں ترکی گئے تھے تین حملہ آوروں نے شدید طور پر زخمی کر دیا۔ ایک گولی ان کے دائیں پھیپھڑے سے گذر کر ریڑھ کی ہڈی کو زخمی کرتی ہوئی نکل گئی۔ ان کی حالت مخدوش ہے اگر وہ بچ بھی گئے تو بدن کا زیریں حصہ ہمیشہ کے لئے بیکار ہو جائے گا۔ اس وقت وہ ہسپتال میں قسطنطنیہ کے بہترین ڈاکٹروں کے زیر علاج ہے۔"

اس خبر کے شائع ہوتے ہی پورا ملک حیرت و استعجاب اور رنج و اندوہ کے اندھیروں میں ڈوب گیا۔ یہ خبر اگرچہ اپنے مواد کے لحاظ سے مختصر تھی لیکن اپنے اثرات کے لحاظ سے ہمہ گیر تھی۔ جہاں تک ان کے عزیز اور رشتہ داروں کا تعلق تھا ان کا صدمہ تو فطری تھا۔ لیکن فی الحقیقت یہ ایک قومی حیثیت کا سانحہ تھا اور اس غم میں پورا اسلامی ہند ان کے عزیزوں کا شریک تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس حادثے پر متعدد اخبارات نے اداریے لکھے اور ترکی حکومت

کواس حادثے کے اسباب کی تحقیق کرنے کی طرف توجہ دلائی لیکن اہلِ خاندان اس وجہ سے خاص طور پر پریشان تھے کہ رؤف بے کی طرف سے براہ راست کوئی خبر نہ آئی تھی۔ عبدالرحمٰن کے والد حاجی غلام صمدانی نے رؤف بے کو تار دیا کہ صحیح حالات سے مطلع فرمائیں۔ شدید انتظار کے بعد ۹ر جون کو رؤف بے کا تار موصول ہوا کہ "افسوس! عبدالرحمٰن کی حالت خطرناک ہے۔" اس طرح متعدد تار آئے اور گئے لیکن ان سے حالات کی تفصیلات معلوم نہیں ہو سکیں۔

واقعہ کی تفصیلات کا علم اسعد فواد کے ۲۴ مئی ۱۹۲۵ء کے اس خط سے ہوا جو انہوں نے قسطنطنیہ سے عبدالرحمٰن صدیقی کے نام لندن لکھا تھا۔ صدیقی مرحوم نے اپنے ۴ر جون کے خط کے ساتھ حاجی غلام صمدانی کو پشاور روانہ کر دیا۔ اسعد فواد نے اپنے خط میں لکھا تھا:

"میں آپ کو ایک نہایت افسوسناک خبر دے رہا ہوں۔ ہمارے عزیز دوست عبدالرحمٰن پشاوری پر ۲۰ اور ۲۱ر ماہ رواں کی شب کو ایک مجرمانہ حملہ کیا گیا۔ آپ رؤف بے کے دوست کو بے کر واپس آ رہے تھے کہ راستے میں تین شخصوں نے بمقام نشان طاش ایک غیر آباد کوچے میں آپ پر حملہ کر دیا۔ آپ نے بھی مجرموں پر فائر کئے اور ان میں سے ایک کو زخمی بھی کیا۔ بارش میں چار گھنٹے آپ اسی جگہ پڑے رہے۔ بعدہ بیکچی (پولیس) نے آپ کو وہاں سے شِشلی کے بارود خانے کے ہسپتال میں پہنچایا۔ شعبہ تحقیق جرائم کی تفتیش سے پہلے اس مجرمانہ حملے کی بابت رائے زنی نہیں کی جا سکتی۔"

"عبدالرحمٰن کی حالت بہت نازک ہے ایک گولی بائیں پھیپھڑے سے پار ہو کر

ریڑھ کی ہڈی تک جا پہنچی ہے اور اسے بھی زخمی کر دیا ہے اگر نتیجہ ہلاکت نہ ہو تب بھی کم از کم جسم کا نچلا حصہ بے کار ہو جائے گا۔ ملک کے بہترین ڈاکٹر ارخاں بے ان کے معالج ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ مکمل صحت کی صرف ۵ فیصد امید ہے اور وہ اس صورت میں کہ ریڑھ کی ہڈی کے پٹھے براہ راست زخمی نہ ہوئے ہوں بلکہ ان پر ریڑھ کی ہڈی کا جو کہ زخمی ہوئی ہے صرف دباؤ پہنچا ہو۔ چونکہ عبدالرحمٰن سخت کمزور ہیں اس لئے فی الحال پورے طور پر اس کا معائنہ نہیں کیا جا سکتا۔ سب سے پہلے ڈاکٹروں کی یہ کوشش ہے کہ ان کی جان بچائی جائے تاکہ مزید پیچیدگیاں نہ پیدا ہو جائیں اس کے لئے مکمل آرام کی ضرورت ہے۔

''میں نے ہسپتال میں جاکر دیکھا ہے۔ باوجود کمزور ہونے کے آپکے حوصلے میں فرق نہیں آیا۔ میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ آپ ڈاکٹر انصاری کو اور اگر ممکن ہو تو عبدالرحمٰن پشاوری کے اہل خاندان کو اس حادثہ کی اطلاع دیدیں۔ رؤف بے جو عبدالرحمٰن سے اپنے چھوٹے بھائی کی طرح محبت کرتے ہیں۔ بہت پریشان ہیں۔''

اس خط کے بعد ۲۰ جون کو روزنامہ خلافت بمبئی کے ذریعہ واقعات کی تفصیلات سے اسلامی ہند کو اطلاع ملی۔ یہ تفصیلات ایک اخباری رپورٹ پر مبنی تھیں جو قسطنطنیہ کے اخبارِ وطن میں ۲۴ مئی کو شائع ہوئی تھی۔ اس رپورٹ میں اس شبہ کا اظہار بھی کیا گیا تھا کہ چونکہ چھوٹا ہوا پستول پاس پڑا ہوا تھا لہٰذا انہوں نے خودکشی کی کوشش کی ہو گی اور اپنے ہی پستول سے زخمی ہوئے ہوں گے۔ اگرچہ عبدالرحمٰن کی حالت ایسی نہیں کہ وہ کچھ بتا سکیں لیکن عام طور پر

خودکشی کے شبہ کو رد کر دیا گیا ہے۔ رات کے دو بجے نامعلوم افراد نے ان پر حملہ کیا اور گولی ماردی۔ مدافعت میں انہوں نے بھی پستول استعمال کیا لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ جس گولی سے وہ زخمی ہوتے وہ ان کے پستول کی تھی یا دوسرے نے ماری تھی۔ ابھی ضابطہ کی تحقیقات جاری ہے۔

ظفر حسن ایبک اپنی خود نوشت "آپ بیتی" کے حصہ دوم میں اس حادثے کے بارے میں لکھتے ہیں:

"۱۹۲۵ء کی گرمیوں میں ایک روز ہم نے اخبار میں یہ سانحہ پڑھا کہ عبدالرحمن بے پشاوری پر جب وہ رات کو دیر سے استانبول کے محلہ اخلامور سے گزر کر اپنے گھر (رؤف بے مرحوم کے گھر) واقع محلہ نشان طاش کو آرہے تھے کسی نے فائر کیا اور وہ زخمی ہو کر بے ہوش ہو گئے۔ یہاں وہ کئی گھنٹے پڑے رہے اور ان کا خون بہتا رہا۔ آخر کار محلہ کے چوکیدار نے اپنے دورے کے وقت ان کو دیکھا اور پولیس کو اطلاع دی۔ ان کو شفا خانہ لایا گیا جہاں ان کی مرہم پٹی ہوئی لیکن گولی لگنے سے ان کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی جس سے ان کی دونوں ٹانگیں مفلوج ہو گئی تھیں۔ میں نے اگلے روز ہسپتال جا کر ان کو دیکھا اس وقت ان کے ہوش بجا تھے لیکن کمر سے نیچے کا حصہ بالکل حرکت نہ کر سکتا تھا۔ اس کے بعد ان کو دیکھنے کے لئے ہر روز ہسپتال جایا کرتا تھا جس سے ان کی طبیعت بہل جایا کرتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نیم مفلوج ہونے کے باوجود ان کے اچھے ہو جانے کی کچھ امید ہو سکتی ہے۔ اس لئے میں نے ان کے پاس ہر روز جانا ضروری نہ سمجھا اور ایک روز درمیان جانے لگا لیکن آخری دفعہ شفاخانے

جانے پر میں نے ان کو حالت نزاع میں پایا اور وہ اسی روز فوت ہو گئے۔"

تقریباً ایک ماہ تک ہندوستان اور ترکی کے آزادی و ترقی پسند طبقے امید و بیم کی حالت میں مبتلا رہے۔ ان کے خاندان اور ہندوستان اور ترکی میں ان کی صحت یابی کے لئے دعائیں مانگی جا رہی تھیں کہ اللہ تعالیٰ نے ملت کے اس غمخوار کو اپنے جوار رحمت میں بلا لیا۔ ہندوستان میں ان کی وفات کی اطلاع عبدالرحمٰن صدیقی کے ایک تار سے پہنچی جو غلام صمدانی کے نام تھا۔ اس میں درج تھا:

"۳۰ جون مطابق ۸ ذی الحجہ ۱۳۴۳ھ بروز منگل کو ظہر کے وقت عبدالرحمٰن کا انتقال ہو گیا۔ دلی ہمدردی قبول کیجئے۔"

یہ ایک برق خاطف تھی جو عبدالرحمٰن کے خاندان بلکہ پورے اسلامی ہند پر گری اور خرمن امید کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ پورا اسلامی ہند ماتم کدہ بن گیا۔ اخبارات نے ان کی شہادت پر اداریئے لکھے۔ جماعتوں اور اداروں نے اپنے خصوصی اجتماعات میں ان کی تعزیت کی قراردادیں پاس کیں۔ ملک کے طول و عرض میں سیاسی و ملی رہنماؤں نے پبلک جلسوں میں اپنے اپنے رنج و ملال کا اظہار کیا اور ان کی ملی خدمات اور عظیم شخصیت کو خراج تحسین پیش کیا۔ عوام نے اپنے آنسوؤں اور آہوں سے مرحوم شہید کو اپنی عقیدتوں کا نذرانہ پیش کیا۔

جہاں تک عبدالرحمٰن کی شہادت کے اصلی اسباب کا تعلق ہے وہ تو پردہ راز ہی میں رہے۔ ترکی پولیس نے تحقیقات بھی کی لیکن اس کا نتیجہ وہی نکلا جو عام طور پر اس قسم کی تحقیقات کا نکلا کرتا ہے لیکن یہ واقعہ ایسا نہ تھا کہ لوگ اپنے ذہنوں سے اسے فراموش کر دیں اور پولیس کی رپورٹ پر ایمان لے آئیں۔ چنانچہ ان کی شہادت کے پس منظر پر غور کیا گیا ہے اور اس سلسلے میں مختلف خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ ظفر حسن لکھتے ہیں:

"اس قتل پر بہت سی چہ میگوئیاں ہوئیں بعض لوگوں کا خیال تھا کہ چونکہ وہ مخالف پارٹی جس کے لیڈر رؤف بے تھے ایک سرگرم رکن اور رؤف بے کے دست و بازو تھے اس لئے ان کو جمہوریت خلق پارٹی نے جو اس وقت ترکی میں برسرِاقتدار تھی، قتل کروایا ہے لیکن اگر ایسا ہوتا تو ان دنوں خود رؤف بے یا ان کے شریکِ کار لوگوں میں سے کسی اور پر بھی حملہ ہوتا اور اس کو قتل کرنے کی کوشش کی جاتی حالانکہ ایسا کوئی اور واقعہ پیش نہیں آیا۔

اخبار میں اس قتل کا سبب لوٹ کا لالچ بتایا گیا ہے۔ محلہ اخلامور سے جہاں یہ قتل کا واقعہ ہوا تھا، نشان طاش کو آنے والا راستہ اس زمانے میں بالکل بھیانک سا تھا اور وہاں رات کو بالکل آمد و رفت نہ ہوتی تھی۔ ممکن ہے کہ کسی لچے نے ایک اچھے لباس کے آدمی کو وہاں سے اکیلا گزرتے ہوئے دیکھ کر روپے کے لالچ سے اس پر حملہ کیا ہو اور ہاتھا پائی کی نوبت پہنچنے پر ان کو گولی مار دی ہو۔ لیکن چونکہ عبدالرحمٰن بے پشاوری کی مالی حالت اتنی اچھی نہ تھی غالباً لٹیرے کے ہاتھ کوئی بڑی رقم نہ لگی ہوگی۔"

اس میں دو خیالوں کا اظہار کیا گیا ہے۔

اولاً یہ ایک سیاسی قتل تھا جو ان کے مخالفوں یا مصطفیٰ کمال پاشا کی پارٹی نے کروایا تھا ظفر احسن نے اس خیال کی تردید کر دی ہے۔ اس کے لئے ان کے پاس دلیل یہ ہے کہ اس وقت تک مصطفیٰ کمال کی پارٹی نے ایسا کوئی اقدام نہیں اٹھایا تھا اور جب کہ رؤف بے اور ان کے دوسرے ساتھیوں پر اس قسم کا حملہ نہیں ہوا تو عبدالرحمٰن پر یہ حملہ کیوں کیا جاتا۔ میرے خیال میں یہ استدلال درست نہیں ہے۔ اس قسم کے واقعات میں براہ راست

اصل مخالف کو نشانہ بنانے کے بجائے اس کے کسی عزیز، رشتہ دار یا دوست کو ظلم کا نشانہ بنایا جاتا ہے تاکہ فریق مخالف کو دہشت زدہ کیا جائے اور اگر اس وقت تک ایسی کوئی مثال نہیں ملتی تو اس کے بعد جاوید پاشا ترکی کے مشہور ماہرِ اقتصادیات کا واقعہ اس خیال کی نفی کے لئے کافی ہے اور اگر رؤف بے کی مثال ہی مطلوب ہو تو اس تاریخی حقیقت کو کیوں کر جھٹلایا جاسکتا ہے کہ یہ حکومتِ وقت سے اختلاف ہی کا نتیجہ تھا کہ رؤف بے کو وطنِ عزیز چھوڑنا پڑا۔ خالدہ ادیب خانم ماری ماری پھریں۔ محمد خاں پاشا۔ قرہ بکر پاشا وغیرہم کو اپنے وطن مالوف ترکی کو خیرباد کہنا پڑا اور دیارِ غیر کی خاک چھاننی پڑی۔ ان حالات کی بناء پر عبدالرحمٰن پشاوری کی شہادت کے پس منظر سے سیاسی اختلاف کو بالکل خارج نہیں کیا جاسکتا۔ بلاشبہ بالیقین یہ الزام لگا دینا ذمہ داری کے خلاف ہے لیکن اس شبہ کو رؤف بے کے اس بیان سے تقویت پہنچتی ہے کہ عبدالرحمٰن کو ان کے شبہ میں قتل کیا گیا ہے۔ رؤف بے فرماتے ہیں :

"دشمنوں نے ان کو میرے شبہ میں گولی کا نشانہ بنا دیا۔"

یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ مرحوم کی شکل و صورت رؤف بے سے بہت ملتی جلتی تھی۔

ثانیاً قتل کی دوسری وجہ ظفر احسن کے خیال میں لوٹ کا لالچ تھا اور انہوں نے اپنے یقین کو ترازو کے اسی پلڑے میں ڈالا ہے۔ بلاشبہ یہ سب قرینِ قیاس ہے۔

قتل کی ایک اور وجہ وہ سازش بیان کی گئی ہے جس کا نشانہ انور پاشا، طلعت پاشا، جمال پاشا وغیرہ بن چکے تھے۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری نے بھی ایک خط میں جو انہوں نے ۲۷ اگست ۱۹۲۵ء کو عبدالرحمٰن صدیقی کے نام لندن لکھا تھا عبدالرحمٰن شہید کے قتل کے اسباب پر بحث کی ہے۔ اس موقع پر اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم لکھتے ہیں :

"اسعد فواد کا خیال ہے کہ یہ واقعہ کسی سازش کا نتیجہ نہیں۔ بہت سے بے روزگار اور

فاقہ کش لوگ اس علاقے کے ارد گرد پھرتے رہتے ہیں۔ محض کچھ روپیہ یا کوئی اور قیمتی چیز حاصل کرنے کی غرض سے کئی مرتبہ تنہا اشخاص پر حملوں اور ڈاکوؤں کی وارداتیں ہوئی ہیں اور بعض دفعہ تو موٹر کاروں پر جاتے ہوئے مسافروں پر بھی ایسے حملے کئے گئے ہیں۔ مزید برآں جہاں تک لوگوں کو علم ہے عبدالرحمٰن کے وہاں کوئی دشمن بھی نہ تھے۔ رؤف بے یا اس کے آدمیوں کو مار دینے کی سازش کا کسی کو احتمال نہیں۔

رؤف بے بھی عام طور پر اسعد فواد کے اس خیال سے متفق تھے لیکن انہوں نے سیاسی مقاصد کو بالکل خارج از امکان نہیں کیا تھا۔

"ایک بات مجھے بہت عجیب معلوم ہوئی اور وہ یہ کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رؤف بے کی طرف سے سختی کے احکام کے باوجود پولیس نے اس معاملے میں کچھ زیادہ تگ و دو نہیں کی۔ جس کی وجہ سے دل میں بہت سے شکوک پیدا ہوتے ہیں۔"

رؤف بے اس واقعے سے بُری طرح متاثر ہوتے ہیں۔ ایک دفعہ میں ان کے ساتھ مرحوم کی قبر پر پھول چڑھانے گیا اور میں نے دیکھا کہ وہ اپنے غم کو ضبط نہ کر سکے رؤف بے کو مرحوم کے ساتھ خاص انس تھا اور وہ انہیں اسلامی شجاعت اور شرافت کا بہترین نمونہ سمجھتے تھے۔"

میرا خیال ہے کہ عبدالرحمٰن کے قتل کے سلسلے میں یہ سب سے محتاط اور قابل قبول بیان ہے۔

عبدالرحمٰن کے قتل کی وجہ خواہ کچھ ہو۔ آج ہمارے لئے اس کے حقیقی اسباب سے پردہ اٹھانا بہت مشکل ہے لیکن اس حقیقت کو تاریخ کیوں کر بھلا سکتی ہے کہ ان کی شہادت سے ملت اسلامیہ اپنے ایک عظیم سپوت سے محروم ہو گئی لیکن اس لحاظ سے آج پوری ملتِ اسلامیہ ہندیہ کا سر فخر سے بلند ہے کہ اس کے ایک فرزند نے ترکوں کی محبت میں اسلامی جذبے سے متاثر ہو کر ان کی خدمت

کا پیمان باندھا تھا۔ اس نے اپنے خون سے اس پیمان پر آخری مہر ثبت کر دی۔ اس نے اپنی جوانی کے بہترین شب و روز ترکی کی تعمیر و ترقی اس کے استحکام اور اس کے حفظ و دفاع میں بسر کیے اور اسی سرزمین اور اسی قوم کے لیے اپنی جان کا نذرانہ بھی پیش کر دیا۔

عبدالرحمٰن کو ماچقہ کے قبرستان میں پورے فوجی اعزاز کے ساتھ دفن کیا گیا۔ قریب ہی اتحاد عالم اسلام کے مشہور داعی جمال الدین افغانی کی قبر تھی[۱]۔ اسعد فواد کی توجہ سے سنگِ مرمر کی قبر تیار کر دی گئی۔ لوحِ قبر پر اسعد فواد ہی کے یہ الفاظ کندہ ہیں :

"عبدالرحمٰن غلام صمدانی بے کی روح پر فاتحہ جو جنگِ بلقان کے زمانے میں ہلالِ احمر ہند کے ساتھ استنبول آئے اور جنگِ بلقان اور جنگِ آزادیٔ ترکی میں ترکی کے لیے اپنا خون بہایا اور ۱۹۲۵ء میں ایک نامعلوم شخص کی طرف سے شہید کر دیے گئے اور افغانستان میں ترکی نمائندہ کی حیثیت سے رہ چکے تھے۔" (ترجمہ)

یہ حادثہ یوں تو خاندان کے تمام ہی افراد کے لیے جان کاہ تھا لیکن حاجی غلام صمدانی اس واقعے سے خاص طور پر متاثر ہوئے۔ وہ اس غم میں روز بروز گھلتے گئے۔ ہر وقت وہ عبدالرحمٰن کو یاد کرتے تھے۔ بیٹے کے غم میں ان کی آنکھیں ہر وقت آنسو بہاتی رہتی تھیں۔ بالآخر وہ اس صدمے سے جانبر نہ ہو سکے اور رنج و الم کے اس عالم میں تقریباً پانچ ماہ کے بعد اس دارِ فانی سے عالمِ جاودانی کی طرف رحلت کر گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

---

[۱] ۱۹۳۶ء میں جمال الدین افغانی کی نعش افغانستان منتقل ہو گئی ہے۔

انیسواں باب

خراجِ عقیدت

اس باب میں ہم سب سے پہلے رؤف بے کے خیال کو پیش کرتے ہیں۔ رؤف بے اور عبدالرحمٰن بہت ہی قریبی دوست تھے بلکہ کہنا چاہیے، کہ وہ دوستی کی حدود سے گزر کر اخوت کی حدود میں داخل ہو چکے تھے۔ رؤف بے کی والدہ نے عبدالرحمٰن کو بیٹا بنا لیا تھا۔ وہ ان کے گھر میں مثلِ اولاد کے رہتے تھے۔ دونوں کے تعلقات سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عبدالرحمٰن اور رؤف بے کے پہلوؤں میں ایک ہی دِل دھڑکتا تھا۔ دونوں کے خیالات ایک تھے۔ اندازِ فکر دونوں کا یکساں تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے والہانہ محبت کرتے تھے۔ دونوں میں نہ کبھی کسی بات پر اختلاف ہوا اور نہ رنجش و ناچاقی کی نوبت آئی۔ رؤف بے کو ان سے جو محبت تھی اس کا اندازہ ڈاکٹر انصاری اور اسعد فواد کے خطوط سے لگایا جا سکتا ہے۔ رؤف بے خود فرماتے ہیں:

"عبدالرحمٰن کو ترکی کا بچہ بچہ دِل سے چاہتا ہے۔ انور شہید ہو یا مصطفیٰ کمال، ہر ایک کو اس سے محبت تھی۔ محکمہ جنگ کے اعلیٰ حکام میں سے ہر ایک اس بات کا متمنی تھا کہ عبدالرحمٰن کو اپنے سینے سے لگائے رکھیں لیکن ربِ اکبر نے یہ فخر میری قسمت میں لکھا تھا کہ وہ میرا بھائی بنا اور میرے حقیقی بھائی کی طرح میرے گھر میں مقیم رہا۔ گھر میں اس کی عزت کا یہ عالم تھا کہ والدہ مجھ سے

زیادہ اس کو چاہتی تھیں اور اس کی کسی بات کو رد نہ کرتیں۔ یہ حالت میرے لئے باعثِ رشک تھی۔ میں نے گھر میں اس کے سامنے کئی دفعہ اس بات کا اظہار کیا کہ کاش میں عبدالرحمٰن ہوتا۔"

رؤف بے نے ان کے لئے ہر وہ بات سوچی جو بھائی کی خوشی اور اس کے مستقبل کے بارے میں ایک بھائی سوچ سکتا ہے۔ رؤف بے ان کی شادی بھی کرانی چاہتے تھے اور ان کے لئے ترکی کے ایک معزز اور صاحب ثروت خاندان کی لڑکی کا انتخاب بھی کر لیا تھا لیکن عبدالرحمٰن نے اس وجہ سے شادی کرنے سے انکار کر دیا کہ شادی کے بعد وہ ملک اور قوم کی خدمت پوری مستعدی اور کامل توجہ کے ساتھ انجام نہیں دے سکیں گے اور اس طرح ان کی زندگی کا مشن ادھورا رہ جائے گا۔"

۱۹۳۳ء میں جب رؤف بے ہندوستان آئے تو مسلم یونیورسٹی علیگڑھ بھی گئے اور انھوں نے ہوسٹل کے اس کمرے میں جس میں کبھی عبدالرحمٰن رہا کرتے تھے۔ ان کی یاد میں ایک تختی نصب کی۔ رؤف بے ان کے اہلِ خاندان سے ملنے پشاور گئے اور چند دن اسی کمرے میں قیام کیا جس میں عبدالرحمٰن رہا کرتے تھے اور اسی چارپائی پر سوئے جس پر عبدالرحمٰن سویا کرتے تھے۔ رؤف بے کو ان کی ایک ایک بات اور ہر ہر ادا سے والہانہ محبت تھی۔

رؤف بے نے عبدالرحمٰن کے انتقال کے بعد ایک عجیب واقعہ تحریر فرمایا ہے۔ شاید بعض حضرات اس قسم کے واقعات پر یقین نہ رکھتے ہوں اور ایک سوانحی کتاب میں اس قسم کا مافوق الفطرت واقعہ کا اندراج بھی ان کے نزدیک اصول سوانح نگاری کے خلاف ہو لیکن میرے نزدیک اس قسم کے واقعات نہ تو ناممکن الوقوع ہیں اور نہ دلچسپی سے خالی۔ اس لئے اس کے بیان میں مضائقہ نہیں۔ رؤف بے فرماتے ہیں :

"تجہیز و تکفین کی تیاری ہو رہی تھی اور ہم فوجی گارڈوں، پولیس اور دیگر امراء و رؤسا

کی آمد کا انتظار کر رہے تھے تو اچانک ایک برقع پوش عورت روتی اور چلاتی ہوئی مکان کے اندر داخل ہوئی اور یہ اصرار کہنے لگی کہ میرے بیٹے کی لاش میرے حوالے کر دی جائے۔ ہم نے یہ سمجھتے ہوئے کہ ترکی کی ہر ماں اسے اپنا بچہ سمجھتی تھی، اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن اس نے اپنا اصرار جاری رکھا اور کہتی رہی کہ عبدالرحمن میرا حقیقی بیٹا ہے۔ اس کی لاش میرے حوالے کر دی جائے۔

"عبدالرحمن کی عمر کا بہت سا حصہ میرے ساتھ گذرا تھا۔ ان کے خاندان اور متعلقین کا مجھے علم تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ ان کی والدہ فوت ہو چکی ہیں اور اگر زندہ بھی ہوں تو کہاں پشاور اور کہاں قسطنطنیہ! آخر جب اس عورت نے زیادہ سختی شروع کی تو میں نے اس سے کہا وہ سب کا بیٹا تھا۔ تیری طرح اس کی دوسری مائیں بھی بے قرار ہیں۔ ان کی طرح تو بھی صبر کر۔ اس پر وہ عورت طیش میں آکر بولی، عبدالرحمن میرا حقیقی بیٹا ہے۔ میں نے تنگ آکر اس عورت سے دریافت کیا کہ عبدالرحمن اگر تمہارا حقیقی بیٹا ہے تو کوئی نشانی بتلاؤ؟ اس نے کہا "دیکھو! اس کے داہنے پاؤں کے تلوے میں ایک سیاہ تل کا نشان ہے۔ دیکھا گیا تو یہ نشان واقعی موجود تھا۔ اس بات پر ہم لوگ حیران و پریشان کھڑے تھے اور سوچ رہے تھے الٰہی! یہ کیا ماجرہ ہے؟ اتنے میں عورت خاموشی سے باہر نکل گئی۔ میرے دل میں معاً خیال پیدا ہوا کہ اس عورت سے مزید گفتگو کرنی چاہیئے لیکن ہر چند اسے تلاش کیا گیا مگر وہ عورت نہ ملی۔ دروازے پر جو لوگ کھڑے تھے وہ اندر سے اس کے نکلنے کے شاہد تھے لیکن یہ عقدہ حل نہ ہو سکا کہ وہ عورت کدھر گئی۔"

عبدالرحمن کے بھائی محمد یحییٰ کہتے ہیں کہ جس شکل و شباہت کا نقشہ رؤف بے نے کھینچا تھا

وہ ان کی والدہ کے ناک نقشے کے عین مطابق تھا۔

عبدالرحمٰن کے انتقال پر رؤف بے پر گویا غم واندوہ کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ان کی حالت غیر ہوگئی انہوں نے حاجی غلام صمدانی کو جو خط لکھا تھا اس سے بھی ان کے شدید الم کا اظہار ہوتا ہے۔ رؤف بے لکھتے ہیں :

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد

روے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

میں چاہتا تھا کہ جشنِ صحت کی خوشی کا خط لکھ کر آپ کے مجروح دل کا معالج ہوں۔ مگر مشیت الٰہی نے مجھے تعزیت کا خط لکھنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اسلامی تاریخ میں عبدالرحمٰن جیسے اولالعزم بہت کم گذرے ہیں۔ اگر آپ سوچیں تو اس کی یاد سے آپ کو ایک تسکین اور تسلی بھی ملے گی گو عبدالرحمٰن آپ کا فرزند اور جگر گوشہ تھا اور اس کی پر حسرت موت سے جس قدر آپ کو رنج اور قلق ہوگا مجھے اس کا احساس ہے لیکن عبدالرحمٰن میرے دوست ہی نہیں میرے عزیز بھائی بھی تھے وہ میرے لئے دست وبازو کی حیثیت رکھتے تھے اس لئے جس فراق میں آپ کا جگر خون ہوگا اس کی جدائی کا زخم مجھے بھی مرتے دم تک تڑپاتا رہے گا۔"

عبدالرحمٰن، ڈاکٹر انصاری کے ساتھ استانبول میں ہلال احمر کے ایک خیر محض اور انسانی وظیفہ سے فارغ ہوتے ہی یہاں کے فوجی کالج میں داخل ہوتے اور وہاں سے کامیاب افسر بن کر نکلے۔ جنگِ عظیم کے دوران میں متعدد معرکوں میں انہوں نے اپنے فوجی فرائض کو نہایت خوش اسلوبی سے ادا کیا اپنے افسروں کو بھی اپنا گرویدہ بنا لیا۔ انہوں نے ہمیشہ نہایت بہادری جانفشانی اور احساس

ذمہ داری کے ساتھ اپنے کاموں کو انجام دیا۔ آئندہ بھی وطن اور قومی خدمات کے سلسلے میں مرحوم سے بہت سی اُمیدیں وابستہ تھیں۔ مگر صد حیف۔

تجہیز و تکفین کے بعد جنازہ بڑے احترام کے ساتھ اُٹھایا گیا۔ ماچقہ کے قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ یہ وہی قبرستان ہے جہاں علامہ جمال الدین افغانی بھی مدفون ہیں۔"

عبدالرحمٰن مرحوم کی وفات کا سانحہ پیش آیا تو حکیم اجمل خاں یورپ گئے ہوئے تھے جوں ہی انھیں اس حادثے کی خبر ملی انھوں نے غلام صمدانی مرحوم کے نام تعزیت کا خط لکھا۔ یہ خط ۱۷ جولائی ۱۹۲۵ء کو مارسیلز سے لکھا گیا تھا۔ حکیم صاحب لکھتے ہیں :

"آج عبدالرحمٰن صدیقی سے عزیزی عبدالرحمٰن پشاوری کے انتقال کی خبر سن کر دلی افسوس ہوا اور سخت صدمہ ہوا۔ مرحوم کو میں نے علی گڑھ میں دیکھا اور پھر ڈاکٹر انصاری طبّی وفد کی روانگی کے وقت بھی ملاقات ہوئی تھی بعد میں ان کے کارنامے اکثر سنتا رہا اور دل سے دعا کرتا تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کے ارادوں کو پورا کرے اور ان سے اپنی اور اپنے خاص بندوں کی خدمت لے لیکن ہونا کچھ اور ہی تھا۔ آپ صبر کیجیے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔"

ڈاکٹر مختار احمد انصاری ان کے انتقال کے تھوڑے عرصہ بعد قسطنطنیہ گئے تھے۔ ۲۵ جولائی ۱۹۲۵ء کو انھوں نے مولانا محمد علی کے نام جو خط لکھا اس میں عبدالرحمٰن پشاوری کا تذکرہ بھی ہے۔ یہ خط ۱۸ ستمبر ۱۹۲۵ء کے کامریڈ میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر انصاری لکھتے ہیں :

"میں اپنے عزیز مرحوم دوست عبدالرحمٰن پشاوری کی قبر پر فاتحہ پڑھنے اور اپنی محبت اور خلوص کا تحفہ پیش کرنے کے لئے اسعد فواد بے اور مولوی عبدالرحمٰن ریاض

کے ساتھ ماچقہ کے قبرستان میں گیا شاید یہ بات غلام صمدانی اور مرحوم کے دیگر پسماندگان کے لیے تسکین کا باعث ہوگی کہ پشاوری کی جان بچانے کے لیے ہر ممکن کوشش کی گئی۔ رؤف بے، ان کی والدہ، چند دیگر مخلص احباب اور قسطنطنیہ کے قابل ترین سرجن ارخاں بے کے علاوہ "صحت یوردو" کے تجربہ کار اور ہوشیار تیماردار اُن کی خدمت اور معالجہ کے لئے موجود رہتے تھے ان کا آخری وقت نہایت سکون کے ساتھ گزرا اور مرحوم کو گذشتہ صدی کے عظیم ترین اسلامی مدبر سید جمال الدین افغانی کی قبر کے پاس پورے فوجی اعزاز کے ساتھ دفنا دیا گیا فواد بے نے جو ہندوستانیوں کے حقیقی دوست ہیں اور ہمیشہ ان کے خیرخواہ رہے ہیں۔ سنگِ مرمر کی خوبصورت قبر بنانے کا حکم دیا ہے۔ امید ہے کہ جلد تیار ہوجائے گی۔"

عبدالرحمن کے انتقال پر ہندوستان کے متعدد شہروں میں تعزیتی جلسے ہوئے۔ ان کی رودادیں اخباروں میں شائع ہوئیں۔ اخبارات نے اداریئے لکھے اور اس طرح انھیں شاندار طور پر خراج عقیدت پیش کیا گیا لیکن اخبارات کی نایابی اور عدم دستیابی کی وجہ سے تمام رودادوں کو حاصل کرنا تو ناممکن ہوگیا ہے البتہ چند جلسوں کی رودادیں دستیاب ہیں انھیں نقل کیا جاتا ہے تاکہ یہ تاریخی سرمایہ ہمیشہ کے لئے محفوظ ہوجائے۔ اس سلسلہ میں پہلی تحریر پشاور کے جلسہ تعزیت کی روداد ہے جو روزنامہ 'زمیندار'، لاہور میں ۱۸؍ اگست ۱۹۲۵ء کو شائع ہوئی تھیں۔ یہ روداد مسلم پشاوری نے قلمبند کی تھی۔ موصوف لکھتے ہیں:

"یوں تو غازی عبدالرحمن پشاوری کی خبر شہادت بہت دن پہلے پہنچ چکی تھی مگر وہ مصدقہ نہ تھی اور انفرادی طور پر لوگ غازی شہید کے والد ماجد کے ساتھ اظہارِ ہمدردی کرتے رہے مگر کوئی اجتماعی تعزیتی کاروائی عمل میں نہ آئی۔ مگر اب ۴؍ اگست

کو ایک تار اور ایک خط سے جو مجلس مرکزیہ خلافت کی وساطت سے قسطنطنیہ سے منگوا لیا گیا تھا، ان کی شہادت کی پوری طرح تصدیق ہو گئی۔ اس پر مجلس خلافت پشاور نے ایک جلسہ کے اعلان کے ۵ر اگست کو بڑے بڑے پوسٹر عام جگہوں پر چسپاں کرا دیئے اور ۷ر اگست کو رضا کاروں نے ایک جلوس کی صورت میں جلسے کا اعلان کیا چنانچہ بعد نمازِ جمعہ مسجد قاسم علی خاں میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا۔ حاضرین کی تعداد بہت زیادہ تھی۔

جلسہ کا افتتاح قرآن کریم کی تلاوت سے کیا گیا۔ اس کے بعد مسٹر اللہ بخش صاحب یوسفی ایڈیٹر سرحد کی تجویز اور آغا لال گل بادشاہ صاحب کی تائید سے مولانا عبدالحکیم صاحب نے مختصر مگر پُر اثر خطبہ صدارت پڑھا۔ ایک دو حضرات نے نظمیں پڑھیں اور مندرجہ ذیل قرار دادیں اتفاقِ رائے سے منظور ہوئیں۔

۱۔ باشندگان پشاور کا یہ عام جلسہ کرنل غازی عبدالرحمن بے پشاوری کی وفات حسرت آیات پر اپنے قلبی رنج و ملال کا اظہار کرنے کے بعد آپ کے والد ماجد میاں غلام صمدانی خاں ٹھیکیدار اور دیگر متعلقین و پسماندگان کے ساتھ اظہارِ ہمدردی کرتا ہے اور بارگاہِ ایزدی میں مودبانہ التجا کرتا ہے کہ غازی موصوف کو وہ اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور آپ کے پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔

۲۔ یہ جلسہ تجویز کرتا ہے کہ جلسے کی مکمل کاروائی بعد میں اخبارات کو بھیج دی جائے۔

دعا کے بعد جلسے کی کاروائی ختم ہوئی۔ ایک جلوس مرتب ہوا جس کے آگے آگے تمام ارکان خلافت تھے اور ان کے پیچھے رضا کارانِ باوردی نظمیں پڑھتے جاتے تھے۔ یہ نظمیں شہیدان وطن کی تعریف میں تھیں اور سخت دلوں کو موم بنا رہی تھیں۔

جلوس قاسم علی خاں کی مسجد سے شروع ہو کر میاں غلام صمدانی کے گھر پہونچا جہاں پراثر تقریریں ہوئیں۔ اس کے بعد غازی عبدالرحمٰن کے بڑے بھائی مسٹر محمد امین نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا لیکن ان پر اس قدر رقت طاری تھی کہ ان کے لئے الفاظ کا ادا کرنا مشکل ہو گیا۔ شکریہ کے بعد جلوس منتشر ہو گیا۔ (مسلم پشاوری)"

دوسری روداد کابل کے جلسہ تعزیت کی ہے یہ روداد عزیز ہندی نے مرتب کی اور زمیندار لاہور، ۲۵ اگست ۱۹۲۵ء کو شائع ہوئی۔ ہم اسے بھی اس تاریخی اہمیت کے پیش نظر یہاں نقل کر رہے ہیں:

کابل کا جلسہ

"مکرمی و محبی مدیر صاحب روزنامہ زمیندار، لاہور

السلام علیکم ورحمتہ اللہ

جناب آقائے سید علی عباس بخاری کی تحریک پر بروز جمعہ گزشتہ بتاریخ ۹ اسد ۱۳۰۴ھ بمقام ہوٹل اندرابی عبدالرحمٰن خان وزیر تجارت کی صدارت میں انعقاد پذیر ہوا جس میں ہر ملک کے مسلمان افغانی، ترکی، ایرانی، عربی اور ہندی مدعو کئے گئے تھے۔ مختصر روداد جلسہ بغرض اشاعت جناب کی خدمت والا میں ارسال کی جاتی ہے۔

پہلی تجویز جناب آقائے محمد حسین خاں صاحب بی اے علیگ رئیس تدریسات وزارت جلیلہ معارف نے پیش کرتے ہوئے حاضرین سے فرمایا کہ مرحوم میرے ہم مکتب اور میرے گہرے اور دلی دوست تھے۔ آپ جنگ بلقان کے موقع پر ایک وفد ہلال احمر کے ساتھ ترکی چلے گئے اور وہیں آپ نے ترکی لیڈروں میں عزت پیدا کی اور ان سے مل کر خدمات اسلامی انجام دیتے رہے یہاں تک کہ

جب مصطفےٰ کمال پاشا کا دور دورہ ہوا تو آپ کو افغانستان سے رابطہ قائم کرنے کے لئے بحیثیت نمائندہ حکومت انگورہ نے کابل روانہ کیا اور یہ پہلے شخص تھے جنہوں نے ترکی اور افغانستان میں تعلقات قائم کئے۔ آپ جہاں عام مسلمان عالم کی خدمت کرنے کا جذبہ رکھتے تھے وہاں بالخصوص افغانی معاملات میں نہایت سرگرمی سے حصہ لیتے تھے حالانکہ آپ نسباً افغان نہ تھے۔ آپ نے سویڈن میں بیٹھ کر ایک رسالہ تحریر کیا جس میں افغانوں کو استقلال اور آزادی کا اہل ثابت کیا پھر جب آپ افغانستان میں آئے تو نہ صرف زبان اور قلم سے افغانستان کی خدمت کی بلکہ بسا اوقات آپ اپنی جیب خاص سے خفیہ اور علانیہ امورِ تعلیم میں امداد فرماتے رہے۔ آپ نے ایک موقعہ پر طلبہ کو مبلغ ایک ہزار روپیہ کی گرانقدر رقم عطا فرمائی اور اسی طرح دوسرے کاموں میں بھی امداد کرتے تھے۔ آپ کی بے وقت اور مظلومانہ موت ہمارے لئے ایک ناقابل برداشت صدمہ ہے اور آج ہم اس لئے اکٹھے ہوتے ہیں کہ ان کی وفات پر رنج و الم کے آنسو بہائیں اور ان کے پسماندگان سے ہمدردی کا اظہار کریں۔“

اس کے بعد رئیس صاحب نے ذیل کی قرارداد پڑھی اور اپنی تقریر کو ختم فرمایا:

قرار دادِ اول: یہ جلسہ عبدالرحمن بے کی مظلومانہ موت پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے اور مرحوم کے لئے مغفرت کی دعا کرتے ہوئے ان کے پسماندگان کی خدمت میں اپنی پوری ہمدردی پیش کرتا ہے۔

اس قرارداد کی تائید میں جناب آقائے غلام مجتبےٰ صاحب مستوفی ایالت کابل مولانا محمد بشیر صاحب مجاہد، جناب آقائے بشیر احمد صاحب افغانی نے نہایت موثر

اور رقت طاری کر دینے والی تقریریں فرمائیں ۔جناب مولانا مخفی صاحب نے جو زبان پشتو کے نامور شاعر ہیں جناب صدر سے چند الفاظ کہنے کی اجازت چاہی اور جناب آقائے رئیس تدریسات کی تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ میں آزاد سرحد میں حتی الامکان اپنے دین مقدس کی خدمات سر انجام دیتا ہوں چنانچہ میں نے وہاں مسلمان بچوں کو تعلیم دینے کے سلسلے میں کئی مکاتب قائم کئے تھے جو بعض بیرونی حضرات کی امداد سے چل رہے تھے ایک موقع پر جب بیرونی امداد کا سلسلہ منقطع ہو چکا تھا اور قریب تھا کہ مکاتب امداد کے میسر نہ ہونے کے باعث تباہ ہو جائیں گے ۔جناب عبدالرحمٰن بے مرحوم و مغفور نے مجھے ایک ہزار روپے کی رقم عنایت فرمائی اور مجھے تاکید کی کہ کسی کو نہ بتاؤں کہ یہ امداد انہوں نے دی ہے اس کے بعد جناب مرحوم نے مجھے یاغستان میں مزید دو سو روپے کی رقم روانہ کر دی ۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم خفیہ طور پر اپنی جیب خاص سے اپنے افغانی اسلامی بھائیوں کی امداد کرتے رہتے ہیں اور یہ اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ وہ افغانستان کی محبت میں بدرجہ انتہا سرشار تھے ۔"

جناب آقائے سید علی عباس بخاری نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ مرحوم ایک اہم سیاسی شخصیت تھے اور وہ رؤف بے کی جماعت میں شامل تھے ان کا قتل کیا جانا بھی سیاسیات ترکیہ سے تعلق رکھتا ہے اگر وہ ایک معمولی آدمی ہوتے تو کہا جا سکتا تھا کہ کسی چور یا ڈاکو نے اسباب و زر کے طمع میں آ کر انہیں مار دیا ہوگا ۔اس لئے ترکی حکومت کو چاہیئے کہ وہ گہرے انہماک کے ساتھ اس واقعہ کے متعلق تفتیش فرمائے اور ان وجوہ و واقعات کو شائع فرمائے جن کی بناء پر ظالموں نے اس بیش بہا

ہستی کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور مجرمین کو پوری سزا دے۔ آپ نے درد اور جوش میں بھرے ہوئے انداز میں فرمایا کہ ہم خود بھی اس واقعے کے متعلق معلومات بہم پہنچائیں گے اور ہم ایسا کر سکتے ہیں کیوں کہ ہمارے پاس کافی ذرائع موجود ہیں۔ یہ علی شکری بک نہیں ہے جس کے حالات پر وہ خفا میں رکھے جا سکیں گے ہم اس حقیقت کو آخر کار ڈھونڈھ نکالیں گے۔ سردست ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں کہ اس قرار داد کے ذریعہ سے حکومت ترکیہ کو اس ناگوار حادثہ کی تفتیش کرنے کیطرف توجہ دلائیں۔ ازاں بعد انہوں نے اصل قرار داد پڑھی جو یہ ہے۔

قرار داد دوم! یہ جلسہ تجویز کرتا ہے کہ بتوسط ہز اکسلنسی فخری پاشا سفیر ترکیہ متعینہ کابل بحضور حکومت جمہوریہ ترکیہ استدعا کی جاتی ہے کہ جناب عبدالرحمٰن بے کے قاتلوں کو سخت سزا دی جائے اور اس واقعہ قتل کے متعلق ہر گونہ تفصیلات اور وجوہ قتل شائع کئے جائیں۔،،

آقائے بخاری کے بعد میں نے اس قرار داد کی تائید میں ایک مختصر سی تقریر کی جس میں اپنی ہمدردی اور محبت کا حوالہ دیتے ہوئے بجوہات اسلامیہ ہندیہ کو ترکوں سے میں نے کہا کہ ہمارا حق ہے کہ ہم حکومت ترکیہ سے مرحوم کے قتل کئے جانے کے متعلق واقعات شائع کرنے کا مطالبہ کریں اور جن لوگوں نے اس ظالمانہ فعل میں حصّہ لیا ہے ان کو پوری پوری سزا دیئے جانے کی درخواست کریں۔ چنانچہ میں ان الفاظ کے ساتھ اس قرار داد کی تائید کرتا ہوں کہ حکومت ترکیہ کو چاہیئے کہ ہماری محبت کے شایان شان اس واقعہ کے متعلق کارروائی کرے۔

میرے بعد جناب علی شوکت عثمانی نے جو سفارت ترکیہ کے اعضا میں سے ہیں۔

بیان فرمایا کہ اگرچہ میں بیماری کی وجہ سے نحیف و نزار ہوں تاہم چند الفاظ آپ کی خدمت میں کہنے کی ضرورت محسوس کرتا ہوں۔ دنیا میں ایسے بہت اسرار انگیز قتل ہوئے ہیں جن کی تحقیقات میں کچھ عرصہ صرف ہوا کرتا ہے۔ برادران ہند کو مطمئن رہنا چاہیئے کہ حکومت جمہوریہ ترکیہ تفتیش و تحقیق کے بعد حالات شائع فرمائے گی آخر میں جناب صدر نے مختصر تقریر فرمائی جس میں انھوں نے مرحوم کی صفات بیان فرماتے ہوئے ان کے والدِ محترم کو پیغام تعزیت بذریعہ تار ارسال کرنے کی تجویز فرمائی۔ اس طرح اس جلسے کی کارروائی ختم ہوئی۔

بعد میں سید علی عباس بخاری نے تحریک پیش کی کہ دلیش بندھو داس کے پسماندگان کو بھی پیام تعزیت روانہ کیا جائے چنانچہ سب نے کھڑے ہو کر اس تجویز کو منظور کیا۔

نوٹ: حسبِ قرار داد اگلے دن حاجی غلام صمدانی (پشاور) اور مسز داس کلکتہ کو برقی پیغامات تعزیت روانہ کر دیئے گئے۔ (عزیز ہندی)۔"

ضمیمہ

عبدالرحمٰن شہید نے بلقان کے سفر پر روانہ ہونے کے بعد اپنے اپنی بہنوں اور بھائیوں کو خطوط لکھے تھے۔ ان سے سفر کے حالات پر دلچسپ روشنی پڑتی ہے۔ یہ خطوط فارسی میں ہیں، ان کا اردو ترجمہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

خط نمبر ۱

بندرگاہ بمبئی
۱۳ر دسمبر ۱۹۱۲ء

عزیز بہن بی بی کو جان

دل کرتا ہے کہ مندرجۂ ذیل شعر سے خط کا آغاز کروں۔

بہ یاد دیار و دیار آں چناں بگریم زار ۔ کہ از جہاں رہ و رسمِ سفر براندازم

آلِ عثمان کے بے پایاں مصائب اور دلفگار نالہ و فریاد نے کشاں کشاں اور افتاں و خیزاں مجھے اپنی طرف بلا ہی لیا۔

میرے خیال میں بلقان جانے کی وجوہات بتانے کی ضرورت نہیں ہے!
بس جذبۂ اخوت اسلامی کی بے تابیوں نے آخر کار میرے سکون قلب کو درہم برہم کر کے چھوڑا اس سے پہلے کہ کچھ اور حال کا ذکر کروں! چاہتا ہوں کہ عزیزہ پر یہ امر واضح کروں کہ گو سفر بلقان کی تیاری میں پوشیدہ طور پر عرصے سے مصروف تھا تاہم میری دلی خواہش تھی کہ پہلے کچھ اپنے کاروبار میں ذاتی طور پر اس قدر کامیابی حاصل کروں کہ آپ کے بعض کاموں کی سرانجام دہی میں برادرانہ فرض کو حسب مقدور ادا کروں۔

یمیمو کا سفر اور کام شروع کرنے کا ارادہ محض اسی ارادے پر تھا لیکن بقول کسے۔ من درچہ خیال و فلک درچہ خیال

یہ خواہش محض میرے شوق کے بنا پر تھی ورنہ میں جانتا ہوں کہ آپ کے کاموں کی سربراہی کرنے والے قبلہ جناب والد صاحب موجود ہیں اور آپ میرے محتاج نہیں تھے۔

بی بی کو جان! میرے لئے یہ بیان کرنا ممکن نہیں کہ کن مشکلات سے اپنا سرمایہ سفر فراہم کر کے کسی دل سے بلقان جا رہا ہوں۔

ہماری جماعت طبیہ میں صحیح طور پر محض چار آدمی ڈاکٹر ہیں۔ باقی ۲۳ افراد ہم سے ایسے ہیں کہ نہ میں ڈاکٹری کا علم جانتا ہوں اور نہ باقی افراد۔

البتہ میں اپنا سفر خرچ خود ادا کروں گا! باقی ۱۹ افراد امدادی خرچ پر جا رہے ہیں۔

سفر کا خرچ فی کس مبلغ ایک ہزار رقم ہوتی ہے لہٰذا اس صورت میں کہ میں

نے نہ جناب قبلہ والدصاحب کو اطلاع دی اور نہ جناب بھائی (آغا لالہ جان) کو خبر دی اور نہ کسی سے امداد ہی طلب کی! پس خیال کرو کہ کس طرح میں نے یہ رقم حاصل کی ہوگی۔ میری بہن! اپنا تمام لباس، سوٹ وغیرہ فروخت کئے۔ کتابیں اور جتنی فالتو چیزیں تھیں سب طالب علموں نے کافی گراں قیمت پر مجھ سے خرید لئے۔ مبلغ دو سو رقم میرے رفیق فضل امین نے دیئے اب میرے پاس صرف چند خاکی سوٹ اور دو جوڑے کپڑے رہ گئے ہیں اور بس۔ لیکن میرا دل از حد مطمئن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میرا دست سوال کسی کے سامنے نہ پھیلانے دیا۔

حقا کہ با عقوبت دوزخ برابر ست

رفتن بہ پائے مردیٔ ہمسایہ در بہشت

اے میری مہربان بہن! گو کہ اس وقت میرے پاس بہت کم رقم ہے لیکن غم نہ کر! کیونکہ شیر جنگل میں بھوکا نہیں رہتا۔ عبدالرحمان بھی جہاں جائے گا۔ اپنی روزی پا لیگا اور انشاء اللہ عزت کی روزی حاصل کرے گا۔

لالہ جان نے اس لئے میرا خرچ نہیں بھیجا کہ میں بلقان نہ جا سکوں غلطی فضل امین کی تھی کہ ان کو تار دیا کہ عبدالرحمان ترکی جا رہے ہیں میرے چند ایسے واقف کار تھے جو مجھے مالی امداد دینا چاہتے تھے لیکن میں اس طرح کی خیراتی امداد سے کانپتا تھا اور لینے سے انکار کیا۔ خیال کرتا تھا کہ جہاد کے لئے جاؤں اور وہ دوسروں کی مدد سے ایسے آنے جانے پر حیف ہے۔

بہر صورت میرے لباس، سوٹ، کتابیں، تصاویر چونکہ قیمتی تھے معقول قیمت پر علی گڑھ کے پروفیسر اور طالب علموں نے خرید لئے اور میرا کام چل گیا۔

میرا ایک خیر خواہ رفیق خان تو رُ کا لڑکا جو میرے ساتھ تصویر میں ہے لکھتا ہے کہ مجھے خبر ملی ہے کہ تم بہت تنگ دستی کی حالت میں جا رہے ہو۔ مجھے اطلاع دو۔ تاکہ تمہیں کچھ رقم بھیجدوں اور اگر مجھ سے لینا نہیں چاہتے ہو تو پھر آپ کے والد صاحب سے جا کر کہہ دوں کہ آپ کے لئے رقم بھیج دیں آہ! اس بیچارے کو کیا خبر ہے کہ حقیقت کیا ہے؟ تاہم اسے سخت تاکید کی کہ ہرگز جناب قبلہ کو خبر نہ کرے۔ بہن نوشتۂ تقدیر نے فرصت نہیں دی کہ چند دن اور توقف کرتا۔ اپنے محبوب کی محبت یعنی بلقان پہنچنے کی بے قراری اور بے تابی میں از حد محو رہتا ہوں حتیٰ کہ اپنی بیماری کو بھی بھول چکا ہوں۔

دردیست درد عشق کہ اندر علاج او
ہرچند سعی بیش نمائی بتر شود

ہاں بھائی محمد اسحاق سے کہہ دینا کہ بھائی شمشاد کے ذریعے میری غلیل مجھے بھیجدیں۔

اسی اثنا میں حصولِ علم اور ترکی زبان سیکھنے میں برابر مصروف رہتا ہوں۔ انشاءاللہ جلد اس زبان کے سیکھنے میں مہارت حاصل کروں گا۔

خدا حافظ

تمہارا بھائی عبدالرحمان

ہاں دادا جان صاحب سے کہہ دینا کہ تمہارے بیٹے نے جو آپ کے ہاتھ کے قورمہ پلاؤ اور یخنی پلاؤ کھائے ہیں ان لذیذ کھانوں کو اب رزم گاہ بلقان میں حلال

کروں گا۔ سب اہل خانہ اور آپا فاطمہ صاحبہ، حسن جان، یوسف جان و اہل محلہ و عزیزی کو دعا سلام۔

شعار ما محبت بود کردیم　　　　حوالت با خدا کردیم و رفتیم

خط نمبر ۲

۲/ نومبر ۱۹۱۲ء

عزیزم محمد اسحٰق!

ترکی سلطنت کے زوال کی دل شکن خبریں سنکر ہوش بجا نہیں رہے۔ لیکن افسوس سے کیا فائدہ۔ افسوس ہمارے اختیار میں سوائے صبر کے کچھ نہیں ہے۔

وتعز من تشاء وتذل من تشاء

عزیزم! خواب کی حقیقت پر میرا غیر معمولی عقیدہ ہے اور اس طرح عالم خواب کا میرے ساتھ خاص تعلق ہے۔ مختصر یہ کہ خواب ایک طرح سے ہمارا صاف گو اور خفیہ جاسوس ہے صحت اور دماغی فعل کی حالت میں یہ بالکل ٹھیک کام کرتا ہے اور یہ دماغی فعل اس کی ذات میں ظاہر ہوتا ہے یعنی دنیا میں ہر چیز پہلے خیال و فکر کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے اور بعد ازاں عملی قالب اختیار کر کے مستقل صورت اختیار کر لیتی ہے پس مجھے یقین ہے کہ واقعات کے تجربہ سے یہ معاملہ آپ پر روشن ہو گیا ہو گا کہ انسان باوجود مستقبل کے لیے کوشش کرتے ہوئے ان عجائبات کے تمام مسئلے کو صحیح طور پر سمجھ سکتا ہے کہ انسان کا حال اس کے ماضی سے پیدا ہوتا ہے۔ اِس لیے جو چیز واقع ہوتی ہے وہ درست ہوتی ہے۔ یعنی ہماری توقع کے مطابق ہوتی ہے۔

برادرم : اپنے بارے میں کیا لکھوں۔ افسوس کہ کسی کی مدد یا ذریعہ سے جانے کو حد سے زیادہ نامناسب و بے جا سمجھتا ہوں طبیعت کی سبکی ایک مارِ آستین ہے۔ خیر! فی الحال موجودہ حالت میں تمھاری تجویز بادلِ نخواستہ واجب العمل جانتا ہوں، اور امید کرتا ہوں کہ کوئی معقول چیز ظاہر ہو گی۔

اطمینان رکھو۔ تمھارا عمل گھر میں ایسا ہو کہ یہ سخت حالت ظہور میں نہ آئے۔ اے بے خبر از سخن، تجھے کیا معلوم کہ یہ سطریں میں کس خیال اور کس حال میں لکھ رہا ہوں۔ میرا دل جانتا ہے یا پھر میرا خدا جانتا ہے۔ افسوس اس دنیائے ناکام پر۔ چاہتا ہوں کہ اپنے طور پر ایک طویل ہدایت نامہ لکھوں لیکن کائنات کا پراگندہ شیرازہ مانع ہے۔

تمھارے خط کے شروع میں جو دعائیہ اشعار تھے اس سے میں بہت خوش ہوا۔ خدا تم کو بامراد کرے۔

عزیز! تم کو چاہیے کہ بہنوں، حسن جان اور یوسف جان کا خیال رکھو۔

اپنے قلب و ضمیر کی آزمائش میں اور انسانی حقوق کی نگرانی میں تمھاری کامیابی پر میں خوش ہوا۔

فضل امین صاحب کی طرف سے سلام پہنچے۔

عبدالرحمٰن

خط نمبر ۳

قسطنطنیہ

۷ مئی ۱۹۱۳ء

عزیزم بی بی کو جان

خوش آمدید! بخیر آمدید، مانده باشید!

خواہر گل من! خیریت تو تھی! میں تو جنگ کے میدان اور انتظار میں مصروف تھا یقین کرو کہ اپنی جان تک کا ہوش نہ تھا۔

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی

جس وقت بھی فرصت ملتی فوراً جنگی حالات کو دیکھنے کے لئے دوڑتا۔ البتہ مجھے عزیزہ سے شکایت ہے آپ کو چاہیئے تھا کہ اس اثنا میں اپنی خیریت اور حالات سے آگاہی دیتی رہتیں۔ خیر میں نے بھائی محمد اسحاق جان کو بطور مذاق لکھا تھا کہ بس بی بی کو جان سے اب کوئی تعلق نہیں رہا۔ عزیزم مبادا کہ میرے اس تحریر کو سچ سمجھو تمہاری سر کی قسم ہے کہ تمہارے خط نہ آنے پر بھی خط لکھنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ آپ جیسے عزیز دستوں کو کون سا بھائی فراموش کر سکتا ہے خداوند کریم آپ کو ہمیشہ آبرو اور عزت سے رکھے۔

عزیزم شکایت کرتی ہو کہ بلقان جاتے وقت آپ کو اطلاع دیکر نہیں گیا۔ آہ یہ شکایت سب کو ہی مجھ سے ہے عزیزہ ناراض نہ ہونا ہندوستان کا ملک تھا اگر ایک ادنٰے اشارہ بھی کسی کو معلوم ہو جاتا تو میرا جانا ملتوی ہو جاتا۔ نیز خرچ نہ ہونے کی وجہ سے عین وقت تک جانے کی کوئی امید نہ تھی۔ آپ کو کیا علم ہے کہ کس کس تدابیر اور جانفشانی سے لیکن باعزت طریقے سے رقم حاصل کر چکا ہوں۔ جس وقت ان حالات کو یاد کرتا ہوں تو اب بھی میرا رواں رواں کانپ جاتا ہے۔ بات یہ تھی کہ رقم تو اکثر کالج کے یار دوست دینے کو آمادہ تھے لیکن وہ دوستانہ طور پر دینا چاہتے تھے لیکن قرض کے طور پر نہیں اور یہ بات مجھے منظور نہ تھی۔ خیال کرتا تھا کہ یا الٰہی کس کام پہ جا رہا ہوں اور وہ بھی دوسروں کی امداد پر! قصہ مختصر کہ اس مالک حقیقی نے میری ایسی ہی امداد کی جیسا میں چاہتا تھا۔ اکثر میرے دوستوں نے بطور یادگار

اور تبرک میرے کپڑے وغیرہ خرید لیے۔ آپ لکھتی ہیں کہ میں نے آپ سے رقم لینے سے کیوں انکار کیا جانتی ہو کہ وہ پیسے جو تم نے اپنے خرچ و اخراجات سے جمع کئے تھے وہ پیسے میں اپنے ساتھ لے جاتا یہ میری طبیعت نے گوارا نہیں کیا حقیقت یہ تھی کہ اس سفر کا راز پوشیدہ رکھنا ضروری تھا۔ بھائی فضل امین کی غلطی کی وجہ سے قریب تھا کہ یہ راز کھل جاتا کیونکہ میں تو اپنے تگ و دو میں مصروف و پریشان تھا اور انہوں نے میرے بغیر اطلاع کے آغا لال جان کو تار دیا کہ عبدالرحمان کے لئے جلدی رقم بھیجو مجھے بعد میں جب انہوں نے یہ حال بتایا تو قریب تھا کہ انتہائی غصے میں آ کر اسے خوب برا بھلا کہتا لیکن وہ بچ گیا اور اسی وقت آغا لالہ صاحب کو تار دیا کہ ابھی میرے جانے کا ارادہ نہیں اور رقم کی ضرورت نہیں ہے۔

پس میں نے سوائے علی گڑھ کے چند رفیقوں کے کسی کو یہ حال نہیں بتایا اور علی گڑھ کے لوگ جانتے تھے کہ کوئی اور جائے یا نہ جائے لیکن عبدالرحمان جانے والا ہے پس عزیز بہن! اب تو اصل معاملہ سمجھ گئی نا؟ ناراض نہ ہونا۔

واللہ ان دنوں سخت گھبرایا ہوا تھا کہ مبادا آپ لوگوں کو پشاور میں خبر نہ ہو ورنہ آپ لوگ رونا دھونا شروع کر دیتے کہ اے لوگو خدا کے لئے ہمارا لالہ جان اس بیماری کی حالت میں کہاں جا رہا ہے جلدی کریں تار دیدیں۔ ہاں لالہ جان کو روک دیں اور جانے نہ دیں۔

یقین کریں کہ یہاں اب بھی اکثر خواب میں یہی نظارہ دیکھتا ہوں کہ اپنی پیاری زربانو سے لڑتا ہوں کہ آپ لوگ کیوں گھبرا رہے ہیں اور میرا پیچھا نہیں

چھوڑنے غرض وہ تمام کش مکش اب ختم ہوگئی اور آخر یہاں پہنچ ہی گیا۔

آپ کو یاد ہے کہ کہتا تھا کہ مجھے مت ستانا۔ ایک دن آپ سے جدا ہو جاؤں گا اور افسوس کریں گی کہ کیوں بھائی عبدالرحمان سے کچھ نہیں پڑھا اور سیکھا اب بھی آپ کو چاہیئے کہ اپنا وقت ضائع نہ کریں اور اپنا مطالعہ جاری رکھیں۔

ہاں عزیزہ اڈریانوپل ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔ اللہ پناہ دے جس دن یہ منحوس خبر سنی یہاں کیا حال تھا لیکن نوشتۂ تقدیر سے کون مقابلہ کر سکتا ہے جانے والی چیز ہاتھ سے نکل گئی۔ تاہم تاریخ میں ایک نام رہ گیا کہ غازی شکری پاشانے کس طرح دشمن سے مقابلہ کیا جانتی ہو کہ جس وقت دشمن کی فوج ان جانثاروں کو بے تحاشہ قتل و غارت کر رہی تھی ترک سپاہی شدت پیاس اور بھوک سے اپنے توپوں کے دھانوں پر اپنا منہ رکھ کر آخری سانس لے رہے تھے۔

اللہ اکبر رحمت ہے ایسے جانبازوں کی ماؤں پر کاش سب ترک ایسا ہی جذبہ پیدا کرتے۔

آہ افسوس۔ صد افسوس کہ چند بد بخت ترکوں کی غفلت اور نا اتفاقی اور ملت فروشی کے باعث مفت میں یہ لوگ مارے گئے

بے چارہ انور بے بھی ہمارے قریب کوئی دو تین میل کے فاصلے پر میدان جنگ میں پڑا ہوا ہے۔ ایک مرتبہ اس نے بلغاری فوجوں پر حملہ کر کے ان کو پسپا بھی کر دیا لیکن جو کھیل ہاتھ سے نکل چکا ہو۔ اسے دوبارہ ہاتھ میں لاتا آسان کام نہیں ہے۔ عزیزی ام اخبار زمیندار میں جو خط عبدالرحمان کے نام سے شائع ہوا ہے وہ بندے کا لکھا ہوا ہے۔ آئندہ بھی اگر فرصت ملی۔ الہلال میں کوئی نہ کوئی مضمون

بھیجتا رہوں گا۔

میری جان باوجود گوناگوں مصیبت و مصائب شتلجہ کے پہاڑوں کو ہم نے خوب تہ و بالا کیا۔ کئی مرتبہ برف اور کیچڑ میں گردن اور کمر تک دھنس گئے تھے لیکن جس کا نگہبان اللہ تعالیٰ ہو۔ اس کو کیا پرواہ ہے۔ اگر ان تکالیف کا حال آپ کو زبانی سناتا تو آپ کانوں پر ہاتھ رکھ دیتیں کہ لالہ جان بس اور ہمیں سننے کی تاب نہیں۔

میری طرف سے داداجان کی خدمت میں آداب اور سلام عرض کریں۔ واللہ آپ بہت ہی یاد آتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ جیسی بہنیں ہر ایک کو دے۔

خداحافظ و ناصر

تمہارا بھائی عبدالرحمان

خط نمبر ۴

قسطنطنیہ

عزیزی خواہرم بی بی کو جان

عزیز بہن۔ خط میں جو دعائیں تم نے اپنے اس مسافر بھائی کے حق میں کی ہیں! میری نگاہ میں ان کی قیمت بیش بہا موتیوں سے بڑھ کر ہے۔

الٰہی ہر کجا باشی بہار آبرو باشی

پیاری بہن! سچ کہتی ہو کہ اللہ تعالیٰ کسی مسافر کو بے آبرو نہ کرے ورنہ اس سے مرگ بہتر ہے اور مجھے امید ہے کہ آپ جیسے مخلص بہنوں کی دعاؤں کی برکت سے میری عزت قائم رہے گی۔

عزیزی! اس سے قبل کہ کچھ اور حال لکھوں بہتر ہے کہ آپکو ادرنہ یعنی "اڈریانوپل" کے فتح ہونے کی حالت لکھوں۔

بہن! یاد رکھنا کہ اللہ تعالیٰ کو ظلم وستم کا شیوہ ہرگز پسند نہیں۔

چنانچہ وہ مظالم اور سفاکی جو درندے بھی نہ کریں وہ ان فوجی ملعون بلغاریوں نے مقدونیہ کی عورتوں اور معصوم بچوں پر کیئے۔ ان ناقابل بیان مظالم پر آخر کار اللہ تبارک کی رحمت جوش میں آئی! اور ابھی اسلامی لشکر مد مقابل سے پسپا نہ ہونے پائے تھے کہ ہزاروں لاکھوں خواتین اور معصوم بچوں کی دلدوز فریاد نے اپنا اثر دکھایا۔ یعنی بلکجنت ان میں پھوٹ اور اختلاف پیدا کر کے شعلۂ غضب اور انتقام پیدا کر دیا اور سرویا یونان اور رومانیہ والوں نے اس بلغاری درندوں کو گھیر لیا اور اس کو اپنی گرفت میں جکڑ

کر کہا ٹھہرو کہاں جاتے ہو! اس پھوٹ کی وجہ یہ تھی کہ بلغاریہ ملعون چاہتا تھا کہ کثیر مال غنیمت جو عثمانیوں کی شکست پر ان کے ہاتھ آگیا تھا تنہا وہ اس پر متصرف ہونا چاہتا تھا اور دوسرے بلقانی باشندے اور لشکر اپنے قبضے میں کرنا چاہتے ہیں

لہٰذا اس انتقام اور آتش غضب میں آکر وہ لڑنے مرنے پر آمادہ ہو گئے اور آنِ واحد میں بلغاریوں کو پیچھے ہٹنا پڑا۔

اب کیا دیر تھی ادھر اسلامی لشکر جو مقام لولی برغاس کے میدان میں شکست کھا چکا تھا اور ہمیشہ جنگ و پیکار کا عادی تھا۔ اس موقع کو غنیمت جان کر اچانک اس نے ماہ جولائی کے ۱۵ تاریخ ادرنہ پر حملہ کیا اور ۲۲ جولائی کو حضرت عزت پاشا نے اپنی عاقلانہ تدبیر کی وجہ سے اپنی تمام فوجی دستے کو انور بے کے ماتحتی میں دے کر روانہ کیا۔

اس مردِ مجاہد نے اسی تاریخ کو ادریانوپل میں داخل ہو کر جتنے بلغاری وہاں باقی رہ گئے تھے سب کو قید و بند کر لیا اور اسی شام حضرت عزت پاشا بھی مع بقایا فوج ادریانوپل پہنچ گئے۔ اور ۵۰ میل کے قریب حیرت انگیز مارچ کر کے جو ایک ہی دن میں ہوتی اور دوسری فوج کے دستے نے۔ نیز اسی مقررہ دن پہنچ کر قرق کلیسا کو فتح کیا۔

پیاری بہن! جانتی ہو کہ اس ملعون کی شکست کا باعث کیا تھا۔؟

یہ بلغاریہ جس کا نام فرڈننڈ ہے اس شیطان نے فتح (قرق کلیسا) کے گھمنڈ میں آکر تمام اسلامی پرچم جو اسلامی لشکر کے شکست سے ان کے ہاتھ میں آتے تھے اور ان پرچموں پر آیاتِ کلام پاک اور کلام ربّانی لکھے ہوتے تھے۔ ان پرچموں کو پائے انداز کے طور پر بچھا کر اس پر گزر کر شہر قرق کلیسا میں داخل ہوتے۔

اس آیاتِ ربانی کی بے حرمتی اور بہیمانہ ظلم و ستم کی وجہ سے اس کو شکست پر شکست

ہو رہی ہے اور یہ کم بخت اب عورتوں کی طرح بیٹھ کر رو رہا ہے کہ کیا تھا اور کیا ہو گیا۔ تیس سال قبل جب بلغارستان سلطنت ترکیہ کا ایک صوبہ تھا۔ اس وقت اسی فرڈیننڈ ایک صوبہ دار کی حیثیت سے قسطنطنیہ میں آکر سلطانِ وقت کے پاؤں کو ترکی رسم کے مطابق بوسہ دیا تھا لیکن آج یہی کمبخت فتح کے نشہ میں اس قدر غرور میں آگیا تھا کہ وہ جانتا تھا کہ وہ اس سرزمین پر میری خدائی ہے : نعوذ باللہ من ذالک

یارب مبادا آں کہ گدا معتبر شود

آج کے اخبار میں چھپا ہے کہ ادریانوپل میں ۱۵۰ توپیں پچاس ہزار بندوقیں اور باقی سامان وغیرہ جو غازی شکری پاشا سے چھین لئے گئے تھے انور بے کے ہاتھ آیا ہے۔ یہ اُسی انور بے کے ہاتھ آیا ہے جن کے پہلو میں تصویر میں مجھے دیکھتی ہو۔

جس وقت سلاطین عثمانیہ نے یورپ کے فتوحات کا آغاز کیا تھا سب سے پہلا دارالخلافہ ادریانوپل تھا۔ اور بعد میں استنبول کو فتح کیا تھا۔

لیکن افسوس کہ ترکی جرنیلوں کی لاپرواہی اور غفلت سے یہ مقامات ان کے ہاتھ سے نکل چکے تھے اور اب اللہ تعالیٰ نے دوبارہ ہمیں یہ مقامات عطا کئے۔ آج یہاں تین لاکھ جری فوج میدانِ جنگ سے آراستہ و پیراستہ تھے۔

دیکھتی ہو میری جان کہ اللہ تعالیٰ کے کام کیسے نرالے ہوتے ہیں۔ کس کو دم مارنے کی مجال ہے؟ تمام دُنیا حیران ہے کہ کیا تھا اور کیا ہوا۔

یورپ کے عیسائی ششدر و حیراں ہیں کہ ترکی جن کی نمازِ جنازہ وہ لولی برغاس کے میدان میں پڑھ چکے تھے۔ دوبارہ قبر سے نکل آیا لیکن انہیں کیا معلوم کہ ابھی تک سینۂ مسلم میں ذوقِ رزم باقی ہے۔ اگرچہ دشمن کے دل میں ابھی آتش انتقام سرد نہیں

ہوئی ہے لیکن ہمیں اس کی کوئی پرواہ نہیں اور ذات پاک پر توکل ہے۔ دیکھیں کیا ہوتا ہے؟

۲۳ جولائی اور ریانوپل وغیرہ مقامات ہمارے ہاتھ آئے تھے اور اس کے دوسرے روز ۲۴ جولائی ترکی کا جشنِ آزادی کا سالانہ دن تھا یعنی نیازی بے اور انور بے نے سلطان عبدالحمید کو تخت سلطنت سے اتار کر ملک و قوم کو شہنشاہیت کے ظلم سے نجات دلائی۔ چنانچہ ۲۳ جولائی قسطنطنیہ میں عام طور پر چراغاں کا انتظام کیا گیا تھا۔ رات بھر جشن منایا گیا اور خوشیاں منائی گئیں لیکن افسوس کہ کسی خاص کام کی وجہ سے میں اس جشن میں شرکت نہ کر سکا۔

بہن خط میں دریافت کرتی ہو کہ آپ بڑے خوش نصیب ہیں کہ دریائے باسفورس کے کنارے مقام رکھتا ہوں! لیکن آہ! بے خبر ہو۔ گو انسان کو ہر حال میں شکر کرنا چاہیئے۔ مگر پھر بھی مسافرت کے مصائب و آلام بے پایاں ہوتے ہیں اور آپ جو محض خانگی ناز و نعم میں زندگی بسر کرتی ہیں۔ دُنیا کے گرم و سرد، تلخ و شیریں کا اندازہ کس طرح کر سکتی ہیں خیر بہر صورت آپ کی محبّت آمیز اور دلسوزی کی باتیں مجھے ازحد متاثر کرتی ہیں۔

اگر دنیاوی اور معاشی کاموں میں مصروف ہوتا تو آپ کے اس محبت اور ہمدردانہ باتوں کے معاوضہ میں سونے اور جواہرات سے دیتا لیکن آپ کو معلوم ہے کہ خدمتِ خلق اور دین میں مصروف ہوں اور یہاں بجز مسکینی اور ناداری کیا ہے لہذا سوائے دُعا میرے پاس کیا ہے۔

ایک جگہ لکھتی ہو کہ ترکی عورتیں کیسی ہوتی ہیں؟ گو اس وقت نہ فرصت رکھتا ہوں اور نہ طبیعت موزوں ہے تاہم کچھ مختصر حال لکھ دیتا ہوں تاکہ آپ کے کام آئے۔ ترکی عورتیں ایک عجیب کردار کی مالک ہیں۔ کاش تم ان کو دیکھتیں اور ملاقات کرتیں۔ ترکی

عورتیں ازحد محنتی ہوتی ہیں۔ اپنا پوشاک لباس خود دھوتی ہیں۔ استری کرتی ہیں لیکن نہایت خوش اسلوبی اور صفائی سے۔

اپنے بچّوں، بچیوں کے لباس یعنی فراک اور ڈریس کو اس قدر نفیس اور پاکیزہ سلائی کرتی ہیں کہ ہمارے چھوٹے کے درزی ان کے سامنے ہیچ ہیں۔ کروشیہ، جالی کے لبس اور ہر قسم کے سوزن کاری کا سیکھنا ہر عورت کے لئے ضروری ہے۔ ان کی اخلاقی اعلیٰ سیرت اور پاکیزہ تربیت اولاد کے مقابلے میں یورپ کی عورت بھی مات ہے۔ شکل و صورت حسین اور دلکش رکھتی ہیں۔ ترکی گھر کس قدر پاکیزہ اور آراستہ ہوتا ہے۔ غرض ترک عورت ہر لحاظ سے قابلِ رشک عورت ہے لیکن اس کے خلاف ترکی مرد بہت آرام طلب و عیش پرست ہوتے ہیں۔ اکثر اوقات قہوہ خانوں میں قہوہ نوشی میں مصروف ہوتے ہیں۔ علم و ہنر کے کوئی خاص شائق نہیں ہوتے اور نہ ہی اخلاقی باریکیوں میں دلچسپی رکھتے ہیں۔

البتہ ترک عورتوں میں ایک عیب ہے کہ حدِ اعتدال اسلامی سے زاید آزاد ہیں لیکن اس کا الزام بھی ترک مردوں پر ہے۔ اگر وہ اجازت نہ دیتے تو ترک عورتیں اتنی تجاوز نہ کرتیں۔

مجھے ترکی ملک میں کوئی چیز اس قدر پاکیزہ اور حسین نظر نہیں آئی کہ جتنی ترک کی عمر رسیدہ عورتیں۔ عزیزی وہ اس قدر نورانی صورت اور کس قدر نرم مزاج اور مہربان و خلیق ہوتی ہیں کہ سبحان اللہ! یقین کرو کہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی مقام بہشت سے وارد ہو رہی ہیں۔ مختصر کہ شرافت پاکیزگی بزرگی میں فرشتہ صورت و سیرت کا ایک نمونہ ہیں۔ ان خواتین میں سے ہر ترکی عورت کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ میں ایک دور دراز ملک سے اسلام کی خدمت کے لئے آیا ہوں اس قدر

متاثر ہوتی ہیں کہ بے ساختہ ان کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں اور مجھے تسلّی دیتے ہوئے کہتی ہیں کہ ہمیں اپنی والدہ سمجھو، تم ہمارے بیٹے ہو۔

ایک مرتبہ اس اثنا میں خواب دیکھتا ہوں کہ پشاور آیا ہوں لیکن وہاں سب کو بہت پریشان اور غمگین پاتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو خیریت سے رکھے ــــ واللہ اعلم کیا وجہ ہے۔

تمہارا مسافر بھائی

عبدالرحمان

خط نمبر ۵

۷ جولائی ۱۹۱۳ء، شملہ! عزیز محمد اسحٰق!

میرے گذشتہ خط سے تمہیں اچھی طرح یقین ہو گیا ہو گا کہ میں نے تمہیں ہرگز فراموش نہیں کیا ہے لیکن ہنسی اس بات پر آرہی ہے کہ اپنے دل میں کہو گے کہ لالہ جان نے مجھے یاد بھی کیا کس بے رحمی سے! لیکن جانتے ہو! آخر بڑا بھائی ہوں۔

پند استاد بہ ز مہر پدر

عزیزم! حقیقت یہ ہے کہ میرے دوستوں اور رفیقوں میں سوائے معدودے چند ہر ایک کو میرے خط نہ لکھنے پر اعتراض اور شکایت ہے چنانچہ ایک دیرینہ واقعے کا حال تمہیں لکھتا ہوں جو میری اس کمزوری کو خوب نمایاں کر سکے گا۔

قریباً سال کا عرصہ ہوا ہے کہ میرے عزیز دوست فضل امین نے مجھے کوئی

نصف درجن خط لکھے لیکن میری طرف سے صدائے بر نہ خواست والا معاملہ تھا
آخر میرا یار مہربان دمجبور ہو کر میری جائے قیام کو روانہ ہوتا ہے تاکہ معلوم کرے کہ اس طویل خاموشی کا باعث کیا ہے۔ اتفاق دیکھئے کہ ان کے روانگی کے دن میرے دل میں خجالت اور ندامت محسوس ہوتی ہے کہ میں نے اس قدر عرصہ سے ان کے لگاتار خطوط کا کوئی جواب نہیں دیا ہے۔ واللہ اعلم وہ کس قدر پریشان ہوگا۔ اور اس تصور کے آتے ہی ان کی جائے قیام کو بلا اطلاع روانہ ہوتا ہوں۔

چنانچہ برادر مہربان فضل امین پشاور پہنچتا ہے! اور میں پٹیالہ کے راستے ہو کر لاہور کچھ دیر ٹھہرا تھا کہ مجھے وہاں تار ملا اور میں فی الفور پشاور روانہ ہوا اور یوں میری سُستی کا مضحکہ خیز ڈرامہ ختم ہوا۔

اس واقعہ کے لکھنے سے میری مراد یہ ہے کہ اس معاملہ میں کس قدر لاپرواہ واقع ہوا ہوں اور جانتا ہوں کہ یہ طریقہ اکثر تشویش اور دل آزاری کا باعث ہوتا ہے۔ دُعا کرتا ہوں کہ اس بُری عادت سے اللہ تعالیٰ نجات دے۔

نیز ان ایام میں میری طبیعت اس قدر پریشان رہی ہے کہ یہ خط بھی انتہائی جبر سے لکھ رہا ہوں۔ خوب دیکھئے کہ یہ صفحات کس قدر بے سود و بے فائدہ باتوں سے بھر گئے تمہارے آلنڈہ جانے کے بارے میں بہت سوچا لیکن جب تک ہمشیرگان کی کارِ خیر انجام کو نہ پہنچے ہر گز ہر گز کہیں نہ جانا۔ ہاں جب اس کارِ خیر سے فرصت ملے پھر توقف کرنا حرام فہمیدی۔! میں نے روانگی کے وقت بھائی فضل امین صاحب سے تمہارے بارے میں ذکر کیا تھا لہذا ضرور ان سے فارسی اور کبھی اُردو میں خط و کتابت کرتے رہو۔ وہ جواب دینے میں میرے سوا سخت لاپرواہ واقع ہوتے ہیں لیکن تم اس کی پرواہ نہ کرنا۔

میرا ایک اور دوست بھی میرا یخدان پہنچانے کے بارے میں آپ سے دریافت کرنے آئیں گے۔ یہ بھی بہت لائق و نیک خصلت انسان ہیں اگر ممکن ہو سکے ان سے بھی خط و کتابت کرنا۔ یہ شخص علم ہیئت و سیارہ میں خاص ذوق و قابلیت رکھتے ہیں۔ ان کا نام محمد احمد صاحب ہے۔

ہاں اسحٰق جان ایک کام کرنا۔ جمعرات کے دن لالہ غلام سرور کو اپنے ساتھ لے کر والدہ صاحبہ کے مزار پر جانا اور میری طرف سے اماں جان کو میرا آخری پیغام پہنچا دینا اور لکھنے کی ہمت نہیں ہے۔ رخصت ہوتا ہوں۔

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام　　ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

بڑی آپا صاحبہ کے ہاں جا کر ان کی دلجوئی کرنا۔

تمہارا بھائی، عبدالرحمان

از قادیاں

۵ مئی ـــــ　　والد صاحب کو علم ہوا کہ غازی موصوف قادیان گئے ہیں تو آپ نے ازحد پریشانی اور ناراضگی کا اظہار فرمایا۔ چنانچہ جب ان کو اطلاع ملی۔ والد صاحب کے نام پر یہ عریضہ لکھ بھیجا۔　　شیریں تاج

خدا دارم دل بریاں زعشق مصطفےٰ دارم　　ندارد کہنہ نورالدین طریقتہا کہ من دارم

مکرم و معظم قبلہ ام! تکریم و نیاز

السلام علیکم

بعد ادائیگی دست بوسی و تعظیمات معروض ہوں کہ حضور کا نوازش نامہ نے شرف

وصولیت بخشنا۔ یہ سُن کر کہ میرا قادیاں میں آنا جناب کے لئے ایک گونہ باعث نا اطمینانی و بد گمانی ثابت ہوا ہے۔ مجھے غایت درجہ افسردہ و پشیمان کر رہا ہے لیکن ایک عرض ضرور خدمت میں کروں گا کہ چونکہ اہل غرض اندھا ہوتا ہے۔ اس لیئے لاچار ہو کر یہاں آنا پڑا۔ باقی رہا جھگڑا میرے عقائد کا، ان کے متعلق میں مختصراً اور صاف الفاظ میں حضور سے عرض کئے دیتا ہوں کہ میں تو دنیا میں صرف ایک بات مان کر اپنا ایمان جانتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ دُنیا اور آخرت کے لئے اگر کچھ ہونا چاہیئے تو وہ یہی ہے کہ اسلام کی پاکیزہ راہ میں اپنی جان وار کردوں۔

سوائے اس امر کے میرے نزدیک مولوی نورالدین کے دلکش طرز بیاں یا کسی اور شخص کا دلدوز طریق اظہار! سب کچھ ہیچ ہے۔ میں تو صرف ایک بات کا قائل ہوں جس کو اپنے لئے فرض کر چکا ہوں۔ میرا اس بات پر دل و جان سے یقین ہے کہ اس دنیا میں نُونام آوری کی غرض سے اور آخرت میں پل صراط پر سے امن کے ساتھ گزرنے کے لئے اگر کوئی وسیلہ ہے تو پاک و آسان وسیلہ شہادت ہے۔ آپ تسلی فرمادیں۔ میں ان لوگوں کی پیچیدہ اور دور دراز مذہبی جھگڑوں میں آنا قطعاً گوارا نہیں کرتا۔ ماسوائے اس کے میں ایک موٹی عقل کا آدمی ہوں بھلا مجھ کو عقائد کی باریکیوں سے کیا لینا ہے۔ مزید برآں آج کل جو کچھ جور و ستم اور ظلم تعدی میرے مسلمان بھائیوں پر طرابلس ایران اور مراکو میں ہو رہے ہیں ان کے دردناک قصوں کے پڑھنے سے اور ان کا رونا رونے سے تو فرصت ملتی نہیں تو ہم ان مذہبی مداریوں اور شعبدے بازوں کی کرتب بازی کو کہاں سے وقت لا کر دیکھیں۔

خیر دعائے خیر میرے حق حضور فرمایا کریں تو یہ سب کچھ ہیچ ہے۔ کیفیت صحت بدستور ہے۔ ابھی علاج باقاعدہ طور پر شروع نہیں ہو سکا۔ والسلام

آپ کا تابعدار بیٹا : خادم عبدالرحمان

ضمیمہ نمبر ۶

مصر میں انگریزوں کی پالیسی

نوٹ:- یہ وہ مضمون ہے جو مولانا حسرت موہانی کے مشہور رسالہ اُردوئے معلٰی میں ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا تھا اور مولانا کے کاتب مضمون کا نام نہ ظاہر کرنے پر ان کو دو سال کی سزا ہوئی تھی۔ خیال ہے کہ یہ مضمون فضل امین صاحب کا لکھا ہوا تھا جن کا ذکر اس مضمون کے سلسلے میں صفحہ ۶۵ پر موجود ہے۔

انگریزوں سے بڑھ کر شاید ہی کوئی قوم دوسرے ملکوں پر حکومت کرنے میں مشاق ہو۔ یہ لوگ جس ملک پر تسلّط کرتے ہیں پہلے ان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہاں کے باشندے مطمئن رہیں اور اپنے حکمرانوں کو اعتبار کی نظر سے دیکھنے لگیں۔ اس کے بعد یہ لوگ اپنے ہاتھ دکھاتے ہیں۔ سب سے پہلے یہ کوشش ان کی حکمراں جماعت کی یہ ہوتی ہے کہ محکوم قوموں اور ملکوں میں اپنی حالت سنبھالنے کا احساس نہ ہونے پاتے۔ جہاں تک ہوسکے محکوم قومیں آپس میں لڑتی جھگڑتی رہیں اور ہمدردبنی نوع انسان ان کی باہمی عداوت سے خوب فائدہ اٹھائیں۔ محکوم قوموں کی قومی بقا کو تباہ کرنے کی جو کوشش انگلستان نے کی ہیں شاید ہی کسی اور نے کی ہوں۔

قومی ترقی کے اسباب کو ایسے غیر محسوس ذریعوں سے روکا کہ کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہوئی مگر ان کی پالیسی اپنا اثر کر گئی۔ لاریب جب ایک حکمران قوم اپنے

محکومین کے مستقبل سے متعلق اپنا کوئی خاص مدعا قرار دے لیتی ہے تو ایک نہ ایک دن وہ پورا ہی ہو کر رہتا ہے۔ مسلمانوں کو سلطنت انگلستان سے ٹرکی کے بعد سب سے گہرا تعلق ہے اور اگر انگریزوں میں مسٹر بارٹلٹ آنجہانی کے خیال کے لوگ پیدا ہوتے رہتے تو غالباً دونوں قوموں کے تعلقات دوستانہ ہو جاتے۔ مگر اس وقت سب سے زیادہ نقصان ہم مسلمانوں کو انگریزوں ہی سے پہنچا ہے۔ سلطنت ترکیہ کی تباہی کے انگریز ہی بانی ہیں۔ کریٹ اور مقدونیہ کے معاملات میں سب سے پہلے انگریز ہی ثالث بنتے ہیں۔ مصر اور ہندوستان کے مسلمانوں کے ملکی وجود کو تباہ کرنے میں انگریز ہی سرگرم نظر آئیں گے۔ عربی پاشا جو مصر کی آزادی اور نئی روشنی کا حامی اور نئے خیالات کا لیڈر تھا کیا وہ اس لائق تھا کہ اس کو جلا وطن کیا جاتا۔؟ سیلون سے گو وہ مصر میں آگیا تھا مگر ایک کشتی میں قید ہے اور اپنی زندگی کے باقی ایام کو نہایت حسرت اور یاس کی حالت میں دریائے نیل میں بسر کر رہا ہے۔ قاہرہ آنے کا حکم نہیں۔ غریب کی معاش کا نہایت ہی ناکافی بندوبست ہے۔ مصر میں انگریزوں نے ۱۸۹۰ء تک رہنے کا وعدہ کیا اور انگلستان کی عزت کا حلف اٹھایا تھا مگر آج جاتے ہیں اور نہ کل بلکہ روز بروز قدم جماتے جاتے ہیں۔ اس پر بھی بس نہیں کرتے جب کہ مصر کی قومی ترقی اور نموئے ملّی کو بھی غارت اور تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ انگریزوں کے قدم آتے ہی تعلیم میں کمی آگئی تو آبادی میں تین لاکھ کا اضافہ ہوا اور آمدنی پہلے کی نسبت چھ گنی ہو گئی۔

ذیل میں ہم ایک فہرست لکھتے ہیں جس سے تعلیم کو جو نقصان انگریزوں کے قبضۂ مصر سے پہنچا ہے واضح ہو جائے گا۔ ۱۸۷۲ء تک معلمین کی تعداد ۱۹۴۷۸ تھی، (انگریزوں سے پہلے) ۱۸۸۹ء میں یعنی انگریزوں کے دخل کے ساتھ ہی ۱۳۰۷۵ رہ

گئی اور بالفعل یعنی ۱۹۰۵ میں کم سے کم ہوتے ہوتے ۲۰۳ ۱۲ پر آپہنچی۔ پہلے ملک میں ۶۳ مدارس تھے مگر اب صرف ۵۰ ہیں۔ متذکرہ بالا شمار و اعداد سے انگریزوں کی نیک نیتی اور قبضے کے مزید اثرات کا خوب پتہ چلتا ہے۔ اور ضمناً کرومر کے اس وعدے کی تصدیق ہوتی ہے کہ میں نے اپنی عمر کا بہترین حصہ فلاحین مصر کی فلاح اور بہبودی میں صرف کیا ہے۔

ظاہر ہے کہ ہر قوم کی ترقی، تہذیب و شائستگی کا اندازہ اس کی تعلیمی حالت سے ہوتا ہے اور تعلیم ہی ایک ایسی چیز ہے جس کی بدولت ملک و ملّت ذلّت و خواری کی کینچلی اتار کر پھینکتے ہیں۔ مگر مصر میں باوجود انگریزوں کی تعلیم کے باب میں سدراہ ہونے کے تعلیم پھیلتی جارہی ہے

ہر چند کہ کرومر[1] نے فیس بڑھادی اور سررشتہ تعلیم کا خرچ کم کردیا مگر وہ تعلیم کی عام خواہش کو اور آزادی کے بڑھتے ہوتے سیلاب کو روک نہ سکا۔ پہلے زمانے میں یعنی ہمدردان بنی نوع بشر کی تشریف آوری سے پہلے مصر کے سررشتۂ تعلیم کا خرچ ایک لاکھ پونڈ تھا مگر انگریزوں نے رعایا کی خیر اندیشی کے خیال سے گھٹا کر ۰۰۰ ۲۳ ہزار پونڈ کر دیا اور اس میں نصف فیس کی رقمیں بھی شامل ہیں۔ سررشتہ تعلیم کے انتظامی مناسب کا بندوبست انگریزوں کے ہاتھ میں ہے۔ غور کا مقام ہے کہ انگریز مصر کی ضروریات کیا خاک سمجھ سکتے ہیں اور ملکی زبانوں سے نابلد اشخاص تعلیمی مسائل کی مقامی دقتوں کو کیونکر حل کر سکتے ہیں۔ انگریز جنھیں برسوں ہندوستان میں جھک مارتے گزر جاتے ہیں اردو تک ٹھیک نہیں بول سکتے۔ ان سے یہ کیونکر توقع کی جاتے کہ ان لوگوں کو مصر کا چند روزہ قیام زبان عربی

---

[1] لارڈ کرومر مصر میں برطانوی ہائی کمشنر تھا

کا ماہر بنا دے گا۔ جس کے نکات اور رموز سوائے اہل زبان کے کوئی شخص چاہے کتنا ہی بڑا عالم کیوں نہ ہو نہیں جان سکتا۔ اس وقت مصر کو تحصیل علم و آزادی کے لئے جد و جہد کرتے دیکھ کر جب ان ہمدردان بنی نوع بشر کا دل کڑھا تو وہاں تعلیم کو روکنے کے لئے چالبازی سے بڑھ کر جبر و تشدد سے کام لینا شروع کر دیا۔ چنانچہ اب مصر میں یہ تجویز ہو رہی ہے کہ علوم و فنون کا درس حسب سابق عربی میں نہ دیا جاتے۔ عربی زبان نے اپنی وسعت کی وجہ سے آج تک یورپ کے تمام علوم کو جگہ دی تھی اور مغربی اثر نے اس کی رُوح کو تازہ کر دیا تھا۔ مُلک میں زیادہ تر علُوم اسی زبان میں پڑھاتے جاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ کوئی ملک ادبی ذخائر سے اس وقت تک مالا مال نہیں ہو سکتا تا وقتیکہ ملک میں اخذ کی قابلیت نہ ہو اور غیر (ملکی لسانی) سرمایہ اس میں جمع نہ ہو جاتے۔ انگریزی زبان ہی کی تاریخ کو دیکھئے۔ اگر اس میں فرانسیسی اور لاطینی علم و ادب کا اثر نہ ہوتا تو یہ بھی چند وحشی زبانوں کی طرح سے ہوتی۔ عربی زبان کی یہ ترقی اور اس میں نئی جان پڑتی دیکھ کر کرومر جیسے مصر کے خیر اندیشوں سے نہ رہا گیا۔ چنانچہ مسٹر ڈنلوپ وزیر تعلیم اس بات پر زور دیتے ہیں کہ زبان عربی میں علوم و فنون نہ پڑھاتے جائیں۔

انہوں نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ چونکہ عربی زبان اپنے موجودہ زمانے کے لئے ناکافی ہے اور غیر وسیع ہونے کی وجہ سے اس میں علوم مغربیہ کی تعلیم باکمل وجہ نہیں ہو سکتی، مصر کے ان جاراللہ زمخشری کا یہ دعویٰ ایسا لچر ہے کہ اس کی تردید فضول ہے کیونکہ جس شخص کو عربی زبان سے ذرا بھی مس ہے یا جس نے جرمن محققین کی رائیں پڑھی ہیں وہ ڈنلوپ صاحب کے اس دعوے کی صداقت کو خوب سمجھ سکتا ہے۔ کاش کہ اہل مصر کو یورپی زبانوں ہی میں تعلیم دی جاتی۔ مگر وہاں نہ صرف تعلیم کا انتظام ناکافی ہے

ہے بلکہ اس کے اصول میں بہت سے نقائص پیدا کیے جاتے ہیں۔ مدارس کا کورس نہایت بیکار اور لغو ہے اور کسی کی تعلیم مکمل طور پر نہیں دی جاتی۔ مصر میں امریکہ اور فرانس کے آزاد مدارس ہیں مگر ان کی سندیں تسلیم نہیں کی جاتیں۔ لیکن یہ بات قابل اطمینان ہے کہ مصر میں علم کی خواہش اور آزادی کے خیالات دن بدن ترقی کرتے جاتے ہیں اور نوجوان مصری یورپ کے مدارس میں تعلیم کے لیئے بکثرت جاتے ہیں۔ ہم کو امید ہے کہ قومیت کی تعلیم جو مصطفےٰ کامل رحمۃ اللہ علیہ نے اہل مصر کو دی ہے وہ ان کے دل میں نت نئے ولولے اور جوش پیدا کرتی رہے گی اور اسلامی ترقی کا آفتاب وادی نیل سے نمودار ہو کر افریقہ، ایشیا اور یورپ کو منور کر دے گا۔ آمین ثم آمین۔"

"ایک مسلمان طالب علم"

منقول از اردوئے معلی۔ علی گڑھ

بابت اپریل ۱۹۰۸ء ——

نوٹ: عبدالرحمٰن شہید نے بقول محمد یوسف صاحب مدتوں بعد اس مضمون کے بارے میں بیان کیا کہ وہ ایک روز شام کو علی گڑھ میں ہاکی کھیل رہے تھے کہ کسی نے آکر ان سے کہا کہ تمہارے کمرے کی سی آئی ڈی تلاشی لے رہی ہے۔ عبدالرحمان نہایت گورے چٹے آدمی تھے اور بالکل انگریز معلوم ہوتے تھے وہ نیکر اور قمیض میں اپنے کمرے پر گئے تو پولیس والوں نے انہیں انگریز افسر سمجھ کر بڑے ادب سے سلام کیا۔ اس پر انہوں نے تحکمانہ لہجے میں کہا کہ carry on اور یہ کہہ کر وہ دوسرے کمرے میں چلے گئے اور اس مضمون کا

جو اصل مسودہ رکھا ہوا تھا اسے لے کر پیچھے کے دروازے سے باہر چلے گئے اور اس مضمون کو جلا دیا۔

عبدالرحمٰن اور فضل امین ایک ہی کمرے میں رہتے تھے۔ پولیس کو معلوم ہوا تو اس کو بہت افسوس ہوا ۔ حکومت کو پتہ نہ چل سکا کہ اس مضمون کا لکھنے والا کون تھا مگر مولانا حسرت کی دو سال کی سزا ہو گئی

ریاض الحسن